(1)

برسات کے دن ہیں، ساون کا مہنہ، آسمان پر سنہری گھٹائیں چھائی ہیں۔رہ رہ کر رم جھم بارش ہونے لگتی ہے۔ابھی تیسرا ہی پہر ہے، پر ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا شام ہوگئی۔آموں کے باغ میں جھولا پڑا ہوا ہے۔لڑکیاں بھی جھول رہی ہیں اور ان کی مائیں بھی۔دو چار جھول رہی ہیں، دو چار جھولنے کے انتظار میں کھڑی ہیں۔ کوئی کھڑی گانے لگتی ہے، کوئی بارہ ماسہ۔یہ موسم دیویوں کے دل میں بچپن کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ یہ پھوہاریں گویا فکروں کو دل سے دھوڈالتی ہیں۔سبھی کے دل امنگوں سے بھرے ہوئے ہیں۔دھانی ساڑھیاں گویا فکروں کی ہریالی سے ہم رنگ ہو رہی ہیں۔

اسی وقت ایک بساطی آکر جھولے کے پاس کھڑا ہو گیا۔اسے دیکھتے یہ جھولا بند ہو گیا۔چھوٹی بڑی سبھوں نے آکر سے گھیر لیا۔بساطی نے اپنا صندوق کھولا اور چمکتی اور رکتی چیزیں نکال کر دکھانے لگا۔کچے موتی کے گہنے تھے، کچے لیس اور گوٹے، رنگین موزے، خوبصورت گڑیاں، بچوں کے لٹو اور جھنجھنے، طرح طرح کے بگل اور سیٹیاں۔سبھی نے اپنی اپنی پسند کی چیزیں چھانٹنی شروع کیں۔ایک بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی نے وہ چیز پسند کی، جو ان چمکتی چیزوں میں سب سے زیادہ نمایاں تھی۔وہ فیروزہ رنگ کا ایک چندن ہار تھا۔

ماں نے بساطی سے پوچھا۔"یہ ہار کتنے کا ہے؟"

بساطی نے ہار کو رومال سے پونچھتے ہوئے کہا۔ ''خرید تو بیس آنے کی ہے۔ آپ جو چاہیں دے دیں۔''

ماں نے کہا۔ ''یہ تو بڑا مہنگا ہے۔ چار دن میں اس کی چمک دمک جاتی رہے گی۔''

بساطی نے پر معنی انداز سے سر ہلا کر کہا۔ ''بہو جی! چار دن میں تو بیٹا کو اصلی چندن ہار مل جائے گا۔''

ماں کے دل پر ان ہمدردانہ الفاظ نے چوٹ کی۔ ہار خرید لیا گیا۔

اس بھولی بھالی لڑکی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ شاید ہیروں کے ہار سے اسے اتنی خوشی نہ ہوتی۔ اسے پہن کر وہ سارے گاؤں میں ناچتی پھرتی۔ اس کی ملکیت میں جو چیز سب سے قیمتی اور سب سے عزیز تھی، وہ بلور کا ہار تھا..........

لڑکی کا نام لاجپا تھا اور ماں کا مانکی۔

(2)

منشی دین دیال الٰہ آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے۔ وہ کسان نہ تھے' مگر کھیتی کرتے تھے۔ زمیندار نہ تھے' مگر زمینداری کرتے تھے۔ تھانیدار نہ تھے' مگر تھانیداری کرتے تھے۔ وہ زمیندار کے مختار تھے۔ گاؤں میں ان کی دھاک تھی۔ ان کے پاس چار چپڑاسی تھے۔ ایک گھوڑا' گئی گائیں اور بھینسیں۔ تنخواہ کل پانچ روپے تھی' جو ان کے تمباکو کے خرچ کو بھی کافی نہ ہوتی تھی' مگر اس میں کچھ ایسی برکت تھی کہ رئیسانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ جالپا انہی کی لڑکی تھی پہلے اس کے تین بھائی اور تھے' مگر اس وقت وہ اکیلی تھی۔ اس سے کوئی پوچھتا۔ ''تیرے بھائی کیا

ہوئے؟'' تو وہ بڑی سادگی سے کہتی۔ ''بڑی دور کھیلنے گئے ہیں۔'' کہتے ہیں مختار صاحب نے ایک غریب کسان کو اتنا پٹوایا تھا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر مر گیا اور سال کے اندر منشی جی کے تینوں لڑکے جاتے رہے' تب سے بیچارے بہت سنبھل کر چلتے تھے۔ اب یہی لڑکی ماں باپ کی زندگی کا سہارا تھی۔

منشی جی جب کبھی باہر جاتے تو جالپا کے لیے کوئی نہ کوئی زیور ضرور لاتے۔ ان کے تختی کار ذہن میں یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ جالپا کسی اور چیز سے اس سے زیادہ خوش ہو سکتی ہے۔ گڑیا اور کھلونے ان کی نظروں میں بیکار تھے' اس لیے جالپا زیوروں ہی سے کھیلتی تھی۔ یہی اس کے کھلونے تھے۔ وہ بلور کا ہار' جو اس نے بساطی سے لیا تھا' اب اس کا سب سے پیارا کھلونا تھا۔ اصلی ہار کی تمنا اس کے دل میں طلوع نہ ہوتی تھی۔ گاؤں میں کوئی تقریب ہوتی یا کوئی تہوار آتا تو وہی ہار پہنتی' کوئی دوسرا گہنا اس کی آنکھوں میں جچتا ہی نہ تھا۔

ایک دن منشی جی لوٹے تو مانکی کے لیے ایک چندن ہار لائے۔ مانکی کو یہ ارمان بہت دنوں سے تھا۔ جالپا کو اپنا ہار پھیکا معلوم ہونے لگا۔ باپ سے بولی۔ ''مجھے بھی ایسا ہی ہار لا دیجیے۔''

منشی جی نے مسکرا کر کہا' 'لا دوں گا بیٹی۔''

''کب لا دیجیے گا؟''

''بہت جلد۔''

''باپ کی باتوں سے جالپا کا من نہ بھرا۔ اس لیے ماں سے جا کر کہا'' مجھے بھی ایسا ہار بنوا دو۔''

''اس میں تو بہت روپے لگیں گے۔''

''تم نے اپنے لیے بنوایا ہے تو میرے لیے کیوں نہیں بنواتیں؟''

''تیرے لیے سسرال سے آئے گا۔''

جالپا شرما کر بھاگ گئی' پر یہ الفاظ اس کے دل میں پتھر کی لکیر ہو گئے۔ سسرال اب اس کے لیے اتنی خوفناک چیز نہ تھی۔ سسرال سے چندن ہار آئے گا۔ شاید وہ لوگ اسے ماں باپ سے زیادہ پیار کریں گے۔ اس طرح ہنستے کھیلتے سات سال گزر گئے۔

(3)

منشی دین دیال کے شناساؤں میں ایک بابو دیا ناتھ تھا۔ بہت ہی وضعدار اور خلیق۔ کچہری میں پچاس روپے کے نوکر تھے۔ دین دیال عدالت کے کیڑے تھے۔ آئے دن دیا ناتھ سے سابقہ پڑتا رہتا۔ چاہتے تو دین دیال سے ہزاروں وصول کرتے' پر کبھی ایک پیسے کے بھی روادار نہ ہوئے تھے اور ان کا یہ برتاؤ کچھ دین دیال ہی کے ساتھ نہ تھا۔ یہ ان کی عادت تھی۔ یہ بات بھی تھی کہ بڑے پرہیز گار ہوں' مگر رشوت کو حرام سمجھتے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ آنکھوں سے اس کے نتائج دیکھ چکے تھے۔ کسی کو جیل جاتے دیکھا تھا۔ کسی کو اولاد سے ہاتھ دھوتے دیکھا تھا۔ کسی کو مکروہات میں پھنستے۔ ایسی انہیں کوئی مثال نہ ملتی تھی' جس نے رشوت لے کر چین کیا ہو۔ ان کے دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ حرام کی کمائی حرام میں جاتی ہے۔

اس زمانے میں پچاس روپے کی بھگت ہی کیا؟ پانچ آدمیوں کی پرورش بڑی

مشکل سے ہوتی تھی۔ لڑکے اچھے اچھے کپڑوں کو ترستے۔ بیوی گہنوں کو ترستی، مگر دیاناتھ نیت کو برگشتہ نہ ہونے دیتے۔ بڑا لڑکا دو ہی مہینے کالج میں رہنے کے بعد پڑھنا چھوڑ بیٹھا۔ بابو صاحب نے صاف کہہ دیا۔ ''میں تمہاری ڈگری کے لیے سارے گھر کو بھوکا اور ننگا نہیں رکھ سکتا۔ پڑھنا چاہتے ہو تو اپنی قوت بازو سے پڑھو۔''لیکن رماناتھ میں اتنا استقلال نہ تھا۔ ادھر دو سال سے وہ بالکل بیکار تھا۔ شطرنج کھیلتا، سیر سپاٹے کرتا، ماں باپ اور چھوٹے بھائیوں پر رعب جماتا۔ دوستوں کی بدولت امارت کے شوق پورے ہوتے رہتے تھے۔ کسی کا چسٹر مانگ لیا اور شام کو ہوا کھانے نکل گئے۔ کسی کا پمپ شو پہن لیا۔ کسی کی گھڑی کلائی پر باندھ لی۔ کبھی بنارسی فیشن سے نکلے، کبھی لکھنوی فیشن میں۔ دس دوستوں نے ایک ایک سوٹ بنوالیا تو دس سوٹ بدلنے کے سامان ہوگئے۔ باہمی امداد کا یہ نیا استعمال تھا۔ اسی نوجوان کو منشی دین دیال نے جالپا کے لیے انتخاب کیا۔ دیاناتھ لڑکے کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کے پاس روپے نہ تھے اور نہ نئے خاندان کا بوجھ اٹھانے کی ہمت، مگر جاگیشری کی تریاہٹ کے سامنے ان کی ایک بھی پیش نہ گئی۔ جاگیشری برسوں سے بہو کے لیے تڑپ رہی تھی، جو اس کے سامنے بہویں بن کر آئیں، وہ آج پوتے کھلا رہی ہیں، پھر اس غریب کو کیسے صبر ہوتا۔ وہ کچھ کچھ مایوس ہو چلی تھی۔ ایشور سے مناتی تھی کہ کہیں سے پیغام آئے۔ دین دیال نے پیغام بھیجا ہے تو اس کو آنکھیں سی مل گئیں۔ اگر کہیں یہ شکار ہاتھ سے نکل گیا تو پھر نہ جانے اور کتنے دن راہ دیکھنی پڑے گی۔ کوئی یہاں کیوں آنے لگا؟ گھر میں نہ دولت ہے، نہ اثاثہ۔ اس لیے اس نے اس موقع پر سارا زور لگا دیا اور بالآخر اس کی

فتح ہوئی۔

دیاناتھ نے کہا۔ ''بھئی تم جانو تمہارا کام جانے۔ مجھ میں اتنی مقدرت نہیں ہے جو آدمی اپنے پیٹ کی فکر نہیں کر سکتا' اس کی شادی کرنا مجھے تو گناہ معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ بریں نقد روپے بھی تو چاہئیں۔ ایک ہزار سے کم تو نمائش میں نہ صرف ہوں گے۔ جوڑے اور زیورات کے لیے الگ (کانوں پر ہاتھ رکھ کر) نا بابا! یہ بوجھ میرے بوتے کا نہیں۔''

جاگیشری پر ان دلیلوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

''وہ بھی تو کچھ دے گا۔''

''تو کیا میں اس سے مانگنے جاؤں گا؟''

''تمہارے مانگنے کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ لڑکی کی شادی میں کوئی پیسے کا منہ نہیں دیکھتا۔ پھر دین دیال کے یہی ایک لڑکی ہے' بچا کر رکھیں گے تو بھی کس لیے؟''

دیاناتھ کو اب کوئی بات نہ سوجھی۔ صرف اتنا بولے ''چاہے لاکھ دے دیں اور چاہے ایک نہ دیں۔ میں نہ کہوں گا کہ دو' نہ کہوں گا کہ مت دو۔ قرض میں لینا نہیں چاہتا اور لوں تو دوں کس کے گھر سے۔''

جاگیشری نے اس مشکل کو یوں آسان کیا۔ ''مجھے تو یقین ہے کہ وہ ٹیکے میں ایک ہزار سے کم نہ دیں گے' نمائش کے لیے اتنا بہت ہے۔ گہنوں کا انتظام کسی صراف سے کر لینا۔ دروازے پر بھی تو کچھ ملے گا ہی۔ وہ صراف کو دے دینا۔ دو چار سو رہ جائیں گے' تھوڑا تھوڑا کر کے وہ بھی چکا دینا۔ پھر بچے کے لیے بھی تو کوئی

نہ کوئی دروازہ کھلے گا۔''

دیاناتھ نے بے رخی سے کہا۔''کھل چکا۔ جسے شطرنج اور سیر سپاٹے سے فرصت نہ ملے، اس کے لیے سبھی دروازے بند رہیں گے۔''

جاگیشری کو اپنی شادی کے حالات یاد آئے۔ اس وقت دیاناتھ بھی تو گلچھرے اڑاتے تھے، لیکن اس کے گھر میں آتے ہی انہیں چار پیسے کمانے کی فکر کیسے سر پر سوار ہوگئی تھی؟ سال بھر کے اندر ہی پندرہ روپے کی جگہ پا گئے۔ بولی۔''بہو کو آنے دو۔ یہ سیر سپاٹے بھول جائیں گے۔ یہ دیکھ لینا۔ اپنی بات یاد کرو۔ جب تک گلے میں جوا نہیں پڑتا، سبھی کو کلیلیں سوجھتی ہیں۔ جوا پڑا اور سارا نشہ ہرن ہوا۔ نکموں کو راہ پر لانے کی اس سے بڑھ کر دوسری ترکیب ہی نہیں۔''

دیاناتھ اخبار پڑھنے لگے، جب ہار جاتے تھے تو اخبار پڑھنے لگتے تھے۔ اپنی شکست کو چھپانے کا ان کے پاس یہی ایک ذریعہ تھا۔

(4)

منشی دین دیال ان آدمیوں میں سے تھے، جو سیدھوں کے ساتھ سیدھے ہوتے ہیں، مگر ٹیڑھوں کے ساتھ ٹیڑھے ہی نہیں، شیطان ہو جاتے ہیں۔ دیاناتھ نے بے پر کی اڑائی ہوتی تو دین دیال انہیں ایسا چکمہ دیتے کہ وہ عمر بھر یاد رکھتے۔ دیاناتھ کی شرافت نے انہیں فریفتہ کرلیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ ایک ہزار شادی کی ساری رسمیں پوری کردیں، مگر ایک ہزار ٹیکے ہی میں لے آئے۔

دیاناتھ ایک ہزار کی تھیلی پا کر خوش تو ہوئے، مگر اس نے ان کے سر کا بوجھ ہلکا کرنے کے بدلے اور بھاری کردیا۔ شادی کی تیاریاں بھی اب وسیع پیمانے پر

کرنی پڑیں گی۔ اس شادی میں انہوں نے کم سے کم خرچ کرنے کا ارادہ کیا تھا' لیکن دین دیال کی فیاضی نے انہیں بھی فیاض بننے پر مجبور کر دیا۔ وہ سارے ٹیم ٹام' ناچ تماشے' جنہیں وہ لغو سمجھتے تھے' اب فرض کی صورت میں ان کے روبرو آ کھڑے ہوئے۔ بندھا ہوا گھوڑا تھان سے کھل گیا۔ کون روک سکتا ہے' پہلے چڑھاوے کو انہوں نے محض رسم سمجھا تھا۔ اب ایسا چڑھاوا لے جانے کی تجویز ہوئی' جسے دیکھ کر سب کی آنکھیں کھل جائیں۔ کوئی تین ہزار کا سامان بنوا ڈالا۔ صراف کو ایک ہزار نقد مل گیا۔ ایک ہزار کے لیے ایک ہفتے کا وعدہ ہوا' تو اس نے کوئی عذر نہ کیا۔ بیوپاری کی لاگت نکل آتی ہے تو نفع کے متعلق اسے زیادہ اندیشہ نہیں ہوتا' پھر بھی چندر ہار کی کسر رہ گئی۔ جڑاؤ چندن ہار ایک ہزار سے کم میں اچھا نہیں مل سکتا تھا۔ دیا ناتھ کا جی تو لہرایا کہ لگے ہاتھ اسے بھی لے لو' مگر جاگیشری اس پر راضی نہ ہوئی۔ بازی پلٹ چکی تھی۔

دیا ناتھ نے گرم ہو کر کہا۔ ''تمہیں کیا' تم گھر میں بیٹھی رہو گی۔ ندامت تو مجھے ہو گی' جب ادھر والے میں میخ نکالنے لگیں گے!''

''دو گے کہاں سے۔ کچھ سوچا ہے؟''

''کم از کم ایک ہزار تو وہاں مل جائیں گے۔''

''خون منہ لگ گیا شاید؟''

دیا ناتھ نے شرما کر کہا۔ ''نہیں' نہیں۔ مگر آخر وہاں بھی تو کچھ ملے گا۔''

جاگیشری بولی۔ ''وہاں ملے گا تو وہاں خرچ بھی ہو گا۔ نام چڑھاوے سے نہیں ہوتا دان دکشنا سے ہوتا ہے۔''

اس طرح چندن ہار کی تجویز فسخ ہوگئی۔

مگر دیا ناتھ نمائش کو کتنا ہی غیر ضروری سمجھیں۔ ریا ناتھ اور اس کے احباب اسے مقدم سمجھتے تھے۔ بارات ایسی دھوم دھام سے جانی چاہیے کہ سارے علاقے میں دھوم مچ جائے۔ پہلے نوشہ کے لیے پالکی کی تجویز تھی۔ رما ناتھ ملنسار تھا۔ اس کے احباب بھی اس وقت ساری تیاریوں میں پیش پیش تھے۔ وہ جو کام کرتے' دل کھول کرتے۔ آتش بازیاں بنوائیں تو اول درجے کی' طائفہ کی اتو اول درجے کا' باجے گاجے بھی اول درجے کے۔ دوم سوم کا وہاں ذکر ہی نہ تھا۔ دیا ناتھ ان کی فضول خرچیاں دیکھ کر فکر مند ہو جاتے تھے۔ مگر کرتے کیا؟

(5)

ناٹک اس وقت پاس ہوتا ہے' جب اہل ذوق اسے پسند کر لیتے ہیں۔ برات کا ناٹک اس وقت پاس ہوتا ہے' جب ہر خاص و عام اسے پسند کر لیتا ہے۔ ناٹک کا امتحان چار پانچ گھنٹے ہوتا رہتا ہے۔ برات کے امتحان کے لیے صرف اتنے منٹوں کا موقع ہوتا ہے۔ ساری دوا دوش' کاوش و جانفشانی کا فیصلہ پانچ منٹوں میں ہو جاتا ہے۔ اگر ہر ایک کے منہ سے واہ واہ نکل گئی تو تماشہ پاس' نہیں تو فیل۔ منشی دیا ناتھ کا تماشہ پاس ہو گیا۔ شہر میں اسے تیسرا درجہ ملتا۔ گاؤں میں اول درجہ مل گیا۔ کوئی باجوں کی دھوں دھوں' پوں پوں سن کر مست ہو رہا تھا' کوئی موٹروں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا' لیکن کچھ لوگ پھلواڑیوں کے تختے دیکھ کر ٹوٹے جاتے تھے اور آتشبازی تو دلچسپی کا خاص مرکز تھی۔ ہوائیاں جب سن سے اوپر جاتیں اور آسمان میں سرخ' سبز' زرد' نیلے قمقمے سے بکھر جاتے۔ جب چرخیاں

چھوٹتیں اور ان میں سے ناچتے ہوئے مور نکل آتے تو لوگوں پر جادو کا اثر ہوتا تھا۔

جالپا کے لیے ان نمائشوں میں ذرا بھی کشش نہ تھی۔ ہاں وہ نوشہ کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ سب سے چھپ کر، مگر اس بھیڑ بھاڑ میں یہ موقع کہاں؟ دروازہ چار کے وقت اس کی سہیلیاں اسے چھت سے نیچے لے گئیں۔ مگر وہاں بھی وہ رمانا تھ کا صرف سہرا دیکھ سکی۔ چہرا نظر نہ آیا۔

دروازہ چار کے بعد کھانے پینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ تھوڑے سے آدمیوں نے پوریاں کھائیں۔ زیادہ آدمیوں نے اپلوں پر باٹیاں پکائیں۔ چاروں طرف دھواں ہی دھواں نظر آنے لگا۔ تماشائیوں کی تفریح کے لیے محفل آراستہ ہوئی۔

آدھی رات کو یکا یک باجے بجنے لگے۔ معلوم ہوا کہ چڑھاوا آرہا ہے، شادی کی ہر ایک رسم ڈنکے کی چوٹ ادا ہوتی ہے۔ نوشہ ناشت کرنے آرہا ہے۔ باجے بجنے لگے۔ سمدھی ملنے آرہا ہے۔ باجے بجنے لگے، خیر، چڑھاوا جونہی پہنچا۔ گھر میں ہل چل مچ گئی۔ مرد بوڑھے، جوان، چھوٹے بڑے سب چڑھاوا دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ آپس میں دھکم دھکا ہونے لگا۔ مانکی پیاس سے بے حال ہو رہی تھی۔ حلق سوکھا جاتا تھا۔ آتے ہی اس کی پیاس بھاگ گئی۔ دین دیال ایک کوٹھڑی میں نیم جان سے پڑے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی بے تحاشہ دوڑے، مانکی ایک ایک چیز کو نکال کر دیکھنے اور دکھانے لگی۔ وہاں سبھی اس فن کے ماہر تھے۔ مردوں نے گہنے بنوائے تھے۔ عورتوں نے پہنے تھے۔ سبھی تبصرے کرنے لگے۔ یہ چوہے دنتی کتنی خوبصورت ہے۔ کوئی دس تولے کی ہوگی۔ یہ شیر دہا تو دیکھو۔ کیا ہاتھ کی صفائی

ہے۔ کوئی بارہ تولے کا ہوگا۔ واہ، کبھی دیکھا بھی ہے۔ سولہ تولے سے کم نکل جائے تو منہ نہ دکھاؤں ہاں۔ مال اتنا چوکھا نہیں ہے۔ یہ کنگن تو دیکھو۔ پکی جڑائی ہے۔ کتنا باریک کام ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ سچے نگینے ہیں اصل چیز تو یہ گلوبند ہے۔ کتنے خوبصورت پھول ہیں اور ان کے بیچ کے ہیرے کیسے چمک رہے ہیں۔ بنگالی سنار نے بنایا ہوگا۔ کیا بنگالیوں نے کاریگری کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ ہمارے یہاں ایک سے ایک کاریگر پڑے ہوئے ہیں۔ بنگالی سنار بیچارے ان کی کیا برابری کریں گے۔

اسی طرح ہر ایک چیز کی تنقید ہوتی رہی۔ دفعتاً کسی نے کہا۔ ''کیا چندر ہار نہیں ہے؟''

مانکی نے رونی صورت بنا کر کہا ''نہیں، ارے چندن ہار نہیں آیا۔''

دین دیال نے اپنی خفت کو چھپاتے ہوئے کہا۔ ''اور سب چیزیں تو ہیں، ایک چندن ہار ہی تو نہیں ہے۔''

تماشائیوں کے اس حلقے کے پیچھے جالپا امید و بیم کی تصویر سی بنی کھڑی تھی اور سب زیوروں کے نام کان میں آتے تھے، چندن ہار کا نام نہ آتا تھا۔ اس کا سینہ دھک دھک کر رہا تھا۔ چندن ہار شاید سب زیوروں کے نیچے ہو۔ ممکن ہے کسی کی نگاہ نہ پڑی ہو یا پیچھے سے کسی اور رسم میں ملے۔ اس طرح وہ دل کو سمجھاتی رہی۔ جب یقین ہو گیا کہ چندن ہار نہیں ہے تو اس کے جگر پر چوٹ سی لگی۔ معلوم ہوا جسم میں ایک قطرہ بھی خون نہیں ہے۔ وہ ایک بے خودی کی حالت میں اپنے کمرے میں آئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ تمنا جو سات برس پہلے اس کے دل میں

اگی تھی، جو اس وقت پھول اور پتوں سے لدی کھڑی تھی، اس پر بجلی گر پڑی۔ اس مایوسی کے عالم میں اسے ایسا غصہ آ رہا تھا کہ چڑھاوے کو اٹھا کر پھینک دے۔ کمرے میں ایک طاق پر شیو کی مورت رکھی ہوئی تھی، اس نے اسے اٹھا کر اتنے زور سے پٹکا کہ اس کی تمنا کی طرح وہ بھی چور چور ہو گئی۔ اس نے دل میں عہد کیا کہ اب کوئی زیور نہ پہنوں گی۔ زیور پہننے سے ہوتا ہی کیا ہے۔ منت کی زحمت، جانے کہاں سے کوڑا کرکٹ اٹھا لائے، جس چیز میں روپے خرچ ہونے تھے، اس کا نام ہی نہ لیا۔

وہ اسی غصے میں بھری بیٹھی تھی کہ اس کی تین سہیلیاں آ کر کھڑی ہو گئیں۔ جالپا نے انہیں دیکھتے ہیں آنکھیں پونچھ ڈالیں اور مسکرانے لگی۔

رادھا بولی۔ ''بہن تم نے بڑی تپسیا کی تھی۔ ایسا چڑھاوا میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اب تو تیرا کوئی ارمان نہیں رہا۔''

جالپا نے لمبی لمبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف ایسی بیکسانہ نگاہوں سے دیکھا۔ گویا زندگی میں اب اس کے لیے کوئی امید نہیں ہے۔ ''ہاں بہن سارے ارمان پورے ہو گئے۔''

سہیلیاں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگیں۔ گویا اس جملے کا مطلب ان کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔

بسنتی نے کہا۔ ''تمہاری ساس بڑی عقل مند معلوم ہوتی ہے۔ کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ ایسا جی چاہتا ہے کہ کاریگر کے ہاتھ چوم لوں۔''

رادھا: ''اور تو سب کچھ ہے۔ صرف چندہار نہیں ہے۔''

شہزادی: ''ایک چندن ہار کے نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے۔اس کے عوض گلوبند تو ہے!''

جالپا نے طنز سے کہا۔''ہاں! آنکھ نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ جسم میں اور سب اعضا تو ہوتے ہی ہیں۔آنکھیں ہوئیں تو کیا' نہ ہوئیں تو کیا۔''

بچوں کے منہ سے دانشمندی کی باتیں سن کر جیسے تمہیں ہنسی آجاتی ہے۔اسی طرح جالپا کے منہ سے یہہ مایوسانہ الفاظ سن کر رادھا اور بسنتی اپنے تئیں نہ روک سکیں۔ہاں شہزادی کو ہنسی نہ آئی۔ایسی زیور کی ہوس اس کے نزدیک ہنسنے کی بات نہیں رونے کی بات تھی۔مصنوعی ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔''سب کے سب نہ جانے کہاں کے دہقان ہیں کہ سب چیزیں تو لائے لیکن چندن ہار نہ لائے جو سب گہنوں کا راجہ ہے۔ابھی نوشہ صاحب آتے ہیں تو پوچھتی ہوں۔تم نے یہ کہا ں کی ریت نکالی ہے' کوئی ایسا ظلم بھی کرتا ہے؟''

رادھا اور بسنتی سہم رہی تھیں کہ جالپا کہیں تاڑ نہ جائے۔ان کا بس ہوتا تو شہزادی کا منہ بند کر دیتیں۔مگر جالپا کو شہزادی کے تصنع میں خلوص کا رنگ نظر آرہا تھا۔آبدیدہ ہو کر بولی۔''ان سے پوچھ کر کیا کرو گی۔جو ہونا تھا سو ہو گیا۔''

شہزادی: ''تم پوچھنے کو کہتی ہو۔میں رلا کر چھوڑوں گی۔میرے چڑھاؤ میں کنگن نہ آئے تھے۔اس وقت طبیعت ایسی کھٹی ہوئی کہ سارے زیوروں پر لات ماردی۔جب تک کنگن نہ بن گئے' میں نیند بھر سوئی نہیں۔''

رادھا: ''تو کیا تم سمجھتی ہو' چندن ہار ملے گا ہی نہیں؟''

شہزادی: ''ملے گا جب ملے گا۔اس موقع پر تو نہیں ملے گا۔اس موقع پر

تو نہیں ملا۔ دس پانچ کی چیز تو ہے نہیں کہ جب چاہا بنوایا۔ سینکڑوں کا خرچ ہے۔ پھر کاریگر بھی تو ہمیشہ نہیں ملتے۔ جالپا یہی تو میں بھی سوچتی ہوں' جب آج نہ ملا تو پھر کیا ملے گا۔''

رادھا اور بسنتی دونوں شہزادی کو دل میں کوس رہی تھیں اور تھپیڑ دکھا رہی تھیں' مگر شہزدی کو اس وقت تماشے کا مزا آ رہا تھا۔ بولی نہیں۔ ''یہ بات نہیں ہے۔ بہن! ضد کرنے سے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ ساس' سسر کو بار بار یاد دلاتی رہنا۔ دولہا صاحب سے دو چار دن روٹھ کر بیٹھنے سے کچھ کام نکل سکتا ہے۔ بس یہی سمجھ لو کہ گھر والے چین نہ لینے پائیں۔ انہیں یقین ہو جائے کہ بغیر چندن ہار بنوائے خیریت نہیں۔ تم ذرا بھی نرم پڑیں اور کام بگڑا۔''

رادھا نے ہنسی کو روکتے ہوئے کہا۔ ''ان سے نہ بنے تو تمہیں بلا لیں۔ کیوں؟ اب اٹھو گی یا ساری رات سبق ہی دیتی رہو گی۔''

''شہزادی چلتی ہوں۔ ایسی کیا بھاگڑ پڑی ہے۔ ہاں' خوب یاد آئی۔ کیوں بہن تیری اماں جی کے پاس تو بڑا اچھا چندن ہار ہے۔ تجھے نہ دیں گی؟''

جالپا نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ ''مجھے تو ان سے کوئی امید نہیں ہے۔ بہن! شہزادی ایک بار کہہ کر دیکھ لو۔ اب کون سے ان کے پہننے اوڑھنے کے دن بیٹھے ہیں۔''

جالپا: ''مجھ سے تو کہا نہ جائے گا۔''

شہزادی: ''میں کہہ دوں گی۔''

جالپا: ''نہیں نہیں۔ تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں ذرا ان کی ماتا

کا امتحان لینا چاہتی ہوں۔"

بسنتی نے شہزادی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔"معلوم ہوتا ہے تو ساری رات کا بیڑا لے کر آئی ہے۔ چل مجھے پہنچا کر لوٹ آنا۔"

شہزادی اٹھی مگر جالپا نے راستہ روک لیا اور بولی۔"نہیں ابھی بیٹھو بہن، تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔"

شہزادی: "جب یہ دونوں چڑیلیں بیٹھنے بھی دیں۔ میں تو تمہیں گر سکھاتی ہوں اور یہ دونوں جلاتی ہیں۔"

بسنتی: "تو تو بس کی گانٹھ ہے۔"

شہزادی: "تم بھی تو سسرال سے سال بھر بعد آئی ہو۔ کون کون سی چیزیں بنوالائیں؟"

بسنتی: "اور تم نے تین سال میں کیا بنوالیا؟"

شہزادی: "میری بات چھوڑو۔ میرا خصم تو میری بات ہی نہیں پوچھتا۔"

رادھا: "محبت کے سامنے زیوروں کی کوئی حقیقت نہیں۔"

شہزادی: "تو وہ سوکھی محبت تمہیں مبارک ہے۔"

اتنے میں مانکی نے آن کر کہا۔"تم تینوں یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ چلو وہاں لوگ کھانا کھانے آ رہے ہیں۔" تینوں سہیلیاں چلی گئیں۔ جالپا ماں کے گلے میں چندن ہار کی رونق دیکھ کر سوچنے لگی۔ ان زیوروں سے ان کی طبعیت اب تک سیر نہیں ہوئی۔

(6)

بابو دیاناتھ جتنے حوصلے سے شادی کرنے گئے تھے، اتنے ہی خاطر شکستہ دل ہو کر لوٹے۔ دین دیال کی فیاضی میں شبہ نہیں، لیکن وہاں سے جو کچھ ملا، وہ سب وہیں خرچ ہوگیا۔ بار بار اپنی غلطی پر پچھتاتے۔ کیوں نمود و نمائش میں اتنے روپے خرچ کر دیئے۔ زیادہ سے زیادہ لوگ یہی کہتے کہ یہ حضرت بڑے بخیل ہیں۔ اتنا سن لینے میں کیا نقصان تھا اور سبھی تقاضے تو ع پانش دس دن میں ٹل سکتے تھے مگر صراف کسی طرح نہ مانتا تھا۔ اس سے شادی کے ساتویں دن ایک ہزار روپے دینے کا وعدہ تھا۔ ساتویں دن صراف آیا، مگر روپے کہاں تھے۔ دیاناتھ میں للو چپو کی عادت نہ تھی، مگر ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ انہوں نے اسے چکمہ دینے کی خوب کوشش کی۔ چھ مہینے میں باقی قسط سے روپیہ ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ پھر تین مہینے پر آ گئے۔ مگر صراف ایک گھٹا ہوا تھا۔ اسی وقت ٹلا، جب دیاناتھ نے تیسرے دن باقی رقم کے زیور واپس کر دینے کا وعدہ کیا۔ آخر وہ تیسرا دن بھی آ گیا اور اب دیاناتھ کو اپنی لاج رکھنے کی کوئی ترکیب نہ سوجھتی تھی۔ کوئی چلتا ہوا آدمی شاید پریشان نہ ہوتا۔ حیلے حوالے کر کے مہاجن کو مہینوں ٹالتا رہتا لیکن دیاناتھ اس معاملے میں اناڑی تھے۔

جاگیشری نے کہا۔ ''کھانا کب سے پکا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ کھا کیوں نہیں لیتے؟''

دیاناتھ نے اس طرح گردن اٹھائی، گویا سر پر سینکڑوں من کا بوجھ لدا ہوا ہے اور بولے: ''تم جا کر کھا لو۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔''

جاگیشری: ''بھوک کیوں نہیں ہے۔ رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ یوں دانہ

پانی چھوڑ دینے سے مہاجن کے روپے تھوڑے ہی ادا ہو جائیں گے!''

دیاناتھ: ''میں سوچتا ہوں۔ اسے آج کیا جواب دوں گا۔ میں تو یہ شادی کر کے برا پھنسا۔ بہو کچھ زیور لوٹا تو دے گی۔''

جاگیشری: ''بہو کا حال تو سن چکے، پھر بھی اس سے امید رکھتے ہو۔ اس کی ٹیک ہے کہ جب تک چندن ہار نہ بن جائے گا، کوئی گہنا نہ پہنوں گی۔ ساری چیزیں صندوق میں بند کر رکھی ہیں۔ بس ایک وہی بلوریں ہار گلے میں ڈالے ہوئے ہے۔ بہوئیں بہت دیکھی ہیں مگر ایسی بہو نہ دیکھی تھی۔ پھر کتنا برا معلوم ہوتا ہے کہ کل کی آئی بہو اس سے گہنے مانگ لیے جائیں۔''

دیاناتھ نے چڑ کر کہا۔ ''تم تو جلے پر نمک چھڑکتی ہو۔ برا معلوم ہوتا ہے تو لاؤ روپے نکال کر دے دیتی ہو۔ برا مجھے خود معلوم ہوتا ہے مگر تدبیر کیا ہے۔ گلا کیسے چھوٹے؟''

جاگیشری: ''بیٹے کا بیاہ کیا ہے یا مذاق ہے، شادی بیاہ میں سبھی قرض لیتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پارسا بننے کا کچھ سبق ملنا چاہیے یا نہیں؟ تمہارے ہی دوست لالہ بستیہ دیو ہیں، پکا مکان کھڑا کر لیا۔ زمینداری خریدی۔ بیٹی کی شادی میں کچھ نہیں تو پانچ ہزار تو خرچ کیے ہوں گے اور تم اپنی پارسائی لیے پھرتے ہو۔''

دیاناتھ: ''جبھی دونوں لڑکے بھی تو چل دیئے۔''

جاگیشری: ''مرنا جینا تو دنیا کا طریق ہے، جو لیتے ہیں وہ بھی مرتے ہیں، جو نہیں لیتے وہ بھی مرتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو چھ مہینے میں سب روپے چکا سکتے ہو۔''

دیاناتھ نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ''جو بات زندگی بھر نہیں کی۔ وہ بات آخری

وقت نہیں کر سکتا۔ بہو سے گھر کا حال صاف صاف کہہ دو' اس سے پردہ رکھنے کی ضرورت نہیں اور پردہ رہ ہی کتنے دن سکتا ہے' بس تین چار چیزیں لوٹا دے۔ تم اس سے ایک بار کہو تو!''

جاگیشری' جھنجھلا کر بولی۔ ''اس سے تم ہی کہو۔ مجھ سے نہ کہا جائے گا۔''

اسی وقت رماناتھ ٹینس ریکٹ لیے باہر سے آیا۔ جسم پر سفید ٹینس شرٹ تھی۔ سفید پتلون' کینوس کا جوتا' خوش رو آدمی تھا۔ اس لباس نے رئیس زادوں کی شان پیدا کر دی تھی۔ رومال میں بیلے گجرے لیے ہوئے تھا۔ اس سے خوشبو اڑ رہی تھی۔ ماں باپ کی آنکھیں بچا کر زینہ پر جانا چاہتا تھا کہ جاگیشری نے ٹوکا۔ ''کہاں جاتے ہو۔ تم نے ناچ تماشے میں بارہ تیرہ سو روپے اڑا دیئے۔ بتلاؤ صراف کو کیا جواب دیا جائے۔''

رماناتھ نے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے روپے اڑا دیئے۔ میں نے بابو جی کے حکم کے بغیر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔''

حقیقت بھی یہی تھی۔ اگر دیاناتھ کی مرضی نہ ہوتی' تو رما کیا کر سکتا تھا۔ جو کچھ ہوا' ان کی رضامندی سے ہوا۔

دیاناتھ نے اس قول کی تائید کی۔ ''میں تمہیں الزام نہیں دیتا بھائی۔ کیا تو میں نے ہی مگر یہ بلا تو کسی طرح سر سے ٹالنی چاہیے۔ صراف کا تقاضا ہے۔ میری سمجھ میں یہی ایک تدبیر ہے کہ باقی روپیوں کے زیور واپس کر دیئے جائیں۔ تمہاری کیا صلاح ہے؟''

روما نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''میں اس معاملے میں کیا صلاح دے سکتا

ہوں۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس تجویز کو وہ خوشی سے منظور نہ کریں گی۔''

جاگیشری نے خوش ہو کر کہا۔ ''یہی تو میں ان سے کہہ رہی ہوں۔''

رما: ''رونا دھونا شروع ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی گھر کا پردہ بھی کھل جائے گا۔''

دیاناتھ نے آزردہ خاطر ہو کر کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس سے پردہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اپنی اصلی حالت کا اسے جتنی جلدی علم ہو جائے' اتنا ہی اچھا ہے۔''

رماناتھ نے عام نوجوانوں کی طرح جالپا سے خوب زیٹ اڑائی تھی۔ خوب بڑھ چڑھ کر باتیں کی تھیں کہ ہماری زمینداری ہے' اس سے کئی ہزار کا نفع ہے۔ بینک میں روپے ہیں' ان کا سود آتا ہے۔ بولا۔ ''آپ کا فرمانا درست ہے' پر اتنی جلدی بھرم کھل جانے کا نتیجہ یہی ہو گا کہ وہ ہمیں ذلیل سمجھنے لگے گی۔''

دیاناتھ۔ ''ہم نے دین دیال سے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ ہم لکھ پتی ہیں۔''

رما۔ ''تو آپ نے یہی کب کہا تھا کہ ہم جا کڑ پر زیور لائیں گے اور دو چار دن میں لوٹا دیں گے۔ آخر یہ سارا سوانگ اپنی دھاک بٹھانے کے لیے ہی تو کیا تھا یا کچھ اور؟''

دیاناتھ۔ ''تو پھر کوئی دوسرا بہانہ کرنا پڑے گا۔ دوسری کوئی تدبیر نہیں۔ کل یا تو روپے دینے پڑیں گے یا زیور واپس کرنے پڑیں گے۔''

جاگیشری۔ ''اور کون سا بہانہ کیا جائے گا۔ اگر کہا جائے کہ کسی کو مانگے دینا ہے تو شاید وہ دے ہی نہیں۔'' دیاناتھ کو ایک حکمت سوجھی۔ ''یہ ممکن نہیں ہے کہ ان

زیوروں کے بدلے ملمع کی چیزیں دے دی جائیں۔'' مگر فوراً ہی خیال آ گیا کہ یہ لچر بات ہے۔ خود ہی اس کی تردید کی اور بولے۔

''کیوں نہ ساری حالت اسے سمجھا دی جائے۔ ذرا دیر کے لیے اسے رنج تو ہوگا' لیکن ہمیشہ کے لیے راستہ صاف ہو جائے گا۔''

لیکن اس میں رماناتھ کی کرکری ہوتی تھی۔ پھر تو اسے منہ دکھانے کی بھی جگہ نہ رہے گی۔ جب وہ پوچھے گی۔ تمہاری زمینداری کیا ہوئی۔ بینک کے روپے کیا ہوئے تو وہ کیا جواب دے گا؟ رنجیدہ ہو کر بولا۔ ''اس میں سراسر بے عزتی ہے کیا آپ صراف کو دو چار مہینے میں نہیں ٹال سکتے؟''

دیاناتھ۔ ''غیر ممکن۔''

تینوں کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ دیاناتھ نے اپنا فیصلہ سنا دیا' چونکہ ماں اور بیٹے کا یہ فیصلہ منظور نہ تھا۔ اس لیے اب اس گتھی کو سلجھانے کا بار بھی انہیں دنوں پر تھا۔ جاگیشری نے تو ایک طرح سے طے کر لیا تھا کہ دیاناتھ کو جھک مار کر اپنی پارسائی کو رخصت کرنا پڑے گا۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ ہمارے اوپر بوجھ لدا ہوا ہو اور ہم دھرم کا راگ الاپتے جائیں' مگر رماناتھ جانتا تھا کہ والد نے جو کام اپنی زندگی میں کبھی نہیں کیا' وہ آج نہ کریں گے۔ وہ بغیر پس و پیش کے جالپا سے شہر سے زیور مانگ بیٹھیں گے اور وہ یہ نہ چاہتا تھا........وہ اب پچھتا رہا تھا کہ کیوں جالپا سے ڈینگیں ماریں؟ اس وقت اسے ذرا بھی فکر نہ تھی کہ ایک دن سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ دروغ دور اندیش نہیں ہوتا لیکن وہ دن اتنی جلدی آئے گا' یہ کون جانتا تھا۔ اگر اس نے جھوٹا وقار نہ جمایا ہوتا' تو جاگیشری کی طرح وہ بھی

سارا بار دیاناتھ پر چھوڑ کر بے فکر ہو جاتا' لیکن اس وقت وہ اپنے ہی بنائے ہوئے جال میں پھنس گیا تھا۔ کیسے نکلے؟

اس نے کتنی ہی تدبیریں سوچیں' لیکن ایسی کوئی نہ تھی جو آگے چل کر اسے الجھن میں نہ ڈال دیتی۔ یکا یک اسے ایک چال سوجھ گئی۔ اس کا دل اچھل پڑا لیکن جالپا کے ساتھ دغا یا فریب کرنے کا خیال بھی اسے ذلت آمیز معلوم ہوا۔

دیاناتھ نے پوچھا ''کوئی تدبیر سوجھی؟''

''مجھے تو کچھ نہیں سوجھتا؟''

''مگر کوئی تدبیر تو سوچنی ہی پڑے گی۔ کیوں اس سے دو چار عدد مانگ نہیں لیتے۔ یہ تو ایسا مشکل کام نہیں۔''

''مجھے شرم آتی ہے۔''

''تم بھی عجیب آدمی ہو۔ نہ خود مانگو گے' نہ مجھے مانگنے دو گے' تو آخر یہ کام کیسے پار لگے گا؟ میں تم سے ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے کوئی امید مت رکھو۔ اپنی زندگی کے آخری دن جیل میں نہیں کاٹنا چاہتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ کس کی زندگی میں ایسے موقع نہیں آتے۔ تمہی اپنی ماں سے پوچھو۔''

جاگیشری نے اس کی تائید کی۔ ''مجھ سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا تھا کہ گھر کے لوگ پریشان ہوں اور میں زیور پہنے بیٹھی رہوں۔ نہیں تو آج میرے پاس گہنے ہوتے۔ شادی میں پانچ ہزار سے کم کا چڑھاوا نہیں گیا تھا' مگر پانچ ہی سال میں سب صاف ہو گیا۔''

دیاناتھ نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔ ''شرم کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔''

رماناتھ نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''مانگ تو میں بھی نہیں سکتا۔ ہاں! کہیے اٹھالاؤں؟''

دیاناتھ نے حیرت میں آکر پوچھا۔ ''اٹھالاؤ گے اس سے چھپا کر۔''

رمانے ترش ہوکر کہا۔ ''اور آپ کیا سمجھ رہے ہیں؟''

دیاناتھ نے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا اور ایک لمحے کے بعد بولے۔ ''نہیں میں نے جال کبھی نہیں کیا اور نہ کبھی کروں گا۔ جال کروں۔ اپنی بہو کے ساتھ' چھی' چھی' ۔ جو کام آسانی سے ہو سکتا ہے' اس کے لیے فریب! کہیں اس کی نگاہ پڑ گئی' ت و تمہیں دل میں کیا سمجھے گی۔ مانگ لینا اس سے کہیں بہتر ہے۔''

رمانے کہا۔ ''آپ کو اس سے کیا مطلب! مجھ سے چیزیں لے لیجیے گا۔ مگر جب آپ جانتے تھے کہ ایک دن یہ نوبت آئے گی' تو اتنے زیور لے جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ مفت کا دردسر مول لیا۔ اس کھانے سے کیا فائدہ کہ پیٹ میں درد ہونے لگے۔ میں تو سمجھ رہا تھا، کہ آپ نے کوئی راستہ نکال لیا ہوگا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ یہ زحمت میرے سر ڈال دیں گے۔ ورنہ میں ان تمام چیزوں کو کبھی نہ لے جانے دیتا۔ یہی تو ہوتا کہ ادھر والوں کو شکایت ہوتی' مگر شکایتوں سے ہمارا کیا نقصان تھا۔ یہ تو گناہ بےلذت ہوا۔ بدنامی الگ ہوئی۔ پریشانی الگ۔ میں یہ نہیں دکھانا چاہتا کہ ہم سب اتنے پھٹے حال میں ہیں۔ چوری ہو جانے پر تو صبر کرنا ہی پڑے گا۔''

دیاناتھ چپ ہو گئے۔ اس جوش میں رمانے انہیں خوب کھری سنائیں

اور وہ چپ چاپ سنتے رہے۔ آخر جب نہ سنا گیا تو اٹھ کر پھر کتب خانے میں چلے گئے۔ یہ ان کا روز کا دستور تھا، جب تک دو چار رسالے نہ پڑھ لیں، ان کا کھانا ہضم نہ ہوتا تھا۔ اس گوشۂ عافیت میں پہنچ کر وہ گھر کی فکروں سے آزاد ہو جاتے تھے۔

آخر رما بھی وہاں سے اٹھا' پر جالپا کے پاس نہیں بلکہ اپنے کمرے میں گیا۔ اس کا کوئی کمرہ الگ تو تھا نہیں، ایک ہی مردانہ کمرہ تھا۔ اسی میں دیا ناتھ اپنے دوستوں سے گپ شپ کرتے۔ دونوں لڑکے پڑھتے اور ما احباب کے ساتھ شطرنج کھیلتا۔ رما کمرے میں پہنچا تو دیکھا۔ دونوں لڑکے تاش کھیل رہے ہیں۔ گوپی کا تیرھواں سال تھا۔ بشمبر کا نواں۔ دونوں رما سے تھر تھر کانپتے تھے۔ رما خود خوب تاش اور شطرنج کھیلتا' مگر بھائیوں کو کھیلتے دیکھ کر اس کے ہاتھ میں کھجلی ہونے لگتی تھی۔ خود چاہے دن بھر سیر لپسپاٹے کیا کرے' مگر کیا مجال کہ دونوں بھائیوں میں سے کوئی باہر نکلے۔ دیا ناتھ خود لڑکوں کو کبھی نہ مارتے تھے۔ موقع ملتا تو ان کے ساتھ کھیلتے تھے۔ انہیں کنکوے اڑاتے دیکھ کر ان کے بچپن کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ دو چار پیچ لڑا دیتے۔ اس لیے لڑکے رما سے جتنا ڈرتے تھے' اتنا ہی باپ سے محبت کرتے تھے۔

رما کو دیکھتے ہی لڑکوں نے تاش کو ٹاٹ کے نیچے چھپا دیا اور پڑھنے لگے، مگر کن انکھیوں سے سر پر پڑنے والی چپت کا انتظار کر رہے تھے۔

رما نے مونڈھے پر بیٹھ کر گوپی ناتھ سے کہا ''تم نے بھنگ کی دکان دیکھی ہے نہ کیڑ؟''

گوپی ناتھ خوش ہو کر بولا ''ہاں' دیکھی کیوں نہیں؟''

''جا کر چار پیسے کا معجون لے لو اور آدھ سیر مٹھائی بھی لیتے آنا۔''

گوپی روپیہ لے کر بازار چلا گیا۔

(7)

رات کے دس بج گئے تھے' جالپا کھلی چھت پر لیٹی ہوئی تھی۔ جیٹھ کی مدھم چاندنی رات میں سامنے گنبد مینار اور درخت' خواب کی تصویروں سے معلوم ہوتے تھے۔ جالپا کی آنکھیں چاند کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں چاند کی طرف اڑی جا رہی ہوں۔ اسے اپنی ناک میں کھجلی' آنکھوں میں جلن اور سر میں چکر کا احساس ہو رہا تھا۔ کوئی بات ذہن میں آتے ہی بھول جاتی اور بہت یاد کرنے پر بھی یاد نہ آتی۔ ایک بار گھر کی یاد آئی۔ رونے لگی۔ ایک ہی لمحہ میں سہیلیوں کی یاد آ گئی۔ ہنسنے لگی۔

دفعتاً رما ناتھ ایک پوٹلی لیے مسکراتا ہوا آیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

جالپا نے اٹھ کر پوچھا ''پوٹلی میں کیا ہے؟''

''بوجھ جاؤ تو جانوں۔''

''ہنسی کا گول گپا ہے۔'' یہ کہہ کر ہنسنے لگی۔

''غلط۔''

''تو پریم کی پٹاری ہو گی؟''

رما نے کہا ''ٹھیک آج میں تمہیں پھولوں کی دیوی بناؤں گا۔''

جالپا کھل اٹھی۔ رما نے بڑے شوق سے اسے پھولوں کے زیور پہنانے شروع

کیے۔ پھولوں کے نازک اور طراوت آمیز احساس سے جالپا کے تن نازک میں گدگدی سی ہونے لگی۔ انہی پھولوں کی طرح اس کے جسم کا ایک ایک ذرہ کھل اٹھا۔

رما نے مسکرا کر کہا۔ ''کیا انعام دیتی ہو؟''

جالپا نے کچھ جواب نہ دیا۔ سامنے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں گئی اور آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ نشہ کی ترنگ میں کچھ ایسا ہوا کہ ''میں سچ مچ پھولوں کی دیوی ہوں' وہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔''

رما کو اس وقت اپنی دغا بازی پر ندامت ہو رہی تھی۔ جالپا نے کمرے سے لوٹ کر اس کی طرف مخمور نگاہوں سے دیکھا تو اس نے منہ پھیر لیا۔ ان بے لوث اور پر اعتقاد آنکھوں کے سامنے وہ آنکھیں نہ اٹھا سکا۔

جالپا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ''میرے بابو جی تمہیں دیکھ کر گئے اور ماں سے تمہاری تعریف کرنے لگے تو میں سوچتی تھی۔ تم کیسے ہوگے۔ دل میں طرح طرح کی تصویریں آتی تھیں۔''

رما نے ایک لمبی سانس کھینچی اور جواب نہ دیا۔

جالپا نے اسی سادگی کے انداز سے کہا۔ ''میری سہیلیاں تمہیں دیکھ لبھائیں۔ شہزادی تو کھڑکی کے سامنے سے ہٹتی ہی نہ تھی' جب تم اندر گئے تھے تو اسی نے تمہیں پان کے بیڑے دیئے تھے۔ یاد ہے؟''

رما تھ نے کوئی جواب نہ دیا جالپا پھر بولی۔ ''اجی وہی جو رنگ روپ میں سب سے اچھی تھی۔ جب تم نے اس کی طرف رسیلی آنکھوں سے دیکھا تو بیچاری

شرم کے مارے گڑ گئی۔ مجھ سے کہنے لگی۔ جیجا جی تو بڑے رنگین مزاج معلوم ہوتے ہیں۔ سہیلیوں نے اسے خوب چڑایا۔ یاد ہے؟''

رماناتھ نے گویا ندی میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یاد نہیں آتا۔''

''اچھا اب کے چلو گے تو دکھا دوں گی۔ آج تم بازار گئے تھے کہ نہیں؟''

رما نے سر جھکا کر کہا۔ ''آج تو فرصت نہیں ملی۔''

''جاؤ' میں تم سے نہ بولوں گی۔ روز حیلے حوالے کرتے ہو۔ اچھا کل تو لا دو گے؟''

رماناتھ کا دل مسوس اٹھا۔ یہ غریب چند ہار کے لیے اس قدر بیتاب ہو رہی ہے اسے کیا خبر؟ بخت نارسا اسے تباہ کرنے کا سامان کر رہا ہے۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ چاند کسی چور کی طرح ایک درخت کی آڑ سے جھانک رہا تھا۔ جالپا شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے سرمست خواب تھی۔ رما آہستہ سے اٹھا' مگر نیند کی گود میں سوئی ہوئی نازنین نے اسے متلون کر دیا۔ وہ ایک لمحہ تک کھڑا اہفتوں نظروں سے جالپا کی طرف دیکھتا رہا۔ نیند میں وہ پھول کتنا شگفتہ ہو گیا تھا۔ کمرے سے اندر قدم نہ رکھ سکا۔ پھر لیٹ گیا۔

جالپا نے چونک کر پوچھا۔ ''کہاں جاتے ہو کیا سویرا ہو گیا؟''

''ابھی تو بڑی رات ہے۔''

''تو تم بیٹھے کیوں ہو؟''

''کچھ نہیں' ذرا پانی پینے گیا تھا۔''

جالپا نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے اور اسے سہلا کر کہا۔ ''تم اس طرح

مجھ پر ٹونا کرو گے تو میں بھاگ جاؤں گی۔ بسنتی سچ کہتی تھی، مردوں کی آنکھوں میں جادو ہوتا ہے۔''

رما ناتھ نے روتے ہوئے دل کو سمجھا کر کہا۔ ''کیا کروں، آنکھوں کی پیاس نہیں بجھتی۔''

دونوں پھر لیٹے۔ ایک نشہ الفت میں متوالی، دوسرا فکر کے سمندر میں ڈوبا ہوا۔

تین گھنٹے اور گزر گئے۔ دواذشی کے چاند نے اپنا شراغ بجھا دیا۔ آدھی رات تک جاگنے والا بازار بھی سو گیا۔ صرف رما ابھی تک جاگ رہا تھا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے کے باعث وہ بار بار اٹھتا تھا اور پھر لیٹ جاتا تھا۔ آخر جب چار بجے کی آواز کان میں آئی تو گھبرا کر اٹھا اور کمرے میں جا پہنچا۔ زیوروں کا صندوقچہ الماری میں رکھا ہوا تھا۔ رما نے اسے اٹھا لیا اور تھر تھر کانپتا ہوا اسے لے کر نیچے اتر گیا۔ اس عجلت میں اسے اتنی فرصت نہ ملی کہ وہ چار چیزیں چھانٹ کر نکالے۔

دیا ناتھ نیچے برآمدے میں سو رہے تھے۔ رما نے انہیں آہستہ سے جگایا' انہوں نے ہکا ہکا ہو کر پوچھا ''کون؟''

رما ناتھ نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہا۔ ''میں ہوں' یہ صندوقچی اٹھا لایا' رکھ لیجیے۔''

دیا ناتھ صورتحال سمجھ گئے۔ رما ناتھ نے جس وقت ان سے زیوروں کے اٹھا لانے کا ذکر کیا تو انہوں نے سمجھا تھا کہ یہ محض حیلے کر رہا ہے۔ انہیں اس کا یقین نہ آیا تھا کہ یہ ارادے کو پورا کر دکھائے گا۔ ایسی کمینہ حرکتوں سے وہ علیحدہ رہنا چاہتے

تھے۔ پوچھا۔ ''اسے کیوں اٹھالائے؟''

''آپ ہی نے تو فرمایا تھا۔''

''جھوٹ کہتے ہو۔''

''تو پھر رکھ آؤں؟''

رمانا تھ کے اس سوال نے منشی جی کو مخمصہ میں ڈال دیا۔ جھینپتے ہوئے بولے۔ ''اب کیا رکھ آؤ گے؟ کہیں دیکھ لے تو غضب ہی ہو جائے۔ وہی کام کرو گے جس میں رسوائی ہو۔ اب کھڑے کیا ہو۔ صندوقچی میرے بڑے صندوق میں رکھ آؤ اور جا کر لیٹ رہو۔''

برآمدے کے پیچھے دیانا تھ کا کمرہ تھا۔ اس میں دیار کا ایک پرانا صندوق رکھا ہوا تھا۔ رمانے صندوقچی اس کے اندر رکھ دی اور بڑی تیزی سے اوپر چلا گیا۔ چھت پر پہنچ کر اس نے آہٹ لی۔ جالپا ابھی پچھلے پہر کے خواب نوشیں کے مزے لے رہی تھی۔

رما جوں ہی چارپائی پر بیٹھا۔ جالپا چونک کر اس سے چمٹ گئی۔

رمانے پوچھا۔ ''کیا ہے تم چونک کیوں پڑیں؟''

جالپنا نے ادھر ادھر شبہ آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''کچھ نہیں ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ کتنی رات ہے ابھی؟''

رمانے لیٹتے ہوئے کہا۔ ''سویرا ہو رہا ہے، کیا خواب دیکھتی تھیں؟''

جالپا نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''جیسے کوئی چور میرے گہنوں کی صندوقچی اٹھائے لیے جاتا ہو۔''

رما کا دل اتنے زور سے دھک دھک کرنے لگا کہ گویا اس پر ہتھوڑے پڑ رہے ہوں ۔خون سرد ہوگیا۔وہ زور سے چلا اٹھا ''چور،چور.........''

نیچے برآمدے میں منشی جی بھی چلا اٹھے ۔''چور چور۔''

جالپا گھبرا کر اٹھی' دوڑی ہوئی کمرے میں گئی ۔ایک جھٹکے میں الماری کھولی' صندوقچی وہاں موجود نہ تھی بے ہوش ہوکر گر پڑی۔

(8)

صبح ہوتے ہی دیا ناتھ گہنے لے کر صراف کے پاس پہنچے اور حساب ہونے لگا۔صراف کے پندرہ سو روپے آتے تھے' مگر وہ صرف پندرہ سو روپے کے زیور لے کر راضی نہ ہوا ۔ بکے ہوئے زیوروں کو بٹے پر ہی لے سکتا تھا ۔ بکی ہوئی چیز کون واپس لیتا ہے ۔ جا کڑ پہ دیئے ہوتے تو دوسری بات تھی ۔ان چیزوں کا تو سودا ہو چکا تھا' اس نے کچھ ایسے تاجرانہ اصول کی باتیں کیں اور دیا ناتھ کو کچھ ایسا شکنجہ میں کسا کہ بیچارے کو ہاں ہاں کرنے کے سوا اور کچھ نہ سوجھی ۔ دفتر کا بابو شاطرانہ دکاندار سے کیا پیش پاتا ۔ پندرہ سو میں ڈھائی ہزار کے گہنے بھی چلے گئے ۔اوپر سے پچاس روپے اور باقی رہ گئے ۔اس مسئلے پر باپ بیٹے میں کئی دن خوب مباحثے ہوئے ۔دونوں ایک دوسرے کو الزام دیتے' کئی دن آپس میں بول چال بند رہی ۔مگر اس چوری کا حال پوشیدہ رکھا گیا۔ پولیس کو خبر ہو جاتی تو بھانڈا پھوٹ جاتا ۔جالپا سے یہی کہا گیا کہ مال تو دستیاب نہ ہوگا' مفت کی زحمت ہوگی ۔

جالپا کو زیوروں سے جتنی الفت تھی' اتنی شاید دنیا کی اور کسی چیز سے نہ تھی اور اس میں تعجب کی کون سی بات تھی ۔جب وہ تین سال کی نادان بچی تھی' اس وقت اس

کے لیے سونے کے چوڑے بنوائے گئے تھے۔ دادی جب اس کو گود میں کھلانے لگتی تو زیوروں ہی کی چرچا کرتی۔ ''تیرا دولہا تیرے لیے اچھے گہنے لائے گا' تو ٹھمک ٹھمک کر چلے گی۔''

جالپا پوچھتی۔ ''چاندی کے ہوں گے یا سونے کے دادی؟''

دادی کہتی۔ ''سونے کے ہوں گے بیٹی۔ چاندی کے کیوں لائے گا؟ چاندی کے لائے تو تم اٹھا کر اس کے منہ پر پٹک دینا۔''

مانکی چھیڑ کر کہتی۔ ''چاندی کے تو لائے گا ہی۔ سونے کے اسے کہاں ملے جاتے ہیں؟''

جالپا رونے لگتی۔ اس پر بوڑھی دادی' مانکی گھر کی مہریاں' پڑوسنیں اور دین دیال سب ہنس پڑتے۔ ان لوگوں کی تفریح کا یہ لازوال سرچشمہ تھا۔

لڑکی جب ذرا اور سیانی ہوئی تو گڑیوں کے بیاہ چانے لگی۔ لڑکے کی طرف سے چڑھاوے آتے۔ وہ دلہن کو گہنے پہناتی اور ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرتی۔ کبھی کبھی دلہن گڑیا اپنے دولہا گڈے سے زیوروں کے لیے روٹھ جاتی۔ گڈا بے چارہ کہیں نہ کہیں سے زیور لا کر دلہن کو خوش کرتا تھا۔ انہیں دنوں بساطی نے اسے وہ چندن ہار دیا' جو اب تک اس کے پاس محفوظ تھا۔

جب رابڑی ہوئی تو بڑ بوڑھیوں میں بیٹھ کر زیوروں کے چرچے سننے لگی۔ عورتوں کی اس چھوٹی سی دنیا میں اس کے سوا اور کوئی مشغلہ نہیں تھا۔ کس نے کون کون سے زیور بنوائے؟ کتنا صرف ہوا؟ ٹھوس ہیں یا پورے؟ جڑاؤ ہیں یا سادے؟ سونے کے ہیں یا چاندی کے؟ انہی اہم مسائل پر ہمیشہ تنقید و تبصرے

ہوتے رہتے تھے۔ کوئی دوسرا تذکرہ اتنا دلچسپ اتنا مزیدار ہو ہی نہ سکتا تھا۔

اس مرصع دنیا میں پلی ہوئی جالپا کی یہ زیور پسندی بالکل فطری تھی۔ مہینہ بھر سے زیادہ ہو گیا' پر ابھی اس کا زخم تازہ ہے۔ برائے نام کچھ کھا پی لیتی ہے' برائے نام ہنس بول لیتی ہے' دن بھر چارپائی پر پڑی آسمان کی طرف تاکتی رہتی ہے۔ سارا گھر سمجھا کر ہار گیا' پڑوسنیں سمجھا کر ہار گئیں' دین دیال آ کر سمجھا گئے۔ پر جالپا کے درد میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اسے اب گھر میں کسی پر اعتبار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ وہ رما سے بھی کھچی ہوئی رہتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے' سارا گھر اس سے بے اعتنائی کر رہا ہے۔ سب کے سب اس کی جان کے گاہک ہو رہے ہیں۔ جب ان کے پاس اتنی دولت ہے تو پھر اس کے گہنوں کو کیوں نہیں بنوا دیتے۔ جسے ہم سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں' اسی پر سب سے زیادہ ناراض بھی ہوتے ہیں۔ جالپا کو سب سے زیادہ غصہ رمانا تھ پر تھا۔ اگر یہ اپنے ماں باپ سے زور دے کر کہتے تو کوئی ان کی بات نہ ٹال سکتا۔ مگر یہ کچھ کہیں بھی' ان کے منہ میں تو دہی جمایا ہوا ہے' مجھ سے محبت ہوتی تو یوں بے فکر نہ بیٹھے رہتے۔ جب تک ساری چیزیں نہ بنوا لیتے' رات کو نیند نہ آتی۔ آخر جائیں گے تو اپنی ہی طرف' میں کون ہوں۔

وہ رما سے صرف کبیدہ خاطر ہی نہ رہتی' وہ اس کی دلجوئی کرتا تو دو چار جلی کٹی سنا دیتی۔ بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ غریب اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جلا جاتا تھا۔ اگر وہ جانتا کہ اس کی ڈینگوں کا یہ نتیجہ ہو گا تو زبان پر مہر لگا لیتا۔ یہ غم اس کے لیے سوہان روح ہو رہا تھا۔ کہاں صبح سے شام تک ہنسی قہقہہ' سیر سپاٹے میں کٹتے تھے۔ کہاں اب نوکری کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا تھا۔ ساری مستی

غائب ہوگئی۔ تین ہزار کے زیور کیسے بنیں گے؟ اگر نوکر بھی ہوا تو ایسا کون سا بڑا عہدہ مل جائے گا۔ تین ہزار تو شاید تین پشتوں میں بھی جمع نہ ہوں۔ وہ کوئی ایسی تدبیر سوچ نکالنا چاہتا تھا جس سے وہ جلد سے جلد بے حساب دولت کا مالک ہو جائے۔ کہیں اس کے نام کوئی لاٹری نکل آتی تو پھر تو وہ جالپا کو زیوروں سے مڑھ دیتا۔ سب سے پہلے چندن ہار بنواتا۔ اس میں ہیرے جڑوا دیتا۔ اگر آج اسے جعلی نوٹ بنانا آ جاتا تو ضرور بنا کر چلا جاتا۔

ایک دن وہ شام تک نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ شطرنج کی بدلوت اس کے کتنے ہی اچھے اچھے آدمیوں سے یارانہ ہو گیا تھا' لیکن وہ شرم و لحاظ کے مارے کسی سے اظہار حال نہ کرتا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ خاطر داریاں اسی وقت تک ہیں' جب تک وہ کسی کے سامنے مدد کے لیے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ یہ آن ٹوٹی تو پھر کوئی بات نہ پوچھے گا۔ کوئی ایسا نکتہ رس آدمی نہ نظر آتا تھا' جو سارے کیفیت قیافے سے تاڑ جائے اور اسے کوئی معقول جگہ دلوا دے۔ آج وہ بہت رنجیدہ تھا۔ دوستوں پر ایسا غصہ آ رہا تھا کہ ایک ایک کو پھٹکارے اور آئیں تو دروازے ہی سے دھتکار دے' مگر وہ ذرا غور کرتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس معاملے میں دوستوں کا اتنا قصور نہ تھا' جتنا خود اس کا۔ اس کا کوئی ایسا دوست نہ تھا' جس سے اس نے بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنائی ہوں۔ یہ اس کی عادت تھی۔ گھر کی اصلی کیفیت کو وہ بدنامی کے داغ کی طرح چھپاتا رہا اور اب وہ کسی سے اپنا دردِ دل نہیں کہہ سکتا۔ گھر میں آ کر منہ لٹکائے ہوئے بیٹھ گیا۔

جاگیشری نے پانی لا کر رکھ دیا' اور پوچھا۔ ''آج تم دن بھر کہاں رہے بیٹا؟

ہاتھ منہ دھو ڈالو۔‘‘

رما نے لوٹا اٹھایا ہی تھا کہ جالپا نے آ کر تند لہجہ میں کہا۔ ’’مجھے میرے گھر پہنچا دو اسی وقت۔‘‘

رما نے لوٹا رکھ لیا اور اس کی طرف تکنے لگا گویا بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔

جاگیشری بولی۔ ’’کیسی بات کہتی ہو بہو‘ بھلا اس طرح کہیں بہو بیٹیاں بدا ہوتی ہیں۔‘‘

جالپا نے جھلاہٹ سے کہا۔ ’’میں ان بہو بیٹیوں میں سے نہیں ہوں۔ میرا جس وقت جی چاہے گا‘ جاؤں گی۔ جس وقت جی چاہے گا‘ آؤں گی۔ جب یہاں کوئی میری بات نہیں پوچھتا تو میں بھی کسی کو اپنا نہیں سمجھتی۔ میں چڑیا نہیں ہوں‘ جس کا پنجرہ اور دانہ پانی رکھ کر بند کر دیا جائے۔ میں بھی آدمی ہوں۔ اب اس گھر میں ایک لمحہ بھر نہ رہوں گی۔ اگر کوئی میرے ساتھ نہ جائے گا تو میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔ راہ میں کوئی بھیڑیا نہیں بیٹھا ہے‘ جو مجھے اٹھا لے جائے گا۔‘‘

رما نے پوچھا۔ ’’آخر کچھ معلوم بھی تو ہو کیا بات ہے؟‘‘

’’بات کچھ نہیں ہوئی۔ اپنا جی ہے‘ یہاں نہیں رہنا چاہتی۔‘‘

’’بھلا اس طرح جاؤ گی تو تمہارے گھر والے کیا کہیں گے‘ یہ تو سوچو؟‘‘

’’یہ سب سوچ چکی ہوں اور زیادہ نہیں سوچنا چاہتی۔ میں جا کر اسباب باندھتی ہوں اور اسی گاڑی سے جاؤں گی۔‘‘

یہ کہہ کر جالپا اوپر چلی گئی۔ رما بھی پیچھے یہ سوچتا ہوا چلا کہ اس کا غصہ کیسے ٹھنڈا کروں۔

جالپا اپنے کمرے میں جا کر بستر باندھ رہی تھی کہ رما نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ''تمہیں میری قسم جو اس وقت جانے کا نام لو۔''

جالپا نے تیوری بدل کر کہا۔ ''تمہاری قسم کی مجھے پروا نہیں ہے۔''

اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پھر بستر لپیٹنے لگی۔ رما کھسیانا سا ہو کر ایک کنارے کھڑے ہو گیا۔ جالپا نے بستر بند سے بستر کو باندھا اور اپنا صندوق صاف کرنے لگی، مگر اس میں اب وہ پہلے سی تیزی نہ تھی۔ صندوق کو بار بار بند کرتی اور کھولتی تھی۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ صرف چھت پر رکا ہوا پانی ٹپک رہا تھا۔

آخر وہ بستر کے بنڈل پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ''تم نے مجھے قسم کیوں دلائی؟''

رما کے دل میں امید کی گدگدی پیدا ہوئی۔ بولا۔ ''اس کے سوا تمہیں روکنے کا میرے پاس اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔''

''کیا تم چاہتے ہو، میں یہیں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں؟''

''تم ایسے منحوس الفاظ کیوں منہ سے نکالتی ہو۔ میں تو چلنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر کم سے کم ان لوگوں سے تو پوچھ لوں۔''

بجھتی ہوئی آگ پر تیل پڑ گیا۔ جالپا ترش ہو کر بولی۔ ''وہ میرے کون ہوتے ہیں کہ میں ان سے پوچھوں۔''

رما نے پوچھا۔ ''کوئی نہیں ہوتے؟''

جالپا نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ ''کوئی نہیں۔ اگر کوئی ہوتے تو میری طرف سے یوں دل نہ چھوٹا کرتے۔ اس قید میں پاگل ہو جاؤں گی۔ نہ کہیں آنا، نہ جانا، نہ کسی سے بات چیت۔ یہ صورت تو مجھ سے نہیں دکھائی جاتی۔ آخر دو لڑکے

اور بھی تو ہیں، ان کے لیے بھی تو کچھ جوڑیں گے۔''

رما کو بڑی بڑی باتیں کرنے کا پھر موقع ملا، بولا ''شاید تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ نہیں تو ڈھائی تین ہزار ان کے لیے کیا بڑی بات تھی؟''

''مگر ہیں مکھی چوس پرلے درجے کے۔''

''مکھی چوس نہ ہوتے تو اتنی دولت کہاں سے آتی۔''

''مجھے تو کسی کی پروا نہیں ہے جی۔ ہمارے گھر کس بات کی کمی ہے۔ جب تمہاری نوکری لگ جائے تو مجھے بلا لینا۔''

''تلاش کر رہا ہوں۔ کتنے ہی بڑے آدمیوں سے ملاقات ہے۔ یہی ہے ذرا اچھی جگہ چاہتا ہوں۔''

''میں ان لوگوں کا رخ سمجھتی ہوں۔ میں بھی یہاں اب دعوے کے ساتھ رہوں گی۔ کسی سے ذکر کیا؟''

''شرم آتی ہے کسی سے کہتے ہوئے۔''

''اس میں شرم کی کون سی بات ہے، کہتے شرم آتی ہو تو رقعہ لکھ دو۔''

رما اچھل پڑا۔ کتنی آسان تدبیر تھی اور ابھی تک یہ سیدھی سی بات اسے نہ سوجھی تھی۔ بولا۔ ''ہاں! یہ تم نے اچھی ترکیب بتائی۔ کل ضرور لکھوں گا۔''

جالپا بولی۔ ''تم آج ہی تھوڑی لوٹ آؤ گے۔''

رما بولا۔ ''کیا تم سچ مچ جاؤ گی؟ تو مجھے نوکری مل چکی اور میں خط لکھ چکا۔ تمہارے فرق میں بیٹھ کر روؤں گا کہ نوکری ڈھونڈوں گا۔ نہیں اس وقت جانے کا خیال چھوڑو۔ نہیں سچ کہتا ہوں میں، کہیں بھاگ جاؤں گا۔ گھر کا حال دیکھ چکا

تھا۔ تمہارے سوا اب اور کون بیٹھا ہوا ہے کہ جس کے لیے یہاں پڑا رہوں۔ ہٹو تو ذرا میں بستر کھول دوں۔"

جالپا نے بستر پر سے ذرا کھسک کر کہا۔ "میں بہت جلد چلی آؤں گی۔ تم گئے اور میں آئی۔"

رما بستر کھولتا ہوا بولا۔ "جی نہیں معاف کیجیے۔ اس دھوکے میں میں نہیں آتا۔"

جالپا نے احسان جتاتے ہوئے کہا "تم نے میرا بندھا بندھایا بستر کھول دیا۔ نہیں تو آج کتنے مزے سے گھر پہنچ جاتی۔ میں نے آج پکا ارادہ کر لیا تھا۔"

رما نے پان کھایا اور اپنے کمرے میں آ کر دوستوں کو خط لکھنے لگا۔

(9)

رما ناتھ کے شناساؤں میں ایک رمیش بابو میونسپل بورڈ کے ہیڈ کلرک تھے۔ عمر تو چالیس سال سے اوپر تھی، مگر تھے بڑے شوقین۔ شطرنج کھیلنے بیٹھ جاتے تو سویرا کر دیتے۔ دفتر کی بھی یاد نہ رہتی۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ جوانی میں بیوی مر گئی تھی۔ دوسری شادی نہیں کی۔ اس تجرد کی زندگی میں تفریحی مشاغل کے سوا دلچسپی کا اور کیا سامان تھا۔ رما سے ان کی بڑی بے تکلفی تھی۔ وہاں کوئی ایسا نٹھلا تھا، وج رات رات بھر ان سے شطرنج کھیلتا۔ کئی دن سے بیچارے بہت بے قرار ہو رہے تھے۔ نہ رما آیا اور نہ شطرنج کی کوئی بازی ہوئی۔ اخبار کہاں تک پڑھتے۔ سوچا اب رما میرے پاس کیوں آنے لگا۔ کئی بار جی میں آیا کہ اسے بلوائیں۔ مگر یہ سوچ کر کہ وہ کیوں آنے لگا رہ گئے۔ کہاں جائیں۔ سوچا سینما ہی دیکھ آئیں۔ کسی طرح دن تو کٹے۔ سینما سے انہیں بہت رغبت نہ تھی، مگر اس وقت انہیں سینما کے سوا اور کچھ نہ

سوجھا۔ کپڑے پہنے اور جانا ہی چاہتے تھے کہ رما نے کمرے میں قدم رکھا۔

رمیش اسے دیکھتے ہی گیند کی طرح لڑھک کر دروازے پر جا پہنچے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ ''آؤ جی آؤ۔ تم اس بڈھے کو بھول ہی گئے۔ ہاں بھائی اب کیوں آؤ گے۔ معشوق کی رسیلی باتوں کا مزہ یہاں کہاں۔ چوری کا کچھ پتا چلا؟''

رما نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ ''کچھ بھی نہیں۔''

رمیش بابو نے چھوٹی میز اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''بہت اچھا ہوا تھانے میں رپٹ نہیں لکھائی۔ نہیں سو دو سو کے ماتھے اور جاتی۔ دلہن کو تو بہت رنج ہوا ہوگا؟''

''کچھ پوچھیے مت۔ میں تو تنگ آ گیا۔ بابو جی سنتے ہی نہیں۔''

''بابو جی کے پاس کیا قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ دس بیس ہزار روپے ہوں گے تو۔ ابھی دو بچے بھی تو سامنے ہیں۔ نوکری کا بھروسہ ہی کیا۔''

''میں تو مصیبت میں پھنس گیا' اب معلوم ہوتا ہے کہ کہیں نوکری کرنی پڑے گی۔ چین سے زندگی کٹتی تھی' نہیں تو بیٹھے بٹھائے اس جنجال میں پھنس گئے۔ بتلائیے' ہے کہیں نوکری چاکری کا سہارا؟''

رمیش نے طاق پر سے مہرے اور بساط اتارتے ہوئے کہا۔ ''آؤ ایک بازی ہو جائے پھر اس مسئلے پر غور کریں۔ اسے جتنا آسان سمجھ رہے ہو' اتنا آسان نہیں ہے۔''

رما ناتھ نے منہ پھیر کر کہا۔ ''میرا تو اس وقت کھیلنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس وقت تک یہی فکر سر پر سوار ہے۔''

رمیش: ''لو شطرنج کے مہرے'' وہ بساط بچھاتے ہوئے بولے۔ ''آؤ بیٹھو! ایک بازی تو کھیل لو۔ پھر سوچیں گے کیا ہو سکتا ہے؟''

''ذرا بھی جی نہیں چاہتا۔ میں جانتا کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑیں گے تو شادی کے قریب ہی نہ جاتا۔''

''دو چار چالیں چلو تو آپ ہی جی لگ جائے گا۔ ذرا عقل کی گانٹھ کھلے گی۔''

بازی شروع ہوئی۔ کئی معمولی چالوں کے بعد رمیش نے رما کا رخ پلٹ دیا۔ رما نے میز پر ہاتھ ٹیک کر کہا ''اف! کا غلطی ہوئی ہے؟''

رمیش بابو کی آنکھوں میں نشہ کی سی سرخی پیدا ہونے لگی۔ شطرنج ان کے لیے شراب سے کم سرور انگیز نہ تھا۔ بولے۔ ''بھئی تو اچھا ہوئی۔ تمہارے لیے میں ایک تدبیر سوچ رہا ہوں۔ میرے ہی دفتر میں ایک جگہ خالی ہے، مگر مشاہرہ بہت کم ہے۔ محض تیس روپے۔ وہ خضابی ڈاڑھی والے خان صاحب ہیں۔ ان سے کام نہیں چلتا۔ سوچتا تھا جب تک کسی طرح کام چلا چلے، پڑا رہنے دوں۔ بال بچے والے آدمی ہیں۔ اس بیکاری کے زمانے میں کہاں مارے مارے پھریں گے، مگر وہ خود ہی نوکری سے بیزار ہو رہے ہیں۔ تمہارے لائق وہ جگہ نہیں ہے، مگر چاہو تو فی الحال کر لو۔''

یہ کہتے کہتے رما کا فیلا مار لیا۔

رما نے فیلے کو پھر اٹھانے کی کوشش کر کے کہا۔ ''آپ مجھے باتوں میں لگا کر میرے مہرے اڑاتے جاتے ہیں۔ اس کی سند نہیں، لائیے میرا فیلا۔''

''دیکھو بھائی بے ایمانی مت کرو۔ میں نے تمہارا فیلا زبردستی تو نہیں اٹھالیا۔

ہاں تو تمہیں وہ جگہ منظور ہے؟''

تنخواہ تو تیس ہی ہے۔

''ہاں تنخواہ تو کم ہے' مگر شاید کچھ دنوں کے بعد ترقی ہو جائے۔ میری تو رائے ہے کرلو۔ جگہ منظور ہے؟''

تنخواہ تو تیس ہی ہے۔

''ہاں تنخواہ تو کم ہے' مگر شاید کچھ دنوں کے بعد ترقی ہو جائے۔ میری تو رائے ہے کرلو۔ جگہ آمدنی کی ہے۔ خان صاحب نے تو اسی جگہ رہتے ہوئے لڑکوں کو ایم۔ اے' ایل۔ ایل۔ بی کرالیا۔ لڑکیوں کی شادیاں اچھے گھروں میں کیں۔ ہاں ذرا سمجھ بوجھ سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔''

رما نے بے غرضی جتلا کر کہا۔ ''آمدنی کی مجھے پروا نہیں۔ رشوت کوئی اچھی چیز نہیں۔''

رمیش بابو نے رما کی آنکھ بچا کر ایک مہرے کو آگے بڑھا کر کہا۔ ''بہت خراب' مگر عیال دار آدمی کیا کرے۔ میں اکیلا آدمی ہوں' میرے لیے ڈیڑھ سو کافی ہیں' لیکن جس گھر میں بہت سے آدمی ہوں۔ لڑکوں کی تعلیم ہو۔ لڑکیوں کی شادیاں ہوں۔ اس کے لیے رشوت کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ جب تک چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی تنخواہ اتنی نہ ہو جائے گی کہ وہ بھلمنسی کے ساتھ نباہ کر سکیں' تب تک رشوت بند نہیں ہو سکتی۔''

رما کا فرزین پٹ گیا رمیش بابو نے زور سے قہقہہ مارا۔

رما نے جھلا کر کہا۔ ''اگر آپ چپ چاپ کھیلئے تو کھیلئے۔ ورنہ میں تو جاتا

ہوں۔ مجھے باتوں میں لگا کر سارے مہرے اڑا لیے۔''

رمیش نے دب کر کہا۔ ''اچھا صاحب اب بولو تو زبان پکڑ لیجیے۔ یہ لیجیے شہ۔ تو تم کل عرضی پیش کر دو۔ مگر جس دن جگہ ملے گی' میرے ساتھ رات بھر کھیلنا پڑے گا۔''

''آپ تو دو ہی ماتوں میں رونے لگتے ہیں۔''

''اجی وہ دن گئے' جب آپ مجھے مات دیا کرتے تھے۔ ادھر میں نے ایک منتر جگایا ہے۔ کیا مجال کوئی مات دے سکے۔ پھر شہ۔''

''جی تو شاہتا ہے کہ دوسری مات دے کر جاؤں' مگر دیر ہو گئی۔''

''دیر کیا ہو گئی؟ ابھی تو کل نو بجے ہیں۔ کھیل لو۔ دل کا ارمان نکل جائے۔ یہ اور مات۔''

''اچھا کل ہی رہی' کل للکار کر پانچ ماتیں نہ دی ہوں تو کہیے گا۔''

''اجی جاؤ بھی۔ تم مجھے کیا مات دو گے۔ ہمت ہو تو ابھی سہی۔''

''اچھا آیئے! آپ بھی کیا کہیں گے۔ مگر پانچ بازیوں سے کم نہ کھیلوں گا۔''

''پانچ نہیں تم دس کھیلو جی۔ رات تو اپنی ہے تو چلو پھر کھانا کھالیں۔ تب اطمینان سے بیٹھیں۔ تمہارے گھر کہلائے دیتا ہوں کہ آج یہیں سوئیں گے' انتظار نہ کریں۔''

دونوں نے کھانا کھایا اور شطرنج پر بیٹھے۔ پہلی بازی میں گیارہ بج گئے۔ رمیش کی جیت رہی۔ دوسری بازی بھی انہیں کے ہاتھ رہی۔ تیسری بازی ختم ہوئی تو دو بج گئے تھے۔ رما نے آنکھیں مل کر کہا۔ ''اب مجھے تو نیند آ رہی ہے۔''

رمیش نے کہا۔ ''تو منہ دھو ڈالو۔ برف رکھی ہوئی ہے' پانچ بازیاں کھیلے بغیر نہیں سونے دوں گا۔''

رمیش بابو کو یقین ہو رہا تھا کہ آج میرا نیرا اقبال اوج پر ہے۔ نہیں تو رما کو متواتر تین ماتیں دینا آسان نہ تھا' مگر جب چوتھی ہار گئے تو یقین جاتا رہا۔ اندیشہ ہوا کہ کہیں متواتر ہارتا جاؤں۔ بولے اب تو سونا چاہیے۔

''کیوں پانچ بازیاں پوری نہ کیجیے گا؟''

''کیا فائدہ کل دفتر بھی تو جانا ہے۔''

رما نے زیادہ اصرار نہ کیا۔ دونوں آدمی سو گئے۔

رما یوں بھی آٹھ بجے سے پہلے نہ اٹھتا تھا۔ پھر آج تو تین بجے سویا تھا۔ آج تو اسے دس بجے تک سونے کا حق تھا' مگر رمیش بابو حسب معمولی پانچ بجے اٹھے' نہایا' سندھیا کو گھومنے گئے اور آٹھ بجے لوٹ آئے۔ رما اس وقت تک سوتا ہی رہا۔ آخر جب ساڑھے نو بج گئے تو انہوں نے اسے جگایا۔

رما نے بگڑ کر کہا۔ ''ناحق جگایا۔ کیسے مزے کی نیند آ رہی تھی۔''

''اجی وہ عرضی دینی ہے تم کو یاد نہیں؟''

''آپ دے دیجیے گا۔''

''اور جو کہیں صاحب نے بلایا تو میں ہی چلا جاؤں گا؟''

''اونہہ' جو چاہے کیجیے گا' میں تو سوتا ہوں۔''

رما پھر لیٹ گیا۔ رمیش نے کھانا کھایا۔ کپڑے پہنے اور دفتر چلنے کو تیار ہوئے۔ اس وقت رما یک بیک اٹھا اور بولا ''میں بھی چلوں گا۔''

''ارے منہ تو دھولو۔ بھلے آدمی۔''

''آپ تو چلے جا رہے ہیں۔''

''نہیں نہیں پندرہ بیس منٹ تک رک سکتا ہوں۔ تیار ہو جاؤ۔''

رما نے ایک منٹ میں منہ دھویا۔ پانچ منٹ میں کھانا کھایا اور چٹ پٹ رمیش کے ساتھ دفتر چلا۔

راستے میں رمیش نے مسکرا کر کہا۔ ''گھر کیا بہانہ کرو گے۔ کچھ سوچ رکھا ہے۔''

''کہہ دوں گا رمیش بابو نے آنے نہیں دیا۔''

''مجھے گالیاں دلواؤ گے اور کیا۔''

''مجھے عرضی لے کر صاحب کے پاس تو نہ جانا پڑے گا۔''

''اور کیا تم سمجھتے ہو گھر بیٹھے جگہ مل جائے گی؟ مہینوں دوڑنا پڑے گا۔''

''تو میں ایسی نوکری سے باز آیا۔ مجھے تو عرضی لے کر جاتے شرم آتی ہے۔ پہلے میں کلرکی کو ذلیل سمجھتا تھا۔ مگر وہی میرے سر پڑی۔''

''اجی پہلے سب یوں ہی گھبراتے ہیں۔ جب میں نوکر ہوا تو تمہاری عمر تھی۔ جس دن میری پیشی ہونے والی تھی۔ میں ایسا گھبرایا ہوا تھا' جیسے پھانسی پانے جا رہا ہوں۔''

''آپ کو تو بیس بائیس سال نوکری کرتے ہوئے ہوں گی۔''

''پورے پچیس سال ہو گئے' صاحب بیس سال تو بیوی کے انتقال کو ہو گئے۔''

''آپ نے دوسری شادی کیوں نہیں کی' تب تو آپ کی عمر پچاس سے زیادہ نہ

ہو گی۔''

رمیش نے حسرت ناک تبسم کے ساتھ کہا۔ ''محلوں کا سکھ بھوگنے کے بعد جھونپڑا کسے اچھا لگتا ہے بھائی۔ محبت سے روح کو دائمی سکون ہو جاتا ہے۔ تم میری حالت سے واقف ہو۔ اب تو بوڑھا ہوا لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ اس فرصت نصیب زندگی میں کبھی میری آنکھوں نے کسی حسینہ کی طرف نگاہ نہیں ڈالی۔ کئی بار شادی کے لیے لوگوں نے گھیرا بھی لیکن کبھی خواہش ہی نہ ہوئی۔ اس محبت کی شیریں یادگاروں میں میرے لیے مسرت کے سارے سامان موجود ہیں۔''

یوں باتیں کرتے ہوئے دونوں آدمی دفتر پہنچ گئے۔

(10)

رما دفتر سے گھر پہنچا تو چار بج گئے تھے۔ وہ دفتر ہی میں تھا کہ آسمان پر بادل گھر آئے۔ پانی آیا ہی چاہتا تھا' پر رما کو گھر پہنچنے کی ایسی جلدی تھی کہ وہاں رک نہ سکا۔ احاطہ کے باہر بھی نکلنے نہ پایا تھا کہ زور کی بارش ہونے لگی۔ اساڑھ کا پہلا پانی تھا۔ ایک لمحہ میں وہ لت پت ہو گیا۔ پھر بھی وہ کہیں ٹھہرا نہیں۔ کامیابی کی خوشخبری کی مسرت میں اس ڈونگرے کی کیا پروا کر سکتا تھا۔ اس نے دل میں حساب لگا لیا تھا کہ کتنی ماہوار بچت ہو جانے سے وہ جالپا کے لیے جلد سے جلد چندن ہار بنوا سکے گا۔ اگر پچاس ساٹھ روپے مہینہ بھی بچ جائیں تو پانچ سال میں جالپا زیوروں سے لد جائے گی۔ گھر پہنچ کر اس نے کپڑے بھی نہ اتارے۔ لت پت جالپا کے کمرے میں پہنچ گیا۔

جالپا نے پوچھا۔ ''یہ بھیگ کہاں گئے اور رات کہاں غائب تھے؟''

رمانا تھ نے کپڑے اتارتے ہوئے کہا۔ ''نوکری کی فکر میں پڑا ہوا تھا۔ اس وقت دفتر سے چلا آتا ہوں۔ مجھے ایک جگہ مل گئی ہے۔''

جالپا نے کھل کر پوچھا۔ ''سچ! کتنے کی جگہ ہے؟''

رما کو صحیح تعداد بتانے میں تامل ہوا۔ تیس کی نوکری بتلانا کسر شان تھی۔ بولا ''ابھی تو چالیس ملیں گے مگر ترقی جلد ہوگی۔ جگہ آمدنی کی ہے۔''

جالپا نے کسی بڑے عہدے کی امید کر رکھی تھی۔ بولی۔ ''چالیس میں کیا ہوگا؟ بھلا ساٹھ ستر تو ہوتے۔''

رما ''مل تو سکتی تھی سو روپیہ کی بھی۔ مگر یہاں رعب ہے اور بالائی آمدنی کی گنجائش بھی کافی ہے۔''

جالپا نے سادگی سے پوچھا۔ ''تو تم رشوت لوگے' غریبوں کا گلا کاٹو گے؟''

رما نے ہنس کر کہا۔ ''نہیں جی! وہ جگہ ایسی نہیں ہے کہ غریبوں کا گلا کاٹنا پڑے بڑے بڑے مہاجنوں سے سابقہ ہوگا اور وہ خوشی سے دیں گے۔''

جالپا کو اطمینان ہو گیا۔ بولی۔ ''تب ٹھیک ہے غریبوں کا کام یوں ہی کر دینا۔''

''ہاں ایسا تو کروں گا ہی!''

''جا کر اماں جی سے تو کہہ آؤ۔ مجھے تو سب سے بڑی خوشی یہی ہے کہ اب معلوم ہوگا۔ یہاں میں بھی کچھ ہوں۔''

''ہاں جاتا ہوں۔ مگر ان سے تو میں بیس ہی بتلاؤں گا۔''

جالپا خوش ہو کر بولی۔ ''اور کیا؟ اوراوپر کی آمدنی کا تو ذکر کرنا فضول ہے۔''

---------------اختتام ۳۳۶---------------

غبن صفحہ نمبر 337 سے ---------- از شہزاد رضا

اتنے میں ڈاکیے نے پکارا۔ رما نے دروازے پر جا کر دیکھا تو ان کے نام کا ایک پارسل تھا۔

منشی دین دیال نے بھیجا تھا۔ لے کر خوش خوش گھر میں آئے اور چٹ پٹ قینچی نکال کر پارسل کھولا۔ اس میں ایک چھوٹی سی ڈبیا میں ایک چندن ہار رکھا ہوا تھا۔ رما نے خوش ہو کر کہا۔ ''یہ تو اچھا شگون ہے۔''

جالپا نے کچھ رنجیدہ ہو کر کہا۔ ''میری بلا سے! میں ان کی عنایت کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہوں۔ آج اتنے دنوں کے بعد انہیں یہ خیال آیا ہے، ان کی چیز انہیں مبارک ہو۔ میں کسی کا احسان لینا نہیں چاہتی۔ تم خیریت سے رہو گے تو مجھے بہت زیور ملیں گے۔''

رما نے تسکین دے کہا۔ ''میرے رائے تو یہ ہے کہ اس وقت ہار رکھ لو۔ سوچو انہیں کتنا رنج ہو گا۔ اگر رخصتی کے وقت نہ دیا تو اچھا ہی ہوا، ورنہ یہ بھی غائب ہو جاتا۔''

''میں اسے لوں گی نہیں، یہ طے ہے!''

''آخر کیوں؟''

جالپا نے حسرتناک لہجہ میں کہا۔ ''اس لیے کہ اماں نے اسے خوشی سے نہیں دیا ہو گا۔ بہت ممکن ہے کہ اسے بھیجتے وقت وہ روئی ہوں اور اس میں تو کوئی شک نہیں

کہ اسے واپس پا کر انہیں سچی خوشی ہوگی۔ دینے والے کا دل دیکھا جاتا ہے، خوشی سے اگر وہ مجھے ایک چھلا بھی دیں تو دونوں ہاتھ بڑھا کر لے لوں۔ جب دل پر جبر کر کے دنیا کی لاج سے دیا تو کیا دیا۔ میں کسی کی خیرات نہ لوں گی، چاہے وہ اپنی اماں ہی کیوں نہ ہو۔''

جالپا کو ماں کی طرف سے اتنا بدظن دیکھ کر رما اور کچھ نہ کہہ سکا۔ بدگمانی، دلیل اور ثبوت کی پروا نہیں کرتی۔ اس نے ہار اٹھالیا اور بولا۔''ذرا لوگوں کو تو دکھادوں۔ کم سے کم ان سے پوچھ تو لینا چاہیے۔''

جالپا نے ہار اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور بولی۔''میں کسی سے کچھ نہیں پوچھنا چاہتی۔ میری مرضی ہے لوں یا واپس کر دوں۔ کسی سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟''

اس نے ہار کو اسی ڈبیا میں رکھ دیا اور اس پر کپڑا لپیٹ کر سینے لگی۔ رما نے ایک بار پھر ڈرتے ڈرتے کہا۔''ایسی جلدی کیا ہے؟ دس پانچ دن میں لوٹا دینا۔ ان لوگوں کی بھی خاطر ہو جائے گی۔''

جالپا نے بے رخی کے ساتھ کہا۔''جب تک میں اسے لوٹا نہ دوں گی، مجھے چین نہ آئے گا۔''

ایک لمحہ میں پارسل تیار ہو گیا اور رما اسے لیکر ایک متفکرانہ انداز سے نیچے اترا۔ گھڑی میں چار بجے تھے۔

(11)

منشی دیانا تھ کو جب رما کے نوکر ہونے کی خبر ملی تو بہت خوش ہوئے۔ شادی

ہوتے ہی وہ اتنی جلدی سنبھل جائے گا، اس کی انہیں امید نہ تھی۔ بولے جگہ تو اچھی ہے۔ ایمان داری سے کام کرو گے تو اچھی جگہ پر پہنچ جاؤ گے۔ میری یہی نصیحت ہے کہ پرائے پیسے کو حرام سمجھنا۔

رما کے جی میں آیا کہ صاف کہہ دے کہ آپ اپنی نصیحت اپنے لیے ہی رکھیں۔ یہ میرے موافق نہیں ہے۔ مگر اتنا بے حیا نہ تھا۔

دیاناتھ نے پھر پوچھا۔ ''یہ جگہ تو تیس روپے کی تھی۔ تمہیں بیس ہی کیوں ملے؟''

رماناتھ نے بات بنائی۔ نئے آدمی کو پوری تنخواہ کیسے دیتے۔ شاید سال چھ مہینے میں ترقی ہو جائے۔

رما نے دوسرے دن نیا سوٹ بنوایا اور فیشن کی کتنی ہی چیزیں خریدیں۔

سسرال سے ملے ہوئے روپے کچھ بچ رہے تھے، کچھ دوستوں سے قرض لیے۔ وہ صاحبی ٹھاٹھ بنا کر سارے دفتر پر رعب جما دیتا تھا۔ اچھی آمدنی جبھی ہو سکتی ہے، جب اچھا ٹھاٹھ ہو۔ سڑک کے چوکیدار کو یکے والے ایک پیسہ دے کر ٹال دیتے ہیں، اس کی جگہ سارجنٹ ہو تو کسی کی ہمت بھی نہ پڑے گی کہ اسے ایک پیسہ دکھائے۔ پھٹے حال بھکاری کے لیے ایک چٹکی کافی ہے، لیکن گیروے ریشم پہنے ہوئے باباجی کو شرماتے شرماتے بھی ایک روپیہ ہی دینا پڑتا ہے۔

تیسرے دن رما کوٹ پتلون پہن کر نکلا۔ تو اس کی شان ہی کچھ اور ہو گئی۔ چپڑاسیوں نے جھک جھک کر سلام کیے۔ رمیش بابو سے مل کر جب وہ اپنے کام کا چارج لینے آیا تو دیکھا ایک برآمدے میں پھٹی ہوئی میلی دری پر ایک میاں

صاحب صندوق پر رجسٹر پھیلائے بیٹھے تھے اور بیوپاری لوگ انہیں چاروں طرف سے گھیرے کھڑے ہیں۔ سامنے ٹھیلے اور گاڑیوں کے بازار لگے ہوئے ہیں۔ سبھی اپنے اپنے کام کی جلدی مچا رہے ہیں۔

سارا کام انتہا درجے کی بے قاعدگی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اس پھٹی ہوئی دری پر بیٹھنا رما کو اپنی شان کے خلاف معلوم ہوا۔ وہ سیدھا رمیش کے پاس جا کر بولا۔ ''کیا آپ مجھے بھی ایسی میلی دری پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ ایک اچھی سی میز اور کئی کرسیاں بھجوا دیجیے۔'' رمیش بابو نے مسکرا کر میز اور کرسیاں بھجوا دیں۔ رما تمکنت شان سے کرسی پر بیٹھا۔ بوڑھے منشی جی اس کی رعونت پر دل میں ہنس رہے تھے۔ سمجھ گئے ابھی نیا جوش ہے، نئی امنگ ہے۔ چارج دے دیا۔ چارج میں تھا ہی کیا۔ صرف ایک رجسٹر اور آج کی آمدنی کا حساب محصول کے نرخ کا گوشوارہ موجود تھا۔ بوڑھے منشی جی نے اگرچہ خود استعفٰی دیا تھا، پر اس وقت یہاں سے جاتے ہوئے رنج ہو رہا تھا۔ اس جگہ وہ تیس سال سے برابر چلے آ رہے تھے۔ اسی جگہ کی بدولت انہوں نے دولت اور نام دونوں ہی کمایا۔ اسے چھوڑتے ہوئے کیوں نہ رنج ہوتا۔ چارج دے کر جب وہ رخصت ہونے لگے تو رمانا تھ زینے کے نیچے تک گیا، خان صاحب اس کے اخلاق سے خوش ہو گئے اور بولے، ہر ایک بلٹی پر ایک آنہ بندھا ہوا۔ کھلا ہوا راز ہے۔ لوگ شوق سے دیتے ہیں۔ آپ کو خدا نے توفیق دی ہے، مگر رسم نہ بگاڑیئے۔ ایک بار کوئی رسم ٹوٹ جاتی ہے تو اس کا بندھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک ایک آنہ میں آدھا چپڑاسیوں کا حق ہے۔ آدھا آپ کا۔ جو بڑے بابو پہلے تھے، وہ پچیس روپے ماہوار لیتے تھے۔ مگر یہ تو بالکل بے لوث

ہیں۔‘‘

رما نے بے دلی کے ساتھ کہا۔ ’’مجھے تو یہ گندہ معلوم ہوتا ہے۔ میں صفائی کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

بوڑھے میاں نے ہنس کر کہا۔ ’’ابھی گندہ معلوم ہوتا ہے، لیکن پھر اسی میں لطف آئے گا۔‘‘

خان صاحب کو رخصت کر کے رما اپنی کرسی پر آ بیٹھا اور ایک چپڑاسی سے بولا۔ ’’ان لوگوں سے کہو کہ برآمدے کے نیچے چلے جائیں اور ایک ایک کر کے نمبر وار آویں۔ ایک کاغذ پر سب کا نام نمبر وار لکھ لیا کرو۔ جو پہلے آئے اس کا کام پہلے ہونا چاہیے۔ مجھے یہ لپڑ دھوں دھوں پسند نہیں کہ سب سے پیچھے والے شور مچا کر پہلے آ جائیں اور پہلے والے کھڑے منہ تاکتے رہیں۔‘‘

کئی بیوپاریوں نے کہا۔ ’’ہاں بابو جی، یہ انتظام ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔‘‘

یہ حکم رما کا رعب جمانے کے لیے کافی تھا۔ روزگاریوں کے حلقے میں آج ہی اس باقاعدگی اور ضابطے کی تعریف ہونے لگی ہے۔ کسی بڑے کالج کے پروفیسر کو اتنی شہرت عمر بھر میں نہ ملتی۔

دو چار دن کے تجربے سے رما کو سارے داؤ گھات معلوم ہو گئے۔ ایسی ایسی گھاتیں سوجھتی گئیں، جو خان صاحب کو خواب میں بھی نہ سوجھی تھیں۔ مال کے وزن، شمار اور تشخیص میں اتنی دھاندلی تھی، جس کی کوئی حد نہیں۔ جب اس دھاندلی سے بیوپاریوں کو سینکڑوں کی بچت ہو جاتی ہے تو رما بلٹی پر ایک ایک آنہ لے کر کیوں قناعت کرے۔ ذرا سختی کا برتاؤ کر کے وہ دولت اور نیک نامی دونوں ہی

حاصل کرسکتا ہے، پھر وہ اس سنہری موقع کو کیوں چھوڑ دے۔

رما کی آمدنی تیزی سے بڑھنے لگی۔ آمدنی کے ساتھ وقار بھی بڑھا کہ سوکھی قلم گھسنے والے دفتر کے بابوؤں کو جب سگریٹ، پان، چائے یا چاٹ کی خواہش ہوتی تو رما کے پاس چلے آتے۔ بہتی گنگا تھی، جس میں سبھی ہاتھ دھو سکتے تھے۔ سارے دفتر میں رما کی تعریف ہونے لگی۔ پیسے کو تو وہ کچھ سمجھتا ہی نہیں، کیا دل ہے کہ واہ! اور جیسا دل ہے ویسی زبان بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے رگ رگ میں شرافت بھری ہوئی ہے۔ بابوؤں کا جب یہ حال تھا تو چپڑاسیوں اور چوکیداروں کا کیا پوچھنا؟ سب کے سب رما کے بن داموں غلام تھے، ان غریبوں کا وقار بھی بڑھا، جہاں گاڑی بان تک پھنکار دیا کرتے تھے، وہاں اب اچھے اچھوں کی گردن پکڑ کر نیچے دھکیل دیتے تھے، رما تا تھ کا سکہ بیٹھ گیا۔

مگر جالپا کی آرزوؤں میں سے ابھی ایک بھی پوری نہ ہوئی۔ ناگ پنچمی کے دن محلے کی کئی لڑکیاں جالپا کے ساتھ کجلی کھیلنے آئیں۔ مگر جالپا اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی۔ بھادوں میں جنم اشٹمی کی تقریب آئی۔ پڑوس ہی میں ایک سیٹھ جی رہتے تھے۔ ان کے یہاں بڑے دھوم دھام سے جشن منایا جاتا تھا۔ وہاں سے ساس اور بہو کا بلاوا آیا۔ جاگیشری گئی، جالپا نے جانے سے انکار کر دیا۔ ان تین مہینوں میں اس نے رما سے ایک بار بھی زیوروں کا چرچا نہ کیا۔ اس گوشۂ تنہائی میں وہ اس فہرست کو دیکھا کرتی، جو رما ایک دن کہیں سے اٹھا لایا تھا۔ اس میں طرح طرح کے نفیس زیوروں کے نمونے بنے ہوئے تھے، رما کو دیکھتے ہی وہ فہرست چھپا لیتی تھی۔ اپنی گرویدگی کا پردہ ڈھکا رکھنا چاہتی تھی۔

رما آدھی رات کے بعد لوٹا تو دیکھا جالپا کمرے کے دروازے پر کھڑی ہے۔ ہمدردانہ انداز سے بولا۔ ''تم گئی کیوں نہیں؟ لوگ انتظار کر رہے تھے۔ بڑا اچھا گانا ہو رہا تھا۔''

جالپا نے بے اعتنائی سے کہا۔ ''تم تو سن آئے۔ میں نہ گئی تو کیا ہوا۔ وہاں جاتی تو کس کے منہ میں کالک لگتی؟''

رما شرمندہ ہو کر بولا۔ '' کالک لگنے کی کوئی بات نہ تھی۔ سبھی جانتے ہیں کہ چوری ہوگئی ہے اور اس زمانے میں دو چار ہزار روپے کی چیزیں بنوا لینا منہ کا نوالہ نہیں ہے۔''

چوری کا لفظ زبان پر لاتے ہی رما کا کلیجہ دھڑک اٹھا۔ جالپا شوہر کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئی۔ بولنے سے بات بڑھ جانے کا اندیشہ تھا، لیکن رما کو اس کی نگاہ سے ایسا مترشح ہوا گویا اسے چوری کا راز معلوم ہے اور محض حجاب کے باعث اسے زبان پر نہیں لاتی۔ انہیں اس خواب کی بھی یاد آئی، جو جالپا نے اس رات کو دیکھا تھا۔ وہ نگاہ تیر کی طرح اس کے دل میں چبھنے لگی۔ اسے پھر خیال آیا، شاید مجھے دھوکا ہوا۔ اس کی نگاہ میں غصہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، مگر یہ چپ کیوں ہے؟ بولتی کیوں نہیں؟ اس کی خاموشی غضب تھی۔ اپنا شبہ رفع کرنے اور جالپا کے دل کی تھاہ لینے کے لیے گویا اس نے ڈبکی ماری۔ یہ کون جانتا تھا کہ اس کے گھر میں قدم رکھتے ہی یہ مصیبت تمہاری پیشوائی کرے گی۔

جالپا آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ''تو میں تم سے زیوروں کا تقاضا نہیں کرتی۔ تقدیر کے نوشتے کو انسان ٹال سکتا، تو رونا ہی کس بات کا تھا۔ جن عورتوں کو

زیور میسر نہیں ہوتے، کیا ان کے دن نہیں کٹتے؟''

اس جواب نے رما کا شبہ تو رفع کر دیا تھا، مگر اس میں جو نالۂ درد چھپا ہوا تھا، اس سے چھپا نہ رہا۔ ان تین مہینوں میں بہت احتیاط کرنے پر بھی وہ سو روپیہ سے زیادہ جمع نہ کر سکا تھا۔ بابوؤں کی خاطر اور تواضع میں اسے بہت بل کھانا پڑتا تھا، مگر بغیر کھلائے پلائے کام بھی تو نہ چل سکتا تھا۔ کبھی اس کے دشمن ہو جاتے اور اسے اکھاڑنے کی گھاتیں سوچنے لگتے۔ مفت کی دولت تنہا ہضم نہیں ہوتی۔ یہ وہ خوب جانتا تھا۔ ہاں وہ خود ایک پیسہ بھی فضول خرچ نہ کرتا۔ ہوشیار بیوپاری کی طرح وہ کچھ خرچ کرتا تھا، وہ صرف کمانے کے لیے۔ اسے تسلی دے کر بولا۔

''ایشور نے چاہا تو ایک آدھ چیز بن ہی جائے گی۔''

جالپا نے صابرانہ انداز سے کہا۔ ''میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں، جو زیوروں پر جان دیتی ہوں۔ اسی طرح کسی کے گھر آتے جاتے شرم آتی ہی ہے۔''

جالپا کے ایک ایک لفظ سے حسرت اور مایوسی ٹپک رہی تھی۔ اس کی روحانی خلش کا باعث کون تھا۔ جالپا نے اگر لحاظ کے مارے زیوروں کا ذکر نہ کیا تو رما اس کے آنسو پونچھنے کی اس دلجوئی کرنے کے لیے کیا خاموشی کے بجائے کوئی تدبیر نہ کی تھی۔ محلے میں روز ہی ایک نہ ایک تقریب آتی رہتی ہے، روز ہی پاس پڑوس کی عورتیں ملنے آتی ہیں۔ بیچاری جالپا کب تک اس طرح اپنے دل پر جبر کرتی رہے گی، ہنسنے بولنے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ کون قیدیوں کی طرح اکیلے پڑا رہنا پسند کرتا ہے۔

اس نے سوچا کہ کسی تدبیر سے زیور ادھار نہیں لیے جا سکتے۔ کئی بڑے بڑے صرافوں سے اس کا دوستانہ ہو گیا تھا، لیکن مشکل یہی تھی کہ ان سے کہے کون۔ ممکن ہے کہ وہ انکار ہی کر دیں یا کوئی وعدے پر روپے نہ ادا ہوئے تو شرمندہ ہونا پڑے گا۔ ابھی کچھ دن اور صبر کرنا چاہیے۔

دفعتاً اسے خیال آیا دیکھوں اس معاملے میں جالپا کی کیا رائے ہے۔ اگر جالپا کو خواہش ہو تو وہ کسی صراف سے سلسلۂ جنبانی کرے گا اور ذلت اور شرمندگی کو خوشی سے برداشت کرے گا۔ بولا۔ ''تم سے ایک صلاح کرنا چاہتا ہوں۔''

جالپا کو نیند آ رہی تھی۔ آنکھیں بند کیے ہوئے بولی۔ ''اب سونے دو بھئی سویرے اٹھنا ہے۔''

رما نے پوچھا۔ ''اگر تمہاری رائے ہو تو کسی صراف سے وعدے پر چیزیں بنوا لاؤں۔ اس میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔''

جالپا کی آنکھیں کھل گئیں۔ کتنا بے رحمانہ سوال تھا۔ کسی مہمان سے پوچھنا کہ کہیے تو آپ کے لیے کھانا لاؤں۔ اس کا تو یہی مطلب ہے کہ ہم مہمان کو کھلانا نہیں چاہتے۔ رما کو لازم تھا کہ چیزیں لا کر جالپا کے سامنے رکھ دیتا۔ اس کے بار بار پوچھنے پر ہی اسے یہی کہنا چاہیے تھا کہ نقد لایا ہوں۔ تب وہ البتہ خوش ہوتی۔ اس معاملے میں اس کی صلاح لینا اس کے زخم پر نمک چھڑکنا تھا۔ جالپا نے رما کی طرف ناہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''میں تو زیوروں کے لیے اتنی بے قرار نہیں ہوں۔''

رما نے کہا۔ ''نہیں یہ بات نہیں۔ آخر اس میں کیا ہرج ہے کہ کسی صراف سے

سودا کرلیا جائے۔ روپے رفتہ رفتہ چکا دیئے جائیں گے۔''

جالپا نے بغیر کسی توقف کے جواب دیا۔ ''نہیں میرے لیے قرض لینے کی ضرورت نہیں۔ میں بیسوا نہیں ہوں کہ تمہیں نوچ کھسوٹ کر اپنا راستہ لوں۔ مجھے تمہارے ساتھ جینا اور مرنا ہے۔ اگر مجھے ساری عمر زیوروں کے بغیر رہنا پڑے، تو بھی میں قرض لینے کو نہ کہوں گی۔ عورتوں کو گہنوں کی اتنی ہوس نہیں ہوتی، گھر کے آدمیوں کو مصیبت میں ڈال کر زیور پہننے والیاں دوسری ہوں گی، لیکن تم نے تو پہلے کہا تھا جگہ بڑی آمدنی کی ہے، مجھے تو کوئی خاص بچت دکھائی نہیں دیتی۔''

رما نے صفائی دی۔ ''بچت تو ضرور ہوتی اور اچھی ہوتی، لیکن جب اہلکاروں کے مارے بچنے بھی پائے۔ سب کے سب شیطان کی طرح سر پر سوار رہتے ہیں۔''

''تو ابھی کون سی جلدی ہے۔ بنتے رہیں گے آہستہ آہستہ!''

''خیر تمہاری صلاح ہے تو ابھی خاموش رہتا ہوں۔ میں سے پہلے کنگن بنواؤں گا۔''

''تمہارے پاس ابھی اتنے روپے کہاں ہوں گے۔''

''اس کی فکر میں کرلوں گا، تمہیں کیسا کنگن پسند ہے؟''

جالپا اپنے مصنوعی استغنا کو نہ نبھا سکی۔ الماری میں سے زیوروں کی فہرست نکال کر رما کو دکھانے لگی۔ اس وقت وہ اتنی سرگرم تھی گویا سونا آ کر رکھا ہوا ہے۔ سنار بیٹھا ہوا ہے، صرف وضع کا پسند کرنا باقی ہے۔ اس نے فہرست کے دو ڈیزائن پسند کیے اور دونوں نہایت خوشنما، مگر رما ان کی قیمت دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ ایک

ایک ہزار کا تھا، دوسرا آٹھ سو کا۔

رمانے ٹال کر کہا۔ ''ایسی چیزیں تو یہاں بن بھی نہ سکیں۔ مگر کل میں ذرا صرافے کی سیر کروں گا۔''

جالپا نے فہرست کو بند کر کے حسرتناک لہجہ میں کہا۔ ''تمہارے پاس نہ جانے کبھی روپے ہوں گے یا نہیں اونہہ، بنیں گے نہیں۔ کون کوئی گہنے کے بغیر مرا جاتا ہے۔''

رما ناتھ کو آج اس ادھیڑ بن میں بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ یہ جڑاؤ کنگن اس کی گوری گوری کلائیوں پر کتنے بھلے معلوم ہوں گے۔ یہ دل آویز خواب دیکھتے دیکھتے نہ جانے کب نیند آ گئی۔

(12)

دوسرے دن سویرے ہی رما نے رمیش بابو کے گھر کا راستہ لیا۔ ان کے یہاں جنم اشٹمی کی جھانکی ہوتی تھی۔ انہیں خود تو اس سے کوئی شوق نہ تھا، مگر ان کی بیوی یہ جشن مناتی تھی۔ اس کی یادگار میں وہ اب تک رسم ادا کرتے جاتے تھے۔ رما کو دیکھ کر بولے۔ ''آؤ جی رات کیوں نہیں آئے۔ مگر یہاں غریبوں کے گھر کیوں آتے۔ سیٹھ جی کے یہاں تو خوب بہار ہوگی۔''

رما: ''ایسی سجاوٹ تو نہ تھی۔ ہاں گانے کا انتظام اچھا تھا۔ کئی کتھک اور کئی طوائفیں بھی تھیں۔''

رمیش: ''سیٹھ جی نے تو وعدہ کیا تھا کہ طوائفیں نہ آنے پائیں گی، مگر اس کی پروا نہ کی۔ ایک تو طوائفوں کا ناچ یوں ہی برا۔ اس پر ٹھاکر دوارے میں نہ جانے

ان گدھوں کو کب عقل آئے گی۔‘‘

رما: ’’طوائفیں نہ ہوں تو جھانکی کو دیکھنے جائے ہی کون۔ سبھی تو آپ کی طرح زاہد نہیں ہیں۔‘‘

رمیش: ’’خیر فرصت ہو تو آؤ ایک آدھ بازی ہو جائے؟‘‘

رما: ’’اور آیا کس لیے ہوں۔ مگر آج آپ کو میرے ساتھ صرافے تک چلنا پڑے گا۔‘‘

رمیش: ’’چلنے کو چلا چلوں گا۔ مگر اس معاملے میں میں بالکل کورا ہوں۔ نہ کوئی چیز بنوائی، نہ خریدی۔ تمہیں کچھ لینا ہے؟‘‘

رما: ’’لینا دینا کیا ہے، ذرا بھاؤ تاؤ دیکھنا ہے؟‘‘

رمیش: ’’معلوم ہوتا ہے گھر میں پھٹکار پڑی ہے؟‘‘

رما: ’’وہ تو زیوروں کا نام تک نہیں لیتی۔ لیکن اپنا فرض تو کچھ ہے؟‘‘

رمیش: ’’شاید کچھ روپے جمع کر لیے۔‘‘

رما: ’’روپے کس کے پاس ہیں، وعدے پر لوں گا۔‘‘

رمیش: ’’بھائی اس خبط میں نہ پڑو۔ جب تک روپے ہاتھ میں نہ ہوں۔ بازار کی طرف جاؤ ہی مت۔ زیوروں سے تو بڈھے نئی بیبیوں کا دل خوش کرتے ہیں۔ جوانوں کے لیے بہت سے لٹکے ہیں۔‘‘

رما: ’’میں دو تین مہینے میں سب روپے ادا کر دوں گا۔ اگر اس کا یقین نہ ہوتا تو میں ذکر ہی نہ کرتا۔‘‘

رمیش: ’’تو دو تین مہینے اور کیوں صبر نہیں کر جاتے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری

آمدنی اچھی ہے، لیکن آئندہ کے بھروسے پر اور جو کام چاہے کرو، قرض کبھی مت لو۔ زیوروں کا قرض اس غریب ملک میں نہ جانے کیسے پھیل گیا۔ جنہیں روٹیوں کا بھی ٹھکانا نہیں۔ وہ بھی زیوروں کے پیچھے جان دیتے ہیں۔ ہر سال اربوں روپے سونا چاندی خریدنے میں صرف ہو جاتے ہیں۔ دنیا کے اور کسی ملک میں زیوروں کا اتنا رواج نہیں۔ ترقی یافتہ ملکوں میں دولت تجارت میں صرف ہوتی ہے، جس سے لوگوں کی پرورش ہوتی ہے اور دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں دولت آرائش میں خرچ ہوتی ہے۔ بس یہی سمجھ لو کہ جس ملک میں جتنی ہی زیادہ جہالت پیدا ہوتی ہے، اتنا ہی زیوروں کا رواج ہوتا ہے۔ یہاں تو خیر ناک کان چھدا کر ہی رہ جاتے ہیں، مگر بعض ایسے ملک بھی ہیں، جہاں ہونٹ چھدوائے جاتے ہیں اور اس میں زیور پہنتے ہیں۔''

رما: ''وہ کون سا ملک ہے۔''

رمیش: ''اس وقت تو ٹھیک یاد نہیں آتا شاید افریقہ ہوا۔ تمہیں یہ سن کر تعجب ہوتا ہے، لیکن دوسرے ملک والوں کے لیے ناک کان چھیدنا کچھ کم تعجب کی بات نہ ہوگی۔ برا مرض ہے اور وہ دولت، جو کھانے پینے میں صرف ہونی چاہیے، بال بچوں کا پیٹ کاٹ کر زیوروں کی نذر کر دی جاتی ہے۔ بچوں کو دودھ نہ ملے نہ سہی، گھی کی بو تک ان کی ناک میں نہ پہنچے نہ سہی۔ میووں اور پھلوں کے درشن انہیں نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر بیوی گہنے ضرور پہنے گی اور میاں گہنے ضرور بنوائیں گے۔''

رما: ''میں تو سمجھتا ہوں ایسا کوئی بھی ملک نہیں، جہاں عورتیں زیور نہ پہنتی

ہوں۔''

رمیش بابو اس بحث میں شطرنج بھول گئے۔ چھٹی کا دن تھا ہی، دو چار ملنے والے اور آ گئے، رما چپکے سے کھسک آیا۔ اس بحث میں ایک بات ایسی تھی، جو اس کے دل میں بیٹھ گئی۔ اب وہ قرض سے گھبرنے لگا۔ صرافے تک گیا ضرور مگر کسی دکان پر جانے کی ہمت نہ پڑی۔

وہ گھر پہنچا تو نو بج گئے تھے۔ دیاناتھ نے اس کو دیکھا تو پوچھا۔ ''آج سویرے کہاں چلے گئے تھے؟''

رما: ''ذرا بڑے بابو سے ملنے گیا تھا۔''

دیاناتھ: ''گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے کتب خانے کیوں نہیں چلے جایا کرتے۔ ابھی تمہارے پڑھنے لکھنے کی عمر ہے۔ امتحان نہ سہی اپنی لیاقت تو بڑھا سکتے ہو۔ ایک سیدھا سا خط لکھنا پڑ جاتا ہے تو بغلیں جھانکنے لگتے ہو۔ اصلی تعلیم مدرسہ چھوڑنے کے بعد ہی شروع ہوتی ہے اور وہی زندگی میں ہمارے کام آتی ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں کچھ ایسی باتیں سنی ہیں، جن سے مجھے رنج ہوا اور تمہیں وہ سمجھا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ میرے گھر میں حرام کی ایک کوڑی بھی آئے۔''

رما نے مصنوعی غصہ دکھا کر کہا۔ ''آپ سے کس نے یہ بات کہی۔ میں اس کی مونچھیں اکھاڑ لوں گا۔''

دیاناتھ: ''کسی نے بھی کہی ہو۔ اس سے تمہیں کوئی مطلب نہیں، لیکن بات سچ ہے یا جھوٹ۔ میں اتنا ہی پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''بالکل جھوٹ۔''

''بالکل جھوٹ؟''

''جی ہاں بالکل جھوٹ۔''

''تم دستوری نہیں لیتے؟''

''دستوری رشوت نہیں ہے۔ سبھی لیتے ہیں اور اعلانیہ لیتے ہیں۔ لوگ بغیر مانگے دیتے ہیں۔ میں کسی سے مانگنے نہیں جاتا۔''

''سبھی اعلانیہ لیتے ہیں اور لوگ بغیر مانگے دیتے ہیں۔ اس سے تو یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رشوت اچھی چیز ہے۔''

''دستوری بند کر دینا میرے قابو کی بات نہیں۔ میں خود نہ لوں، مگر چپڑاسی اور محرر کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ آٹھ آٹھ نو نو روپے پانے والے نوکر اگر نہ لیں تو ان کا کام ہی نہیں چل سکتا۔''

دیاناتھ: ''میں نے تمہیں سمجھا دیا۔ ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے۔''

یہ کہتے ہوئے دیاناتھ دفتر چلے گئے۔ رما کے جی میں، آیا صاف کہہ دے۔ آپ نے بے لوث بن کر زندگی میں کیا کر لیا کہ مجھے تعلیم دے رہے ہیں۔ ہمیشہ پیسے پیسے کو محتاج رہے۔ لڑکوں کو پڑھا تک نہیں سکے۔ یہ دیانتداری اس وقت اچھی معلوم ہوتی ہے جبکہ نیت بھی صاف رہتی اور زندگی بھی آرام سے گزرتی۔

رما گھر میں گیا تو ماں نے پوچھا۔ ''تمہارے بابو جی کس بات پر بگڑ رہے تھے؟''

رما: ''مجھے تعلیم دے رہے تھے کہ دستوری مت لیا کرو۔''

جا گیشری: ''تم نے کہا نہیں۔ آپ نے بڑی ایمانداری کی تو کون سے جھنڈے گاڑ دیئے، ساری زندگی پیٹ پالتے رہے۔''

رما: ''کہنا تو چاہتا تھا، مگر چڑ جاتے۔ آپ کو لینے کا شعور تو ہے نہیں، جب دیکھا کہ یہاں دال نہیں گلتی تو بھگت بن گئے۔ بیوپاریوں سے روپے نکالنے کے لیے عقل چاہیے، جہاں کسی نے بھگت پن کیا اور میں سمجھ گیا کہ بدھو ہے لینے کی تمیز نہیں۔ کیا کرے۔ بیچارہ کسی طرح آنسو تو پونچھتے۔''

جا گیشری: ''بس بس یہی بات ہے بیٹا جسے لینا آئے گا، وہ ضرور دے گا۔ انہیں تو بس گھر میں قانون بگھارنا آتا ہے۔''

رما دفتر جاتے وقت اوپر کپڑے پہننے گیا تو جالپا نے اسے تین لفافے ڈاک میں چھوڑنے کے لیے دیئے۔ اس وقت اس نے تینوں لفافے جیب میں ڈال لیے، لیکن راستے میں انہیں کھول کر چٹھیاں پڑھنے لگا۔ خط کیا تھے؟ مصیبت اور درد کی داستان تھی، جو اس نے اپنی سہیلیوں کو سنائی تھی۔

رما نے تینوں چٹھیاں جیب میں رکھ لیں۔ ڈاکخانے کے سامنے سے گزر گیا، پر اس نے انہیں چھوڑا نہیں۔ جالپا ابھی تک یہی سمجھتی ہے کہ میں اسے دھوکا دے رہا ہوں۔ اسے کیسے یقین دلاؤں۔ اگر اپنا بس ہوتا تو اسی وقت زیوروں کے ٹوکرے بھر بھر کر جالپا کے سامنے رکھ دیتا۔ یا اسے کسی بڑے صراف کی دکان پر لے جا کر کہتا۔ تمہیں جو جو چیزیں لینی ہوں لے لو۔ رما کو آج اس درد کا صحیح اندازہ ہوا، جو جالپا کے دل کو بے چین کر رہا تھا۔ ایسی حالت میں رما کو وعدے پر زیور لانے میں تامل کرنے کی مطلق گنجائش نہ تھی۔

دفتر پہنچا،تو برآمدے میں مال تولا جارہا تھا۔میز پر روپے پیسے رکھے جارہے تھے اور رما فکر میں ڈوبا بیٹھا تھا۔کس سے صلاح لے،اسے آج اپنے اوپر غصہ آرہا تھا کہ اس نے شادی ہی کیوں کی۔

جب وہ گھر کی حالت سے واقف تھا تو اس نے شادی سے انکار کیوں نہ کر دیا۔آج اس کا جی مطلق کام میں نہ لگا۔معین وقت سے پہلے اٹھ کر گھر چلا گیا۔

جالپا نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔"میری چٹھیاں چھوڑ تو نہیں دیں؟"

رما نے بہانہ کیا۔"مطلق یاد نہ آئی۔جیب میں پڑی رہ گئیں۔"

جالپا:"یہ بہت اچھا ہوا۔لاؤ مجھے دے دو۔اب نہ بھیجوں گی۔"

رما:"کیوں؟کل بھیج دوں گا۔"

جالپا:"نہیں،اب مجھے بھیجنا ہی نہیں ہے۔میں کچھ ایسی باتیں لکھ گئی تھی،جو نازیبا تھیں۔اگر تم نے خط چھوڑ دیئے ہوتے تو مجھے بڑا رنج ہوتا۔میں نے ان میں تمہاری شکایت کی تھی۔"

یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔

رما:"شوہر بدنیت ہے،دغاباز ہے،حیلہ ساز ہے۔اس کی اگر تم نے شکایت کی تو کیا بے جا کیا؟"

جالپا نے گھبرا کر پوچھا۔"تم نے خط پڑھ لیے تھے کیا؟تب تو تم مجھ سے ناراض ہو گے۔"

رقت سے جالپا کی آواز رک گئی۔اس کا سر جھک گیا اور جھکی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں آنچل پر گرنے لگیں۔ایک لمحہ میں اس نے دل سنبھال کر

کہا۔ ''مجھ سے بہت بڑی خطا ہوئی ہے، جو سزا چاہے دو۔ پر ہم سے ناراض مت ہو۔ ایشور جانتے ہیں تمہارے جانے کے بعد مجھے کتنا افسوس ہوا۔ میری قلم سے نہ جانے کیسے وہ باتیں نکل گئیں۔''

جالپا جانتی تھی کہ رمانا تھ کو زیوروں کی فکر مجھ سے ذرہ بھر بھی کم نہیں ہے، لیکن ہمدردوں سے اپنی داستان غم کہتے وقت ہم اکثر مبالغہ کر جایا کرتے ہیں، جو باتیں پردے کی سمجھی جاتی ہیں، ان کا ذکر کر دینے سے قربت اور یگانگت کا اظہار ہوتا ہے۔ دوستوں کی ہمدردی حاصل کرنے کا یہ عام طریقہ ہے۔

رما جالپا کے آنسو پونچھتا ہوا بولا۔ ''میں تم سے ناخوش نہیں ہوں۔ ناخوش ہونے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ امید کی تاخیر ہی مایوسی ہے، کیا میں اتنا نہیں جانتا۔ اگر تم نے مجھے منع نہ کر دیا ہوتا تو اب تک میں نے کسی نہ کسی طرح دو ایک چیزیں بنوادی ہوتیں۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے تم سے صلاح لی۔ اس وقت مجھے یہ خیال نہ رہا کہ ایسی حالتوں میں آدمی خواہش رکھنے پر بھی نہیں نہیں کرنے پر مجبور ہے۔ اب میں وہ غلطی نہ کروں گا۔''

جالپا نے متفکرانہ انداز سے پوچھا۔ ''تو کیا قرض لاؤ گے؟''

رما: ''کیا ہرج ہے؟ جب سود نہیں دینا ہے تو جیسے نقد ویسے ادھار، قرض سے دنیا کا کام چلتا ہے۔ کون قرض نہیں لیتا۔ یوں روپے ملتے بھی ہیں، تو الللے تللے خرچ ہو جاتے ہیں۔ قرض سر پر سوار ہوگا تو اس کی فکر ہاتھ کو روکے رہے گی۔''

جالپا: ''میں تمہیں فکر میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ اب میں بھول کر بھی زیوروں کا نام نہ لوں گی۔''

رما: ''نام تو تم نے کبھی نہیں لیا، لیکن تمہارے نام نہ لینے سے میرا فرض تو پورا نہیں ہو جاتا۔ تم قرض سے ناحق ڈرتی ہو۔ روپے جمع ہو جانے کے انتظار میں بیٹھا رہوں گا تو شاید کبھی بھی جمع نہ ہوں گے۔''

جالپا: ''مگر پہلے کوئی چھوٹی سی چیز لانا۔''

رما: ''ہاں، ہاں ایسا تو کروں گا ہی۔''

رما بازار چلا تو خوب اندھیرا ہو چلا تھا۔ دن رہتے جاتا تو یہ خوف تھا کہ اس پر دوستوں کی نگاہ پڑ جاتی۔ منشی دیانا تھ ہی دیکھ لیتے۔ وہ اس معاملے کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔

(13)

صرافے میں گنگو کی دکان مشہور تھی۔ گنگو تھا تو برہمن، مگر تھا پکا بنیا۔ اس کی دکان پر ہمیشہ گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اس کا تقدس گاہکوں میں یقین پیدا کرتا تھا۔ دوسری دکانوں پر لوگوں کو ٹھگے جانے کا خوف ہوتا تھا۔ اس دکان پر دغابازی کا اندیشہ نہ تھا۔ گنگو نے رما کو دیکھتے ہی مسکرا کر کہا۔ ''آیئے بابو صاحب اوپر آیئے۔ منیم جی آپ کے واسطے پان منگواؤں۔ کیا حکم ہے بابو جی؟ آپ تو کبھی آتے ہی نہیں۔ غریبوں پر بھی کبھی کبھی کرم کیا کیجیے۔''

گنگو کے اخلاق نے رما کی ہمت کھول دی۔ اگر اس نے اصرار نہ کیا ہوتا تو شاید رما کبھی دکان پر جا ہی نہ سکتا۔ دکان پر جا کر بولا۔ ''یہاں ہم جیسے مزدوروں کا کہاں گزر ہے مہاراج، گرہ میں کچھ ہو تو؟''

گنگو نے ان کے بیٹھنے کے لیے ایک کرسی منگوائی اور بولا۔ ''یہ آپ کیا

فرماتے ہیں۔ بابو صاحب آپ کی دکان ہے، جو چیز چاہیے لے جائیے۔ دام آگے پیچھے ملتے رہیں گے۔ ہم لوگ آدمی کو پہچانتے ہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ دکھاؤں کوئی جڑاؤ چیز؟ کوئی کنگن؟ کوئی ہار، ابھی حال ہی میں دلی سے مال آیا ہے!''

''کوئی ہلکے داموں والا ہار دکھایئے!''

''یہی کوئی سات آٹھ سو کا؟''

''اجی نہیں، کوئی چار سو تک حد ہے۔''

گنگو نے زیوروں کا صندوقچہ منگا کر کہا۔ ''میں آپ کو دونوں دکھائے دیتا ہوں، جو پسند آئے رکھ لیجیے گا۔ ہمارے یہاں کسی طرح کا دگل پھسل نہیں ہے۔ بابو صاحب اس کی آپ ذرا بھی فکر نہ کریں۔ پانچ برس کا لڑکا ہو یا سو برس کا بوڑھا، سب کے ساتھ ایک بات رکھتے ہیں۔ مالک کو بھی ایک دن منہ دکھانا ہے۔''

گنگو نے ہار نکال نکال کر دکھانے شروع کیے۔ رما کی آنکھیں کھل گئیں۔ طبیعت لوٹ پوٹ ہوگئی۔ کیا صفائی تھی۔ رنگینیوں کی خوبصورت سجاوٹ۔ کتنی آب وتاب، آنکھیں جھپکی جاتی تھیں۔ رما نے سوچ رکھا تھا، سو روپیہ ادھار نہ رکھوں گا، لیکن چار سو والا ہار آنکھوں میں کچھ نہ جچتا تھا اور جیب میں تھے کل تین سو روپے۔ سوچا یہ ہار لے گیا اور جالپا نے پسند نہ کیا تو فائدہ ہی کیا۔ ایسی چیز لے جانی چاہیے کہ وہ دیکھتے ہی پھڑک اٹھے۔ یہ جڑاؤ ہار اس کی گردن میں کتنا خوشنما معلوم ہوگا۔ وہ ہار ایک ہزار مرصع آنکھوں سے گویا رما کے دل کو کھینچنے لگا۔ وہ ایک

سکوت کے عالم میں اس کی طرف دیکھتا رہا، مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا۔ کہیں گنگو نے تین سو روپے ادھار ماننے سے انکار کر دیا تو اسے کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا۔ گنگو بشرے سے اس کے دل کی بات تاڑ کر بولا۔ ''آپ کے لائق تو بابو جی یہی چیز ہے، اندھیرے گھر میں رکھ دیجیے تو اجالا ہو جائے۔''

رما نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''پسند تو مجھے بھی یہی ہے، لیکن میرے پاس کل تین سو روپے ہیں۔ یہ سمجھ لیجیے......!''

گنگو نے خلوص کے ساتھ کہا۔ ''بابو جی روپے کا ذکر ہی نہ کیجیے۔ حکم ہو تو دس ہزار کا مال ساتھ بھیج دوں۔ مرضی ہو تو ایک آدھ چیز اور دکھاؤں۔ ایک شیش پھول بن کر آیا ہے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ گلاب کا پھول کھلا ہوا ہے۔ دیکھ کر جی خوش ہو جائے گا اور دام بھی کچھ ایسا بھاری نہیں ہے۔ آپ کو ایک ڈھائی سو میں مل جائے گا۔''

رما نے مسکرا کر کہا۔ ''مہاراج بہت باتیں بنا کر الٹے چھرے سے نہ مونڈ لیجیے گا۔ اس معاملے میں میں بالکل اناڑی ہوں۔''

گنگو: ''ایسا نہ کہو بابو جی! آپ چیز لے جائیے۔ بازار میں دکھا لیجیے۔ اگر کوئی ڈھائی سو سے کوڑی کم میں دے تو میں مفت میں دے دوں گا۔''

شیش پھول آیا، سچ مچ گلاب کا پھول تھا، جس پر ہیرے کی کنیاں اوس کی بوندوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ رما کی ٹکٹکی بندھ گئی۔

گنگو: ''ڈھائی سو تو کاریگر کی صفائی کا انعام ہے بابو جی، یہ وہ چیز ہے؟''

رما: ''ہاں ہے تو بہت خوبصورت، مگر ایسا نہ ہو کل ہی دام کا تقاضا کرنے لگو۔

میں خود ہی جہاں تک ہو سکے گا، جلد دے دوں گا۔''

گنگو نے دونوں چیزیں خوبصورت مخملی کیسوں میں رکھ کر رما کو دے دیں۔ رما کی مسرت کا اس وقت اندازہ نہ تھا، مگر یہ خالص مسرت نہ تھی، اس میں ایک اندیشہ کی آمیزش بھی تھی۔ یہ اس بچے کی خوشی نہ تھی، جس نے ماں سے پیسے مانگ کر مٹھائی لی ہو، بلکہ اس بچے کی خوشی تھی، جس نے پیسے چرا کر لی ہو۔ اسے مٹھائیاں میٹھی تو لگتی ہیں، لیکن دل کانپتا رہتا ہے کہ کہیں گھر چلنے پر مار نہ پڑنے لگے۔ ساڑھے چھ سو روپے ادا کرنے کی تو اسے فکر زیادہ نہ تھی۔ اگر زمانہ موافق ہو تو چھ مہینے میں بے باق کر سکتا ہے۔ خوف یہی تھا کہ بابو جی سنیں گے تو ضرور ناراض ہوں گے۔ لیکن جوں جوں آگے بڑھتا گیا، جالپا کو ان زیوروں سے آراستہ دیکھنے کے خواہشمند شوہر کا اشتیاق اس خوف پر غالب آتا جاتا تھا۔ گھر پہنچنے کی عجلت میں اس نے سڑک چھوڑ دی اور ایک گلی میں گھس گیا۔ گھنا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بادل تو اسی وقت آ گئے تھے، جب وہ گھر سے چلا تھا۔ وہ گلی میں گھسا ہی تھا کہ پانی کی بوندیں چھروں کی طرح اوپر پڑیں۔ جب تک چھتری کھولے، وہ لت پت ہو چکا تھا۔ اسے دہشت ہوئی۔ اس اندھیرے میں کوئی آ کر دونوں چیزیں نہ چھین لے۔ اندھیری گلیوں میں خون تک ہو جاتے ہیں۔ پچھتانے لگا۔ اس طرف ناحق آیا۔ دو چار منٹ دیر ہی میں پہنچتا تو ایسی کون سی آفت آ جاتی۔ مارے خوف کے کسی طرح گلی کا خاتمہ ہوا اور سڑک ملی۔ لالٹین نظر آئی۔ روشنی کتنی اعتقاد انگیز چیز ہے۔ اس کا آج اسے عملی تجربہ ہوا۔

وہ گھر پہنچا تو دیا ناتھ حقہ پی رہے تھے۔ ان کی آنکھ بچا کر وہ اندر جانا ہی چاہتا

تھا کہ انہوں نے اسے ٹوکا۔ ''اس وقت کہاں گئے تھے؟''

رما نے انہیں کچھ جواب نہ دیا۔ کہیں وہ اخبار سنانے لگیں تو گھنٹوں کی خبریں لیں۔ سیدھا اندر جا پہنچا۔ جالپا دروازے پر کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ فوراً اس کے ہاتھ سے چھتری لے لی اور بولی۔ ''تم تو بالکل ہی بھیگ گئے۔ کہیں ٹھہر کیوں نہ گئے؟''

رما: ''پانی کا کیا ٹھکانہ، رات بھر برستا رہے۔''

یہ کہتا ہوا وہ اوپر چلا گیا۔ اس نے سمجھا تھا، جالپا بھی پیچھے پیچھے آتی ہوگی۔ پر وہ نیچے بیٹھی اپنے دیوروں سے باتیں کر رہی تھی۔ گویا اسے زیوروں کی یاد ہی نہیں ہے۔ جیسے وہ بالکل بھول گئی ہے کہ رما صرافے سے آیا ہے۔

رما نے کپڑے بدلے اور دل میں جھنجھلاتا ہوا نیچے آیا۔ اسی وقت دیانا تھ کھانا کھانے آ گئے۔ سب لوگ کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ جالپا نے ضبط تو کیا، پر اس اضطراب کی حالت میں آج اس سے کچھ کھایا نہ گیا۔ جب وہ اوپر پہنچی تو رما چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مذاق کر کے بولا۔ ''آج تو صرافے کا جانا بیکار ہو گیا۔ ہار کہیں تیار ہی نہ تھا۔ بنانے کو کہہ آیا ہوں۔''

جالپا کا اشتیاق سے چمکتا ہوا چہرہ ماند پڑ گیا۔ بولی۔ ''وہ تو میں پہلے ہی جانتی تھی۔ بنتے بنتے پانچ چھ مہینے تو لگ ہی جائیں گے؟''

رما: ''نہیں جی بہت جلد بنا دے گا، قسم کھا رہا ہوں۔''

جالپا: ''اونہہ، جب چاہے دے۔''

جالپا منہ پھیر کر لیٹنے جا رہی تھی کہ رما نے زور سے قہقہہ مارا۔ جالپا چونک

پڑی۔ سمجھ گئی رما نے شرارت کی تھی۔ مسکراتی ہوئی بولی۔ ''تم بھی بڑے نٹ کھٹ ہو، کیا لائے؟''

رما: ''کیسا چکمہ دیا؟''

جالپا: ''یہ تو مردوں کی عادت ہی ہے، تم نے نئی بات کیا کی؟''

جالپا دونوں زیوروں کو دیکھ کر باغ باغ ہوگئی۔ اس کے دل میں مسرت کی موجیں سی اٹھنے لگیں۔ وہ اپنے جذبات کو چھپانا چاہتی تھی کہ رما اسے اوچھی نہ سمجھنے لگے، مگر ایک ایک عضو کھلا جاتا تھا۔ مسکراتی ہوئی آنکھیں، دہکتے ہوئے رخسار اور کھلے ہوئے ہونٹ افشائے راز کیے دیتے تھے۔ اس نے ہار گلے میں پہنا۔ شیش پھول سجایا اور خوشی سے متوالی ہو کر بولی۔ ''تمہیں دعا دیتی ہوں، ایشور تمہاری ساری آرزوئیں پوری کرے۔''

آج جالپا کی وہ تمنا پوری ہوئی، جو بچپن ہی سے اس کے تخیل کا ایک زریں خواب، اس کی امیدوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ آج اس کی وہ سادھ پوری ہوئی۔ اگر مانکی یہاں ہوتی تو وہ سب سے پہلے یہ ہار اسے دکھاتی اور کہتی تمہارا ہار تمہیں مبارک ہو۔

رما پر گھڑوں نشہ چڑھا تھا۔ آج اسے پہلی بار زندگی کا مزا حاصل ہوا۔

جالپا نے پوچھا۔ ''جا کر اماں کو دکھا آؤں؟''

رما نے جوانکسار دکھا کر کہا۔ ''اماں کو کیا دکھانے جاؤ گی، ایسی کون سی بڑی چیزیں ہیں؟''

جالپا: ''اب تم سے سال بھر تک اور کسی چیز کے لیے نہ کہوں گی۔ یہ روپے ادا

کر دوں گی۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگا۔"

رما نے پرتر دو انداز سے کہا۔"روپوں کی کیا فکر؟ ہیں ہی کتنے؟"

جالپا: "ذرا ان کو دکھا آؤں، دیکھوں تو کیا کہتی ہیں؟"

رما: "مگر یہ کہنا ادھار لائے ہیں۔"

جالپا اسی طرح دوڑی ہوئی نیچے گئی۔ گویا اسے وہاں کوئی خزانہ مل جائے گا۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ رما خوشی کی نیند سو رہا تھا۔ جالپا نے چھت پر آ کر ایک بار آسمان کی طرف دیکھا۔ شفاف چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ وہ کاتک کی چاندنی، جس میں نغمے کا سکون ہے اور شعر کی روحانیت۔ اس نے کمرے میں اپنی صندوقچی کھولی اور اس میں سے وہ کانچ کا چندن ہار نکالا، جسے پہن کر وہ ایک دن پھولی نہ سمائی تھی۔ مگر اب اس نئے ہار کے سامنے اس کی چمک اس طرح ماند پڑ گئی تھی، جیسے اس شفاف چاندنی کے سامنے تاروں کی روشنی۔ اس نے اس نقلی ہار کو توڑ ڈالا اور اس کے دانوں کو نیچے گلی میں پھینک دیا۔ اس طرح جیسے پوجا ختم ہونے کے بعد کوئی بھگت مٹی کی مورتیوں کو پانی میں فنا کر دیتا ہے۔

(14)

اس دن سے جالپا کی زندگی میں ایک نیا پہلو رونما ہوا۔ رما نہانے جاتا تو اسے اپنی دھوتی چنی ہوئی ملتی۔ طاق پر تیل اور صابن بھی رکھا ہوا پاتا۔ جب وہ دفتر جانے لگتا تو جالپا اس کے کپڑے لا کر سامنے رکھ دیتی۔ پہلے پان مانگنے پر ملتے تھے، اب زبردستی کھلائے جاتے تھے۔ جالپا اس کا رخ دیکھا کرتی۔ اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہاں تک کہ جب وہ کھانے بیٹھتا تو وہ پنکھا کرتی۔ پہلے وہ

بڑے جبر سے کھانا پکانے جایا کرتی تھی اور اس پر بھی بیگار ہی ٹالتی تھی۔ اب وہ بڑی خوشی سے رسوئی میں جاتی۔ چیزیں وہی پکائی جاتی تھیں، مگر ان میں کچھ زیادہ مٹھاس آ گئی تھی۔ رما کو ان الفت آمیز دلجوئیوں کے سامنے وہ زیور بہت ہی حقیر معلوم ہوتے تھے۔

ادھر جس دن رما نے گنگو کی دکان سے زیور خریدے، اسی دن سے دوسرے صرافوں کو بھی اس کی قدردانی کی خبر ملی۔ رما جب ادھر سے نکلتا تو دونوں طرف کے دکاندار اٹھ اٹھ کر سلام کرتے۔ آیئے بابو جی، پان تو کھاتے جایئے، دو ایک چیزیں ہماری دکان سے بھی تو دیکھیے۔ رما کا خرم واحتیاط اس کی ساکھ کو اور بڑھا دیتا۔ یہاں تک کہ ایک دن ایک دلال رما کے گھر آ پہنچا اور اس کے نہیں نہیں کرنے پر بھی صندوقچہ کھول کر اس کے سامنے رکھ ہی دیا۔

رما نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔ ''بھائی اس وقت مجھے کچھ نہیں لینا ہے، کیوں اپنا اور میرا وقت برباد کرو گے؟''

دلال نے بڑی خوشامد سے کہا۔ ''بابو جی! دیکھ تو لیجیے، پسند آئے تو لیجیے گا، دیکھ لینے میں کوئی ہرج نہیں ہے؟ آخر رئیسوں کے پاس نہ جائیں تو کس کے پاس جائیں۔ اوروں نے آپ سے گہری رقمیں ماریں۔ ہمارے بھاگ میں بدا ہو گا تو ہمیں بھی آپ سے چار پیسے مل جائیں گے۔ بہو جی اور مائی جی کو دکھا لیجیے۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ کے ہاتھوں بنی ہوگی۔''

رما: ''عورتوں کی پسند کی نہ کہو۔ چیزیں اچھی ہوں گی ہی، پسند آتے کیا دیر لگتی ہے۔ لیکن بھائی اس وقت ہاتھ خالی ہے۔''

دلال ہنس کر بولا۔ ’’بابو جی! بس ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ وہ آپ کا حکم ہو جائے تو ہزار پانچ سو آپ کے اوپر نچھاور کریں۔ ہم لوگ آپ کا مزاج دیکھتے ہیں بابو جی، بھگوان نے چاہا تو آج میں سودا کر کے اٹھوں گا۔ دلال نے صندوقچی سے دو چیزیں نکالیں۔ ایک تو نئے فیشن کا جڑاؤ کنگن تھا اور دوسرا کانوں کا رِنگ۔ دونوں ہی چیزیں بے مثل تھیں۔ ایسی آب تھی، گویا چراغ جل رہا ہو۔ دس بج چکے تھے۔ منشی دیاناتھ دفتر جا چکے تھے۔ رما خود کھانا کھانے جا رہا تھا لیکن ان دونوں چیزوں کو دیکھ کر اس پر خود فراموشی کی حالت طاری ہو گئی۔ دونوں کیس لیے ہوئے گھر میں آیا، اس کے ہاتھ میں کیس دیکھتے ہی دونوں عورتیں ٹوٹ پڑیں اور ان چیزوں کو نکال کر دیکھنے لگیں۔ ان کی چمک دمک نے انہیں فریفتہ کر لیا کہ ان میں عیب و حسن کا امتیاز ہی نہ رہا۔

جاگیشری: ’’آج کل کی چیزوں کے سامنے تو پرانی چیزیں کچھ جچتی ہی نہیں۔‘‘

جالپا: ’’نہ جانے وہ عورتیں کیسے ان چیزوں کو پہنتی تھیں؟‘‘

رما: ’’پسند کیوں نہیں ہیں، اماں جی تم لے لو۔‘‘

جاگیشری نے اپنے دردِ دل کو چھپانے کے لیے سر جھکا لیا۔ جس کی ساری عمر خانگی تفکرات میں کٹ گئی، وہ کیا آج خواب میں بھی ان زیوروں کے پہننے کی امید کر سکتی تھی۔ آہ، اس دکھیا کی زندگی کی کوئی مراد تو پوری نہ ہوئی۔ شوہر کی آمدنی کبھی اتنی نہ ہوئی کہ بال بچوں کی پرورش کے بعد کچھ پس انداز ہوتا۔ جب سے گھر کی مالکن ہوئی تب ہی سے گویا اس کی ریاضت شروع ہوئی اور ساری آرزوئیں ایک ایک کر کے خاک میں مل گئیں۔ اس نے ان زیوروں کی طرف

سے آنکھیں ہٹالیں۔ ان میں اتنی کشش تھی کہ وہ ان کی طرف تاکتے ہوئے ڈرتی تھی کہ کہیں اس کی بے نیازی کا پردہ نہ کھل جائے۔ بولی۔ ''میں لے کر کیا کروں گی بیٹی؟ میرے پہننے اور اوڑھنے کے دن تو نکل گئے۔ کون لایا ہے بیٹا؟ کیا دام مانگتا ہے؟''

رما: ''ایک صراف دکھانے لایا ہے، ابھی میں نے دام وام نہیں پوچھے۔ مگر دام اونچے ہوں گے۔ لینا تو تھا نہیں، پوچھ کر کیا کرتا؟''

جالپا: ''لینا نہیں تو یہاں لائے کیوں؟''

جالپا نے یہ الفاظ کچھ ایسے تحکم آمیز لہجے میں کہے کہ رما کھسیا گیا۔ ان میں کچھ ایسی تحریک، کچھ ایسی ملامت اور کچھ ایسا اشتیاق تھا کہ وہ ان چیزوں کو واپس نہ لے جاسکا۔ بولا:

''تو لے آؤں؟''

جالپا: ''اماں لینے ہی کو نہیں کہتیں تو لے کر کیا کرو گے؟ کیا مفت میں دے رہا ہے؟''

رما: ''سمجھ لو مفت ہی ملتے ہیں۔''

جالپا: ''سنتی ہو اماں ان کی باتیں، آپ جا کر لوٹا آئیے۔ جب ہاتھ میں روپے آجائیں گے تو بہت گہنے ملیں گے۔''

جاگیشیری نے پرہوس انداز میں کہا۔ ''روپے ابھی تو نہیں مانگتا؟''

جالپا: ''ادھار بھی دے گا تو سود تو لگا ہی لے گا۔''

رما: ''تو لوٹا دوں؟ ایک بات چٹ پٹ طے کر ڈالو۔ لینا ہو لے لو، نہ لینا ہو تو

لوٹا دو۔ پس وپیش میں نہ پڑو۔''

جالپا کو یہ بے لاگ انداز گفتگو اس وقت بہت ناگوار معلوم ہوا۔ انکار کرنا اس کا کام تھا۔ رما کو تو لینے کے لیے اصرار کرنا چاہیے تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ رما کے دل میں ذرا بھی احساس، ذرا بھی درد نہیں ہے۔ جاگیشری کی طرف ہوسناک نگاہوں سے دیکھ کر بولی:

''لوٹا دو..............رات دن کے تقاضے کون لے گا؟''

وہ کیسوں کو بند کرنے ہی والی تھی کہ جاگیشری نے کنگن اٹھا کر پہن لیا۔ گویا چھن بھر پہن لینے ہی سے اس کی ہوس پوری ہو جائے گی۔ پھر دل میں اس اوچھے پن پر شرمندہ ہو کر وہ اسے اتارنا ہی چاہتی تھی کہ رما نے کہا۔ ''اب تم نے پہن لیا ہے، اماں تو پہنے رہو۔ میں اسے تمہاری نذر کرتا ہوں۔''

جاگیشری کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ جو آرزو آج تک نہ پوری ہوئی، بیٹے کی سعادت مندی کی بدولت پوری ہوئی تھی، لیکن کیا وہ اپنے عزیز بیٹے پر قرض کا اتنا بوجھ رکھ دے گی۔ ابھی اس غریب کی حیثیت ہی کیا ہے۔ نہ جانے روپے جلد ہاتھ آئیں یا دیر میں۔ قیمت بھی تو نہیں معلوم، اگر دام اونچے ہوئے تو دے گا کہاں سے؟ اسے کتنے تقاضے سہنے پڑیں گے اور کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا۔ پست ہمت ہو کر بولی۔ ''نہیں بیٹا! میں نے یونہی پہن لیا، لے جاؤ، لوٹا دو۔''

ماں کا اداس چہرہ دیکھ کر رما کا دل دہل اٹھا۔ کیا قرض کے خوف سے وہ اپنی بے نفس ماں کی اتنی خدمت بھی نہ کر سکے، ماں کی جانب اس کا کچھ فرض بھی تو ہے۔ بولا:

''روپے بہت مل جائیں گے اماں،تم اس کی فکر مت کرو۔''

جاگیشری نے بہو کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہی تھی کہ لڑکا مجھ پر کتنا ظلم کر رہا ہے۔

جالپا بے غرضیانہ انداز سے بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید اسے خوف ہو رہا تھا کہ رما یہ کنگن نہ لے لیں۔ اس کے بشرے سے جاگیشری کو معلوم ہو گیا۔ اسے میرا کنگن پہننا ناگوار گزرا۔ اس نے فوراً کنگن اتار ڈالا اور جالپا کی طرف بڑھا کر بولی۔

''میں اپنی طرف سے تمہیں دیتی ہوں۔ بہو مجھے جو کچھ پہننا اوڑھنا تھا، پہن اوڑھ چکی۔ اب تم ذرا پہنو۔ دیکھوں۔''

جالپا کو اس میں مطلق شبہ نہ تھا کہ اماں کے پاس روپے موجود ہیں۔ وہ سمجھی شاید آج دیوی پسیج گئی ہیں۔ ایک لمحہ پہلے اس نے سمجھا تھا کہ روپے رما کو دینے پڑیں گے۔ اس لیے خواہش رہنے پر بھی وہ اسے واپس کر دینا چاہتی تھی۔ جب اماں دام دینے کو تیار تھیں، تو انکار کرنے کی کیا ضرورت۔ اوپرے دل سے بولی:

''روپے نہ ہوں تو رہنے دیجیے۔ ابھی کون جلدی ہے؟''

رما نے چڑ کر کہا۔ ''تو تم یہ کنگن لے رہی ہو؟''

جالپا: ''اماں نہیں مانتیں تو ہم کیا کریں؟''

رما: ''تو ان رنگوں کو بھی کیوں نہیں رکھ لیتی؟''

جالپا: ''جا کر دام تو پوچھ آؤ۔''

رما: ''تم ان چیزوں کو لے جاؤ۔''

رما نے باہر آ کر دلال سے دام پوچھے تو سناٹے میں آ گیا۔ کنگن سات سو کے

تھے اور رنگ ڈیڑھ سو کے۔ اس کا اندازہ تھا کہ کنگن زیادہ سے زیادہ تین سو کے ہوں گے اور رنگ چالیس پچاس کے۔ پچھتایا کہ ان چیزوں کے دام پہلے ہی کیوں نہ پوچھ لیے۔ نہیں تو اندر جانے کی نوبت ہی کیوں آتی۔ مگر کچھ بھی ہو۔ واپس تو کرنا ہی پڑے گا۔ اتنا بڑا بوجھ وہ سر پر نہیں لے سکتا۔ دلال سے بولا۔ ''بڑے مہنگے ہیں، بھائی میرا اندازہ تو تین چار سو کے اندر ہی تھا۔''

دلال کا نام چرن داس تھا۔ بولا۔ ''دام میں ایک کوڑی کا فرق پڑ جائے سرکار! تو منہ نہ دکھاؤں۔ لالہ دھنی رام کی کوٹھی کا تو مال ہے۔ آپ چل کر پوچھ لیں۔ چھدام روپے کی دلالی البتہ میری ہے۔ آپ کی مرضی ہے دیجیے یا نہ دیجیے۔''

رما: ''تو بھئی ان داموں کی چیزیں تو اس وقت ہم نہیں لے سکتے۔''

چرن داس: ''ایسی بات نہ کہیے بابو جی۔ آپ کے لیے اتنے روپے کون بڑی بات ہے۔ آپ سے بڑھ کر دوسرا کون شوقین ہوگا۔ یہ سب رئیسوں ہی کی پسند کی چیزیں ہیں۔ گنوار ان کی قدر کیا جانے؟''

رما: ''ساڑھے آٹھ سو بہت ہوتے ہیں بھائی!''

چرن داس: ''روپوؤں کا منہ نہ دیکھئے بابو جی، جب بہو جی پہن کر بیٹھیں گی تو ایک نگاہ میں سارے روپے وصول ہو جائیں گے۔''

رما کو یقین تھا کہ جالپا زیوروں کی یہ قیمت سن کر آپ ہی بدک جائے گی۔ دلال سے اور زیادہ بات نہ کی۔ اندر جا کر زور سے ہنسا اور بولا۔ ''آپ نے اس کنگن کا کیا دام سمجھا تھا اماں؟''

جاگیشری کوئی جواب دے کر بے وقوف نہ بننا چاہتی تھی۔ بولی۔ ''ان جڑاؤ

چیزوں میں ناپ تول کا تو کوئی حساب ہوتا نہیں۔ جتنے میں طے ہو جائے، وہی ٹھیک ہے۔''

رما: ''اچھا تم بتاؤ جالپا؟''

جالپا: ''چھ سو سے کم نہیں ہے۔''

رما نے قیمت کا خوف کھا کر ان چیزوں کو واپس کر دینا چاہا تھا، مگر اس میں اسے کامیابی نہ ہوئی۔ چھ اور سات میں تھوڑا ہی فرق تھا اور ممکن ہے چرن داس چھ سو ہی میں راضی ہو جائے۔ کچھ جھینپ کر بولا:

''کچے نگینے نہیں ہیں؟''

جالپا: ''کچھ بھی ہو، چھ سو سے زیادہ کا نہیں ہے۔''

''اور رنگ؟''

''زیادہ سے زیادہ سو روپے۔''

''یہاں بھی چوکیں، ڈیڑھ سو مانگتا ہے۔''

''جٹو ہے کوئی۔ ہمیں ان داموں لینا ہی نہیں۔''

رما کی چال الٹی پڑی۔ جالپا کو ان چیزوں کی قیمت کے بارے میں بہت غلط فہمی ہوئی تھی، لیکن سات سو ہی کوئی چھوٹی رقم ہے۔ آخر جالپا اس کی مالی حالت سے تو واقف تھی۔ پھر بھی سات سو روپے کی چیزوں کے لیے منہ کھولے بیٹھی تھی۔ رما کو کیا معلوم تھا کہ رما کچھ اور ہی سمجھ کر کنگن پر لہرائی تھی۔ اب تو گلا چھوٹنے کی ایک ہی تدبیر تھی اور وہ یہ کہ دلال چھ سو پر راضی نہ ہو۔ بولا۔ ''وہ ساڑھے آٹھ سو سے کوڑی کم نہ لے گا۔''

جالپا: ''تو لوٹا دو، نہیں چلو۔ میں پوچھتی ہوں۔''

رما کی روح فنا ہوگئی۔ دلال راضی ہوگیا تو پھر اس کے بنائے کچھ نہ بنے گا۔

جالپا دالان میں آ کر بولی۔ ''ذرا یہاں آنا جی۔ او صراف! لوٹنے آئے ہو یا مال بیچنے آئے ہو۔ سات سو روپے کنگن کے مانگتے ہو؟''

چرن داس: ''سات سو تو اس کی کاریگری کے دام ہیں بجور۔''

جالپا: اچھا جو اس پر سات سو نچھاور کرے، اس کے پاس لے جاؤ۔ یہاں تو دونوں چیزوں کے سات سو ملیں گے۔''

چرن داس: ''بہو جی! آپ تو اندھیر کرتی ہو۔ کہاں ساڑھے آٹھ سو اور کہاں سات سو!''

جالپا: ''تمہاری خوشی، اپنی چیز لے جاؤ۔''

چرن داس نے خوشامد کرتے ہوئے کہا۔ ''اتنے بڑے دربار میں آ کر چیز لوٹا لے جاؤ۔ آپ یونہی پہنیں۔ دس پانچ کی بات ہوتی تو آپ کی زبان نہ پھیرتا۔ آپ سے جھوٹ نہیں کہتا۔ ان چیزوں پر پیسہ روپیہ نفع ہے۔ اسی ایک پیسے میں دکان کا بھاڑا۔ دستوری دلالی سب سمجھیے۔ ایک بات ایسی سمجھ کر کہہ دیجیے کہ ہمیں بھی چار پیسے مل جائیں سویرے سویرے لوٹانا نہ پڑے۔''

جالپا نے بے اعتنائی سے کہا۔ ''کہہ دیئے وہی سات سو۔''

چرن داس نے ایسا منہ بنایا گویا اس کی رقم ڈوبی جا رہی ہو۔ اور بولا۔ ''بہو جی! ہے تو گھاٹا ہی مگر آپ کی بات نہیں ٹالتے بنتی۔ روپے کب ملیں گے؟''

جالپا نے گھر میں جاتے ہوئے کہا۔ ''جلدی ہی مل جائیں گے۔''

جالپا اندر آ کر بولی۔ ''آخر دیا کہ نہیں، ڈیڑھ سو صاف اڑائے جاتا تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ کچھ اور کم کیوں نہ کہا۔''

رما کچھ نہ بولا۔ اس کی چالیں کچھ الٹی پڑیں کہ چار و ناچار اس کی گردن پر بوجھ لد ہی گیا۔ جالپا تو خوشی کی امنگ میں دونوں چیزیں لیے اوپر چلی گئی، مگر رما سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ جالپا نے اس کی حالت جان کر بھی ان چیزوں سے کیوں انکار نہ کر دیا۔ کیوں زور دے کر نہیں کہا کہ میں نہ لوں گی انہیں، واپس کر دو۔ اسے اس کا رنج تھا۔ آخر اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ یہ اپنی ہی حماقتوں کا کنارہ ہے۔ یہ میری ہی غلطی ہے۔ مجھے دلال کو دروازے ہی سے دھتکار دینا چاہیے تھا۔

کھانا کھا کر جب رما اوپر کپڑے پہننے گیا تو جالپا آئینے کے سامنے کھڑی کانوں میں رِنگ پہن رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی۔ ''آج کسی اچھے کا منہ دیکھ کر اٹھی تھی۔ دو چیزیں مفت ہاتھ آ گئیں۔''

رما نے تعجب سے پوچھا۔ ''مفت کیوں؟ روپے نہ دینے پڑیں گے؟''

جالپا: ''روپے تو ماں جی دیں گی۔''

رما: ''کیا کچھ کہتی تھیں؟''

جالپا: ''انہوں نے میری نذر کیے ہیں تو روپے کون دے گا؟''

رما نے اس کے بھولے پن پر مسکرا کر کہا۔ ''یہ سمجھ کر تم نے یہ چیزیں لے لیں۔ اماں کو دینا ہوتا تو اسی وقت دے دیتیں، جب چوری ہوئی تھی۔''

جالپا پریشانی میں پڑ گئی۔ بولی۔ ''تو مجھے کیا معلوم تھا۔ اب بھی تو لوٹا سکتے ہو۔

کہہ دینا جس کے لیے یہ چیزیں لی تھیں، اسے پسند نہیں آئیں۔''

یہ کہہ کر اس نے فوراً کانوں سے رِنگ نکال لیے۔ کنگن بھی اتار ڈالے اور دونوں چیزیں کیسوں میں رکھ کر اس کی طرف اس طرح بڑھائے، جیسے کوئی بلی چوہے سے کھیل رہی ہو۔ کیا بلی چوہے کو اپنی گرفت سے باہر ہونے دیتی ہے۔ وہ اسے چھوڑ کر بھی نہیں چھوڑتی۔ جالپا کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا، لیکن چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کیوں وہ رما کی طرف دیکھ کر زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کسی مصیبت سے سبکدوش ہو جانے پر جو دلی مسرت ہونی چاہیے، وہ کہاں تھی؟ اس کی حالت ٹھیک اسی ماں کی سی تھی، جو اپنے بیٹے کو پردیس جانے کی اجازت دے رہی ہو۔ وہی مجبوری وہی کشمکش اس کے چہرے پر جھلک رہی تھی۔

رما اتنا بے درد نہ تھا کہ وہ چیزیں اس کے ہاتھ سے لے لیتا۔ اسے تقاضے سہنا، شرمندہ ہونا، منہ چھپائے پھرنا اور فکر کی آگ میں گھلنا سب کچھ منظور تھا، مگر جالپا کو مایوس نہ کر سکتا تھا۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ ''رہنے دو، اب لے لیا ہے تو کیا لوٹائیں؟ اماں بھی ہنسیں گی۔''

جالپا نے مصنوعی مآل اندیشی سے کہا۔ ''اپنی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے۔ ایک نئی مصیبت مول لینے کی کیا ضرورت ہے؟''

رما نے گویا پانی میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ ''ایشور مالک ہے۔'' اور فوراً نیچے چلا گیا۔

ہم عارضی شرم ولحاظ میں پڑ کر اپنی زندگی کے سکون اور عافیت کا کیسے خون کر

دیتے ہیں۔ اگر جالپا حسن کے اس جھونکے میں اپنے مستقبل کو رکھ سکتی۔ اگر رما جھوٹے لحاظ کے آگے سر نہ جھکا دیتا۔ دونوں کے دلوں میں سچی ہمدردی ہوتی تو وہ گمراہ ہو کر تباہی کی طرف کیوں گامزن ہوتے۔

گیارہ بج گئے تھے۔ دفتر کے لیے دیر ہو رہی تھی۔ مگر رما اس طرح جا رہا تھا جیسے اپنے کسی عزیز کو دفن کر کے لوٹ رہا ہو۔

(15)

جالپا اب وہ خلوت پسند نازنین نہ تھی، جو دن بھر منہ لپیٹے اداس پڑی رہتی تھی۔ اسے اب گھر میں بیٹھنا اچھا نہ لگتا تھا۔ اب تک وہ مجبور تھی۔ کہیں آ جا نہ سکتی تھی۔ اب خدا کے فضل سے اس کے پاس بھی گہنے ہو گئے تھے۔ پھر وہ گوشۂ تنہائی میں کیوں پڑی رہتی۔ زیور لباس کوئی مٹھائی نہیں ہے، جس کی لذت تنہائی میں حاصل کی جا سکے۔ محلے یا برادری میں کہیں سے بلاوا آتا تو وہ ساتھ ضرور جاتی۔ کچھ دنوں کے بعد ساس کی ضرورت بھی نہ رہی۔ وہ اکیلی ہی آنے جانے لگی۔ اس کی شکل وصورت، زیور، لباس اور آداب واخلاق نے تھوڑے ہی دنوں میں اسے محلے کی عورتوں میں اعزاز کے رتبے پر پہنچا دیا۔ اس کے بغیر محفل سونی رہتی۔ اس کے گلے میں اتنا لوچ تھا، انداز گفتگو اتنا دل آویز اور ادائیں اتنی دلکش کہ وہ محفل کی رانی معلوم ہوتی تھی۔ روز ہی کہیں نہ کہیں عورتوں کا جماؤ ہو جاتا۔ گھنٹے دو گھنٹے گا بجا کر یا گپ شپ کر کے عورتیں دل بہلا لیا کرتیں۔ پھاگن میں پندرہ دن برابر گانا ہوتا رہا۔ کبھی کسی کے گھر، کبھی کسی کے گھر۔ جالپا نے جیسا حسن پایا تھا، ویسا ہی فیاض دل بھی پایا تھا۔ مہمان نوازیوں کا خرچ بیشتر اس کے ذمے آتا۔ کبھی کبھی

گانے والیاں بلائی جاتیں۔ ان کی خاطر و مدارت کا بار بھی اسی پر تھا۔ کبھی کبھی وہ مستورات کے ساتھ ندی اشنان کرنے جاتی۔ تانگے کا کرایہ اور ناشتہ کا خرچ اسی کے متھے جاتا۔ اسی طرح سو تین روز اڑ جاتے تھے۔ رما جان نثار شوہر تھا۔ جالپا کے قدموں پر اپنی جان تک صدقے کر دیتا۔ روپیہ کی حقیقت کیا تھی، اس کا منہ تاکتا رہتا تھا۔

ایک بار مستورات کو سینما دیکھنے کی دھن سوار ہوئی۔ اس میں انہیں مزا آیا کہ آئے دن سینما کی سیر ہونے لگی۔ رما کو اب تک سینما کا شوق نہ تھا۔ شوق ہوتا بھی تو کیا کرتا۔ اب ہاتھ میں پیسے آنے لگے۔ اس پر جالپا کا اصرار، پھر بھلا وہ کیوں نہ جاتا۔ سینما ہال میں ایسی کتنی ہی عورتیں نظر آتیں، جو منہ کھولے بے حجاب ہنستی بولتی رہتی تھیں، مگر حجاب کے باعث پردہ نشینوں کے ساتھ ہی بیٹھتی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ رما بھی اس کے ساتھ بیٹھے۔ آخر وہ ان فیشن ایبل عورتوں سے کس بات میں کم ہے۔ روپ رنگ میں کم نہیں۔ سج دھج میں کم نہیں۔ پھر وہ پردے والیوں کے ساتھ کیوں بیٹھے۔ رما بہت تعلیم یافتہ ہونے پر بھی دور جدید کے اثر سے آزاد خیال تھا۔ پہلے تو وہ پردے کا ایسا حمایتی تھا کہ ماں کو کبھی گنگا اشنان کرنے لے جاتا تو پنڈتوں تک سے نہ بولنے دیتا۔ کبھی ماں کی ہنسی مردانے میں سنائی دیتی تو آ کر بگڑتا، تم کو ذرا بھی شرم نہیں اماں۔ باہر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور تم ہنس رہی ہو۔ ماں شرما جاتی تھی، مگر عمر کے ساتھ رما کا وہ حجاب غائب ہوتا جاتا تھا۔ اس پر جالپا کا شگفتہ حسن اسے اور بھی دلیر بنا رہا تھا۔ جالپا بدوضع، بدشکل یا بدتمیز ہوتی تو اسے وہ زبردستی پردے میں بٹھاتا۔ اس کے ساتھ سیر کرنے میں اسے شرم آتی۔ جالپا جیسی

بے مثل حسینہ کے ساتھ سیر کرنے میں لطف کے ساتھ ہی کچھ وقار بھی تھا۔ وہاں کے مذہبی طبقے میں کوئی نازنین اتنی قبول صورت، اتنی خوش ادا، اتنی خوش قامت نہ تھی۔ دیہات کی لڑکی ہونے پر بھی وہ شہریت کے رنگ میں ایسی رنگ گئی تھی گویا شہر میں ہی اس کی پرورش ہوئی ہے۔ تھوڑی سی انگریزی تعلیم کی تھی، وہ رماپوری کیے دیتا تھا۔

مگر پردے کی بندش ٹوٹے کیسے؟ سینما ہال میں رما کے کتنے ہی دوست، کتنے ہی شناسا بیٹھے نظر آتے تھے۔ وہ اسے جالپا کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر کتنا مضحکہ اڑائیں گے۔ کتنے فقرے کسیں گے۔

آخر ایک دن اس نے سب کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑے ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جالپا سے بولا۔ ''آج ہم تم سینما گھر میں ساتھ بیٹھیں گے۔''

جالپا کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ بولی۔ ''سچ؟ نہیں بھائی ساتھ والیاں زندہ نہ چھوڑیں گی۔''

رما: ''اس طرح ڈرنے سے تو کچھ نہ ہو گا۔ یہ کیا مذاق ہے کہ عورتیں منہ چھپائے چق کی آڑ میں بیٹھی رہیں۔'' اس طرح یہ معاملہ بھی طے ہو گیا۔ دو چار دن دونوں کچھ جھینپتے رہے، لیکن پھر ہمت کھل گئی۔ یہاں تک کہ رما اور جالپا شام کے وقت پارک میں ساتھ ساتھ ٹہلتے نظر آنے لگے۔

ایک دن جالپا نے مسکرا کر کہا۔ ''کہیں بابو جی دیکھ لیں تو؟''

''تو کیا؟ کچھ نہیں۔''

''میں تو مارے شرم کے گڑ جاؤں۔''

''ابھی تو مجھے بھی شرم آئے گی۔ مگر وہ خود ادھر نہ آئیں گے۔''

''اور کہیں اماں دیکھ لیں تو؟''

''اماں سے کون ڈرتا ہے۔ دو دلیلوں میں سب ٹھیک کر دوں گا۔''

دس پانچ دن میں اس نئی سوسائٹی میں اپنا رنگ جما لیا۔ اس نے اس دائرے میں کچھ اس طرح قدم رکھا جیسے کوئی باکمال مقرر پہلی بار منبر پر آتا ہے اور نقادان ناہمدرد ہونے پر بھی اس کے کمال کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ جالپا کے حسن میں وہ تمکنت، وہ خودداری تھی، جو عالی نسبی کی دلیل ہے۔ پہلے ہی دن ایک خاتون نے جالپا کو چائے کی دعوت دی اور جالپا نے خواہش نہ ہونے پر بھی اسے قبول کر لیا۔

جب دونوں آدمی وہاں سے لوٹے تو رما نے متفکرانہ انداز سے کہا۔ ''تو کل اس کی چائے پارٹی میں جانا پڑے گا۔''

''تو کیا کرتی! انکار کرتے بھی تو نہ بنتا تھا۔''

''تو سویرے تمہارے لیے ایک اچھی سی ساڑھی لا دوں؟''

''میرے پاس تو ساڑھیاں ہیں۔ ذرا دیر کے لئے پچاس ساٹھ روپے خرچ کرنے سے کیا فائدہ؟''

''تمہارے پاس اچھی ساڑھی کہاں ہے؟ جیسی اس کی ساڑھی تھی۔ ویسی ہی میں بھی لاؤں گا۔''

''مجھے صاف کہہ دینا چاہیے تھا کہ میں نہیں آسکتی۔''

''پھر اس کی دعوت بھی تو کرنی پڑے گی؟''

''یہ تو بڑی مصیبت گلے پڑی۔''

''مصیبت تو کچھ نہیں ہے۔صرف یہی خیال ہے کہ میرا مکان بے مصرف ہے۔میز کرسیاں چائے کاسٹ تو رمیش کے یہاں سے مانگ لاؤں گے،لیکن گھر کے لیے کیا کروں؟''

''کیا یہ ضروری ہے کہ ہم بھی اس کی دعوت کریں؟''

رما نے اس جملے پر کچھ التفات نہ کیا۔اسے جالپا کے لیے ایک خوبصورت کلائی کی گھڑی اور ایک ساڑھی کی فکر پیدا ہوگئی۔اس کے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی۔اس کا خرچ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ابھی تک صرافوں کو ایک پیسہ دینے کی بھی نوبت نہ آئی تھی۔ایک بار گنگو نے اشارے سے تقاضا بھی کیا تھا،لیکن یہ بھی تو نہیں ہوسکتا کہ جالپا پھٹے حالوں چائے پارٹی میں جائے۔رات بھر تو اس نے صبر کیا۔دوسرے دن دونوں چیزیں لاکر ہی دم لیا۔

جالپا نے جھنجھلا کر کہا۔''میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ڈیڑھ سو سے کم کی نہ ہوں گی۔''

''ڈیڑھ سو،اتنا فضول خرچ میں نہیں ہوں۔''

''ڈیڑھ سو سے کم کی یہ چیزیں نہیں ہیں؟''

رما نے جالپا کی کلائی پر گھڑی باندھ دی اور فریفتہ ہو کر بولا۔''تمہاری کلائی! یہ کیسی کھل رہی ہے؟میرے روپے وصول ہو گئے۔''

''سچ بتاؤ،کتنے خرچ ہوئے؟''

''سچ بتا دوں۔ایک سو پینتیس روپے۔پچھتّر روپے کی ساڑھی،دس کے

جوتے اور پچاس کی گھڑی۔"

جالپا ملول ہو کر بولی۔"وہ ڈیڑھ سو ہی ہوئے مگر یہ سب روپے ادا کیسے ہوں گے۔اس چڑیل نے ناحق مجھے دعوت دے دی۔اب میں باہر جانا ہی چھوڑ دوں گی۔"

رما بھی اسی فکر میں غرق تھے، پر اس کا اظہار کر کے جالپا کی مسرت میں کیسے رخنہ ڈالتا۔بولا۔"سب ادا ہو جائے گا۔"

جالپا نے ترش ہو کر کہا۔"کہاں سے ادا ہو جائے گا۔ذرا سنوں؟ کوڑی تو بچتی نہیں، ادا کہاں سے ہو جائے گا۔ان چیزوں کو لوٹا آؤ۔"

رما نے منت آمیز لہجے میں کہا۔"ان چیزوں کو رکھ لو۔پھر تم سے بغیر پوچھے نہ لاؤں گا۔"

شام کو جالپا نے نئی ساڑھی پہنی، گھڑی کلائی پر باندھی اور آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو غرور اور مسرت سے اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔اس نے ان چیزوں کو واپس کرنے کے لیے خواہ سچے دل سے اصرار کیا ہو، پر اس وقت وہ اتنی نفس کشی کے لیے تیار نہ تھی۔شام کو جالپا اور رما چھاؤنی کی طرف چلے۔اس خاتون کا بنگلہ ملنے میں دیر نہ ہوئی۔پھاٹک پر سائن بورڈ تھا "اندر بھوشن ایڈووکیٹ" اب معلوم ہوا، وہ ان وکیل صاحب کی بیوی تھی۔پنڈت جی یہاں کے نامی وکیل تھے۔رما نے انہیں کئی بار دیکھا تھا، لیکن اتنے بڑے آدمی سے اس کے ذاتی مراسم کیا ہوتے، چھ مہینے پہلے وہ اس کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ کبھی وہ ان کے یہاں مدعو ہو گا، مگر جالپا کی بدولت وہ اعزاز بھی اسے حاصل ہو گیا۔اس وقت وہ شہر کے سب

سے بڑے وکیل کا مہمان تھا۔

رما نے سوچا تھا یہاں بہت سے آدمیوں کی دعوت ہو گی۔ مگر یہاں وکیل صاحب اور ان کی بیوی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ انہیں دیکھتے ہی باہر نکل آئی اور انہیں اندر لے جا کر اپنے شوہر سے ان کا تعارف کرایا۔ پنڈت جی نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے دونوں مہمانوں سے ہاتھ ملایا اور رما سے بولے۔ ''معاف کیجیے گا بابو صاحب میری طبیعت اچھی نہیں ہے، یہاں آپ کس دفتر میں ہیں؟''

رما نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں میونسپل آفس میں ہوں۔ ابھی حال ہی میں آیا ہوں۔ قانون کی طرف جانے کا ارادہ تھا لیکن یہاں نئے وکیلوں کی حالت دیکھ کر ہمت نہ پڑی۔''

رما نے اپنا وقار بڑھانے کے لیے تھوڑا سا جھوٹ بولنا ضروری سمجھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ اگر وہ صاف کہہ دیتا، میں پچیس روپے کا کلرک ہوں تو شاید وکیل صاحب اس سے ہم کلام ہونے میں اپنی توہین سمجھتے۔ مسکرا کر بولے۔ ''آپ نے بہت اچھا کیا جو ادھر نہیں آئے۔ دو چار سال کے بعد آپ کسی اچھے عہدے پر پہنچ جائیں گے۔ یہاں ممکن ہے تب تک آپ کو کوئی مقدمہ ہی نہ ملتا۔''

جالپا کو ابھی تک شبہ ہو رہا تھا کہ رتن وکیل صاحب کی لڑکی ہے یا بیوی؟ وکیل صاحب کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ چکنی چاند آس پاس کے سفید بالوں کے بیچ میں وارنش کی ہوئی لکڑی کی طرح چمک رہی تھی۔ مونچھیں صاف تھیں، لیکن ماتھے کے شکن اور گالوں کی جھریاں بتا رہی تھیں، مسافر منزل کے قریب پہنچ گیا ہے۔

مریض آرام کرسی پر لیٹے ہوئے وہ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے برسوں کا مریض ہو۔ ہاں رنگ گورا تھا، جو ساٹھ سال کی گرمی اور سردی کھا کر بھی نہ اڑ سکا تھا۔ اونچی ناک تھی۔ اونچی پیشانی اور بڑی بڑی آنکھیں، جن میں غرور لبریز تھا۔ اس کے برعکس رتن سانولی، ملیح اور بھرے ہوئے بدن کی عورت تھی۔ نہایت ملنسار اور خنداں پیشانی، جسے غرور چھو تک نہ گیا تھا۔ اس کی شکل میں حسن کی کوئی علامت نہ تھی۔ ناک چپٹی تھی۔ چہرہ گول۔ آنکھیں چھوٹی پھر بھی وہ رانی سی لگتی تھی۔ جالپا اس کے سامنے ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سورج مکھی کے سامنے جوہی کا پھول۔

چائے آئی۔ میوے، پھل، مٹھائی، برف کی قلفی سب میزوں پر چن دی گئی۔ رتن اور جالپا ایک میز پر بیٹھیں۔ دوسری میز رما اور وکیل صاحب کی تھی۔ رما اپنی جگہ پر جا بیٹھا، مگر وکیل صاحب ابھی آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔

رمانے مسکرا کر وکیل صاحب سے کہا۔ ''آپ بھی تو آئیے۔''

وکیل صاحب نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔ ''آپ شروع کیجیے، میں بھی آجاتا ہوں۔''

ان لوگوں نے چائے پی، پھل کھائے، مگر وکیل صاحب کے سامنے ہنستے بولتے رما اور جالپا دونوں ہی جھجکتے تھے۔ زندہ دل بوڑھوں کے ساتھ تو صحبت کا لطف اٹھایا جا سکتا تھا، لیکن ایسے روکھے، سرکہ جبیں بے جان آدمی جواں بھی ہوں تو دوسرے کو افسردہ دل بنا دیتے ہیں۔ وکیل صاحب نے بہت اصرار کرنے پر دو گھونٹ چائے پی۔ دور سے بیٹھے تماشا دیکھتے رہے۔ اس لیے جب رتن نے جالپا سے کہا۔ ''چلو ہم لوگ ذرا باغیچہ کی سیر کر آویں۔ ان دونوں صاحبوں کو قانون اور

اخلاق کی بحث کرنے دیں، تو گویا جالپا کے گلے کا پھندہ کھل گیا۔ رما نے پنجرے میں بند طائروں کی طرح ان دونوں کو کمرے سے نکلتے دیکھا اور ایک لمبی سانس لی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مصیبت اس کے سر آئے گی تو یہاں آنے کا نام نہ لیتا۔

وکیل صاحب نے منہ سکوڑ کر پہلو بدلا، اور بولے۔ ''معلوم نہیں کہ پیٹ میں کیا ہو گیا ہے کہ کوئی چیز ہضم ہی نہیں ہوتی۔ دودھ بھی ہضم نہیں ہوتا۔ چائے کو نہ جانے لوگ اتنے شوق سے پیتے ہیں۔ مجھے تو اس کی صورت سے نفرت ہے۔ پیتے ہی جسم میں اینٹھن سی ہونے لگتی ہے۔ اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں۔''

رما نے پوچھا۔ ''آپ نے ہاضمہ کی دوا نہیں لی؟''

وکیل صاحب نے بے رخانہ انداز سے کہا۔ ''دوائیوں پر مجھے ذرہ بھر بھی اعتبار نہیں۔ ان ویدوں اور ڈاکٹروں سے زیادہ کج فہم آدمی دنیا میں نہ ملیں گے۔ کسی میں بھی تشخیص کا مادہ نہیں۔ کبھی بھی ویدوں یا ڈاکٹروں کی تشخیص یکساں نہ ہو گی۔ علامتیں وہی ہیں۔ مگر ایک وید خون کا فساد بتلاتا ہے، دوسرا صفرا کا۔ ایک ڈاکٹر پھیپھڑے کا آماس بتلاتا ہے تو دوسرا معدے کا سرطان۔ بس قیاس سے دوا کی جاتی ہے اور بے رحمی سے مریضوں کی گردن پر چھری پھیری جاتی ہے۔ ان ڈاکٹروں نے تو اب تک مجھے جہنم میں پہنچا دیا ہوتا۔ پر کسی طرح ان کے پنجے سے نکل کر بھاگا۔ یوگ کے علم کی بڑی تعریف سنتا ہوں، لیکن ایسا مہاتما نہیں ملتا، جس سے کچھ سیکھ سکوں۔''

ادھر تو فن طب پر اعتراضات ہو رہے تھے اور ادھر دونوں حسینوں میں راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں۔ رتن نے مسکرا کر کہا

”وکیل صاحب کو دیکھ کر تمہیں بڑا تعجب ہوا ہوگا۔ میں ان کی دوسری بیوی ہوں۔ پہلی بیوی کو مرے پینتیس سال ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر پچیس سال کی تھی۔ لوگوں نے سمجھایا دوسری شادی کر لو۔ لیکن ایک لڑکا موجود تھا۔ شادی کرنے سے انکار کر دیا اور تیس سال تنہا رہے۔ مگر آج پانچ سال ہوئے، بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ تب دوسری شادی کی فکر ہوئی۔ میرے ماں باپ نہ تھے۔ ماموں نے میری پرورش کی تھی۔ کہہ نہیں سکتی کہ ان سے کچھ لے لیا یا ان کی شرافت پر ریجھ گئے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ ایشور کی یہی مرضی تھی۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ بس اگر کوئی شکایت ہے تو یہی کہ میں روز بروز موٹی ہوتی چلی جاتی ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تمہیں اولاد نہیں ہو سکتی۔ بہن! مجھے تو اولاد کی آرزو نہیں، لیکن وکیل صاحب نے اولاد کے لیے ہی شادی کی تھی۔ میری یہ حالت دیکھ کر انہیں بہت رنج ہوتا ہے۔ میں ہی ان کی ساری شکایتوں کی جڑ ہوں۔ آج ایشور مجھے ایک لڑکا دے دے، ان کے سارے روگ بھاگ جائیں۔ کتنا چاہتی ہوں کہ دبلی ہو جاؤں۔ گرم پانی سے ٹب اشنان کرتی ہوں۔ روز پیدل گھومنے جاتی ہوں۔ گھی، دودھ بہت کم کھاتی ہوں۔ خوراک بھی کم کر دی ہے۔ جتنی محنت کر سکتی ہوں، کرتی ہوں۔ پھر بھی دن بدن موٹی ہوتی جاتی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟“

جالپا نے پوچھا۔ ”وکیل صاحب تم سے ناراض رہتے ہوں گے؟“

رتن نے کہا۔ ”نہیں بہن بالکل نہیں۔ کبھی بھول کر بھی مجھ سے اس کا چرچا نہیں کیا۔ شکایت کا کبھی ایک حرف بھی میں نے ان کی زبان سے نہیں سنا۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ فکر انہیں گلائے ڈالتی ہے۔ اپنا کوئی قابو نہیں ہے۔ کیا کروں؟ میں

جتنا چاہوں خرچ کروں جیسے چاہوں رہوں، کبھی نہیں بولتے۔ جو کچھ پاتے ہیں، لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے کئی بار کہا کہ اب تمہیں وکالت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آرام کیوں نہیں کرتے؟ مگر ان سے بیٹھے رہا نہیں جاتا۔ صرف دو چپاتیوں سے ناتا ہے۔ میں نے بہت ضد کی تو دو چار دانے انگور کے کھا لیے۔ مجھے تو ان پر رحم آتا ہے۔ جو خدمت اپنے امکان میں ہے، وہ کرتی ہوں۔ آخر وہ میرے ہی لیے تو اپنی جان کھپا رہے ہیں۔''

جالپا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''ایسے نیک نفس آدمی کو تو دیوتا سمجھنا چاہیے۔ تیس سال تک تنہا رہنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔''

رتن: ''ہاں بہن! ہیں تو دیوتا ہی۔ اب بھی کبھی پہلی بیوی کی یاد آ جاتی ہے تو رونے لگتے ہیں۔ دیکھنے میں جتنے روکھے معلوم ہوتے ہیں، اندر سے اتنے ہی نرم ہیں۔ یتیموں اور بیواؤں کے وظیفے باندھ رکھے ہیں۔ تمہارا یہ کنگن تو بڑا خوشنما ہے۔''

جالپا: ''ہاں، ہوشیار کاریگر نے بنایا ہے۔''

رتن: ''میں تو یہاں کسی کو جانتی نہیں۔ وکیل صاحب کو تکلیف دینے کو جی نہیں چاہتا۔ معمولی سناروں سے بنواتے ڈر لگتا ہے۔ نہ جانے کیا ملا دیں۔ تم اپنے بابو جی سے میرے لیے ایسا ہی ایک جوڑا کنگن بنوا دو۔''

جالپا نے کنگن بنوانے کا وعدہ کیا۔

رتن: ''آج تمہارے آنے سے طبیعت بہت خوش ہوئی۔ دن بھر اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ کس کے پاس جاؤں؟ دو ایک عورتوں سے راہ و رسم بڑھائی۔ چاہا کہ

ان سے بہناپا جوڑوں، لیکن ان کے رنگ ڈھنگ دیکھ دیکھ کر ان سے دور رہنا ہی اچھا معلوم ہوا۔ شوق کی چیزوں پر ایسا ٹوٹتی تھیں کہ دیکھ کر شرم آتی تھی۔ تم گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے روز چلی آیا کرو۔''

جالپا: ''واہ یہ تو میرے دل کی بات ہوئی۔''

رتن: ''میں موٹر بھیج دیا کروں گی۔''

''کیا ضرورت ہے؟ تانگے تو ملتے ہی ہیں؟''

''نہ جانے کیوں تمہیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا؟ تمہیں پا کر رماناتھ اپنی تقدیر کو سراہتے ہوں گے؟''

جالپا مسکرا کر بولی۔ ''تقدیر تو نہیں سراہتے، گھر کیاں جمایا کرتے ہیں۔''

اسی اثنا میں رماناتھ بھی وہاں آ پہنچا۔ جالپا نے اس سے کنگن کا ذکر کیا۔

رماناتھ نے سرخرو ہونے کا موقع پا کر کہا۔ ''ہاں بنوا دوں گا۔ اس سے بہت اچھے بن سکتا ہے۔''

رتن نے پوچھا۔ ''اس جوڑے کے کیا لیے تھے؟''

جالپا: ''آٹھ سو کے تھے۔''

رتن: ''کوئی ہرج نہیں۔ مگر بالکل ایسے ہی ہوں۔ اسی نمونے کے۔''

رما: ''ہاں، بنوا دوں گا۔''

رتن: ''مگر بھائی ابھی میرے پاس روپے نہیں ہیں۔''

روپے کے معاملے میں عورتوں کے سامنے مردوں کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ کیا وہ کہہ سکتا تھا، اس وقت میرے پاس بھی روپے نہیں ہیں۔ یہ عذر وہ کسی حالت

میں بھی نہ کر سکتا تھا۔ چاہے اسے دوسروں سے قرض لینا پڑے۔ دوسروں کی خوشامد کرنی پڑے، مگر ایک حسینہ کے روبرو اپنی مجبوری کا اظہار نہ کرے گا۔ شاید اس نے کوئی عذر کیا ہوتا تو جالپا کو بھی برا معلوم ہوتا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں حضرت عذر نہ کر بیٹھیں، اس لیے جب رما نے دلیرانہ انداز سے کہا کہ روپے کی کوئی بات نہیں، جب چاہے دے دیجیے تو وہ خوش ہو گئی۔

رتن: ''تو کب تک امید کروں؟''

رما: ''میں آج ہی صراف سے کہہ دوں گا، زیادہ سے زیادہ دو ہفتے سمجھیے۔''

جالپا نے رتن کو اپنے گھر چائے کی دعوت دی اور دونوں گلے مل کر بدا ہوئیں۔ گھر پہنچے تو شام ہو گئی تھی۔ رمیش بابو بیٹھے ہوئے تھے۔ جالپا تو اتر کر اندر چلی گئی۔ رما، رمیش بابو کے پاس جا کر بولا۔ ''آپ کو آئے ہوئے دیر ہوئی؟''

رمیش: ''ابھی تو چلا آ رہا ہوں۔ وکیل صاحب کے یہاں دعوت تھی؟''

رما: ''جی ہاں، تین روپے کی چپت پڑ گئی۔''

رمیش: ''کوئی ہرج نہیں، یہ روپے وصول ہو جائیں گے۔ بڑے آدمیوں سے راہ و رسم پیدا ہو جائے تو بڑے بڑے کام نکلتے ہیں۔''

رما: ''اب کی اتوار کو انہیں بھی چائے کی دعوت دے آیا ہوں۔''

رمیش نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ''تب تو یہ کہو کہ تم سے یارانہ ہو گیا۔ کہو تو میں بھی آ جاؤں۔ سنا ہے وکیل صاحب کے ایک بھائی انجینئر ہیں۔ میرے ایک سالے بہت دنوں سے بیکار بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر وکیل صاحب اس کی سفارش کر دیں تو غریب کو جگہ مل جائے، تم ذرا انٹروڈکشن کرا دینا۔ باقی اور سب میں کرا لوں گا۔

پارٹی کا انتظام ایشور نے چاہا تو ایسا ہو گا کہ وہ لوگ خوش ہو جائیں گے۔ سارا انتظام میرے اوپر چھوڑ دو۔ نہ قلی کی ضرورت، نہ مزدور کی، انہیں موسل چند کو پھانسوں گا۔''

رما: ''ابھی دو تین مہینے ہوئے۔ آپ نے انہیں ایک جگہ تو دلا دی تھی؟''

رمیش: ''اجی ابھی چھ اور باقی ہیں۔ پورے سات آدمیوں کی پلٹن ہے۔ ذرا بیٹھ جاؤ ضروری چیزوں کی فہرست بنالی جائے۔ کتنے مہمان ہوں گے۔''

رما: ''بس وکیل صاحب ہوں گے اور ان کی بیوی۔''

رمیش: ''یہ بہت اچھا کیا۔ اس طرح اپنے عرض حال کا اچھا موقع رہے گا۔ دونوں آدمیوں نے بیٹھ کر ایک لمبی فہرست تیار کی اور دوسرے ہی دن سے رمیش بابو نے سامان بہم پہنچانا شروع کیا۔ ان کی رسائی اچھے اچھے گھروں میں تھی۔ آرائش کی ایسی نفیس چیزیں فراہم کر کے لائے کہ سارا گھر جگمگا اٹھا۔ منشی دیانا تھ بھی ان تیاریوں میں شریک تھے۔ چیزوں کو قرینے سے سجانا ان کا کام تھا۔ کون سا گملا کہاں رکھا جائے۔ کونسی تصویر کہاں لٹکائی جائے۔ کون سا قالین کہاں بچھایا جائے۔ ان مسائل پر تینوں آدمیوں میں گھنٹوں مناظرے ہوئے تھے۔ دفتر جانے سے پہلے اور دفتر سے آنے کے بعد تینوں اسی کام میں لگ جاتے۔ ایک دن اسی بات پر بحث چھڑ گئی کہ کمرے میں آئینہ کہاں رکھا جائے۔ ان مسائل پر تینوں اسی کام میں لگ جاتے۔ دینا ناتھ کہتے تھے کہ اس کمرے میں آئینے کی ضرورت نہیں۔ آئینہ پیچھے والے کمرے میں رکھنا چاہیے۔ رمیش کو اس سے اختلاف تھا اور رما دبدھے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ نہ ان کی سی کہہ سکتا تھا، نہ ان کی سی سن سکتا تھا۔

دیانا تھ نے گرم ہو کر کہا۔ ''میں نے سینکڑوں انگریزوں کے ڈرائنگ روم دیکھے ہیں، مگر کہیں آئینہ نہیں دیکھا۔ آئینہ غسل خانے میں رکھنا چاہیے۔ یہاں آئینہ رکھنا بے تکی سی بات ہے۔''

رمیش نے اتنی سرگرمی سے جواب دیا۔ ''مجھے اتنے انگریزوں سے سابقہ تو نہیں پڑا، لیکن دو چار بنگلے دیکھے ضرور ہیں اور ان میں آئینہ لگا ہوا دیکھا۔ پھر اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ ہر ایک بات میں انہی کی نقل کریں؟ ہم انگریز نہیں، ہندوستانی ہیں۔ ہندوستانی رؤسا کے کمرے میں بڑے بڑے قد آدم آئینے لگے ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ نے ہمارے بگڑے ہوئے بابوؤں کی سی بات کہی، جو آرائش ولباس میں رفتار وگفتار میں، چائے وشراب میں غرض نمائش کی سبھی باتوں میں انگریزوں کا منہ چڑاتے ہیں، لیکن جن باتوں نے انگریزوں کو انگریز بنا دیا ہے اور جن کی بدولت وہ دنیا پر حکومت کرتے ہیں، ان کی ہوا تک نہیں لگنے دیتے۔ کیا آپ کو بھی بڑھاپے میں انگریز بننے کا شوق چرایا ہے؟''

دیانا تھ انگریزوں کی نقل کو بہت معیوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کوٹ نہیں پہنا تھا۔ چائے پیتے تھے، مگر چینی کے سیٹ کی قید نہ تھی۔ کٹورا، کٹوری، گلاس لوٹا، تسلا غرض کسی سے بھی اعتراض نہ تھا۔ لیکن اس وقت تو انہیں بحث کی دھن سوار تھی۔ بولے۔ ''ہندوستانی رئیسوں کے کمروں میں میز کرسیاں نہیں ہوتیں۔ فرش ہوتا ہے۔ آپ نے کرسی میز لگا کر اسے انگریزی طرز پر تو سجا دیا۔ آپ آئینہ کے ذریعے ہندوستان کی مثال لے رہے ہیں یا ہندوستانی رکھیے یا انگریزی۔ یہ کیا کہ آدھا تیتر، آدھا بٹیر۔ کوٹ پتلون پر چوگوشیہ ٹوپی تو اچھی نہیں

معلوم ہوتی۔''

رمیش بابو نے سمجھا تھا کہ دیاناتھ لاجواب ہو جائیں گے، لیکن یہ جواب سنا تو چکرا گیا۔ میدان ہاتھ سے جاتا ہوا دکھائی دیا، بولے۔ ''تو آپ نے کسی انگریز کے کمرے میں آئینہ نہیں دیکھا۔ بھلا ایسے دس پانچ انگریزوں کے نام تو بتایئے۔''

''ایک آپ کا ہی کرنٹا ہیڈ کلرک ہے، اس کے سوا اور کسی انگریز کے کمرے میں تو آپ نے قدم بھی رکھا ہوگا۔ اس کرنٹے کو آپ نے انگریزی مذاق کا نمونہ سمجھ لیا۔ خوب مانتا ہوں۔''

دیاناتھ کچھ خفیف ہو کر بولے۔ ''یہ تو آپ کی زبان ہے۔ اسے کرنٹا چڑ ریشن، پلپلی جو چاہیں کہیں، لیکن رنگ کو چھوڑ کر وہ کسی بات میں انگریزوں سے کم نہیں۔''

رمیش اس کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک موٹر کار دروازے پر آ کر رکی اور رتن برآمدے میں داخل ہوئی۔ تینوں آدمی چٹ پٹ باہر نکل آئے۔ رما کو اس وقت رتن کا آنا برا معلوم ہوا۔ ڈر رہا تھا کہ کہیں کمرے میں نہ چلی جائے۔ نہیں تو ساری قلعی کھل جائے۔ آگے بڑھ کر ہاتھ ملاتا ہوا بولا:

''آیئے! یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے دوست رمیش بابو ہیں'' لیکن ان دونوں بھلے آدمیوں نے اس سے ہاتھ ملایا اور نہ اپنی جگہ سے ہلے۔ رتن نے بھی ان سے ہاتھ ملانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ دور ہی سے نمسکار کر کے رما سے بولی:

''میں بیٹھوں گی نہیں۔ اس وقت فرصت نہیں ہے۔ آپ سے کچھ کہنا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ رما کے ساتھ موٹر تک آئی اور آہستہ سے بولی:

''آپ نے صراف سے تو کہہ دیا ہوگا۔''

رما نے برجستہ کہا: ''جی ہاں، بنارہا ہے۔''

رتن: ''اس دن میں نے کہا تھا کہ روپے نہ دے سکوں گی۔ پھر خیال آیا، آپ کو تکلیف ہوگی۔ اس لیے روپیہ کا انتظام کر لیا۔ آٹھ سو چاہیے نا؟''

جالپا نے کنگن کے دام آٹھ سو بتائے تھے۔ رما چاہتا تو اتنے روپے لے سکتا تھا، لیکن رتن کی سادگی اور بے تکلفی نے جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بیوپاریوں سے دو دو چار آنے لیتے ذرا بھی نہ جھجکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب بھی گاہکوں کو مونڈتے ہیں۔ ایسوں کے ساتھ اسے اپنے طرز عمل میں کسی طرح تامل نہ ہوتا تھا، لیکن اس شرافت اور اخلاق کی دیوی سے دغا کرنے کے لیے کسی پرانے پاپی کی ضرورت تھی۔ کچھ شرماتا ہوا بولا:

''کیا جالپا نے کنگن کے دام آٹھ سو بتلائے تھے۔ انہیں شاید یاد نہ رہی ہوگی۔ ان کے کنگن چھ سو کے ہیں۔ آپ چاہیں تو آٹھ سو کے بنوا دوں۔''

رتن: ''نہیں مجھے تو وہی پسند ہے، آپ چھ سو کا ہی بنوائیے۔''

اس نے موٹر میں سے اپنی تھیلی اٹھا کر سو سو روپے کے چھ نوٹ نکالے۔ رما نے کہا:

''ایسی جلدی کیا تھی، چیز تیار ہو جاتی تو حساب ہو جاتا؟''

رتن نے موٹر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس خرچ ہو جاتے اس لیے میں نے سوچا آپ کے سر پر لاد آویں۔ میری عادت ہے کہ جو کام کرتی ہوں، جلد سے جلد کر ڈالتی ہوں۔ تاخیر سے مجھے الجھن ہوتی ہے۔''

موٹر چلی گئی۔ رما روپیہ لیے اندر چلا گیا تو دونوں بڈھوں میں باتیں ہونے

لگیں۔

رمیش: ''دیکھا؟''

دیانا تھ: ''آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اب میرے گھر میں بھی یہی لہر آ رہی ہے۔''

رمیش: ''میں تو اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ آج کل ایسی ہی عورتوں کا کام ہے۔ ضرورت پڑنے پر کچھ مدد تو کر سکتی ہیں۔ بیمار پڑ جاؤ تو ڈاکٹر کو تو بلا سکتی ہیں۔ یہاں تو چاہے مر بھی جائیں لیکن مجال کہ عورت گھر سے پاؤں نکالے۔''

دیانا تھ: ''ہم سے تو بھائی یہ انگریزیت نہیں دیکھی جاتی۔ کیا کریں اولاد کی محبت ہے، نہیں تو یہی جی چاہتا ہے کہ رما سے صاف کہہ دوں بھیا! اپنا گھر الگ لے کر رہ۔ آنکھ پھوٹی پیڑ گئی۔ دیکھ ایک دن یہ عورت وکیل صاحب کو دغا دے گی۔''

رمیش: ''آپ یہ کیوں مان لیتے ہیں کہ جو عورت باہر آتی جاتی ہے وہ ضرور خراب ہے، مگر رما ناتھ کو مانتی بہت ہے۔ روپے نہ جانے کیوں دیئے؟''

دیانا تھ: ''مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔ رما کہیں اس سے کوئی چال نہ چل رہا ہو؟''

رما اندر سے آ رہا تھا۔ یہ آخری جملہ اس کے کان میں پڑ گیا۔ ترش ہو کر بولا۔ ''جی ہاں! ضرور چال چل رہا ہوں۔ اسے دھوکہ دے کر روپے اینٹھ رہا ہوں۔ یہی تو میرا پیشہ ہے۔''

دیانا تھ نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''تو اتنا بگڑتے کیوں ہو؟ میں نے تو کوئی

ایسی بات نہیں کہی۔''

رما: ''جعلساز بنا دیا اور زیادہ کیا کہتے۔ آخر آپ کے دل میں ایسا شبہ کیوں آیا؟ آپ نے مجھ میں کون سی ایسی برائی دیکھی جس سے یہ خیال پیدا ہوا؟ میں ذرا صاف ستھرے کپڑے پہنتا ہوں۔ ذرا نئی تہذیب کا پیرو ہوں۔ اس کے سوا آپ نے مجھ میں کون سی برائی دیکھی، جس سے یہ خیال پیدا ہوا میں جو کچھ خرچ کرتا ہوں، ایمانداری کے ساتھ کما کر خرچ کرتا ہوں۔ جس دن دھوکے اور فریب کی نوبت آئے گی، زہر کھا کر جان دے دوں گا۔ ہاں یہ بات ہے کہ کسی کو خرچ کرنے کی تمیز ہوتی ہے، کسی کو نہیں ہوتی۔ جب آپ کے دل میں میرے متعلق ایسے شبہے پیدا ہونے لگے تو میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ میں کالک لگا کر کہیں نکل جاؤں۔ رمیش بابو یہاں موجود ہیں، آپ میری غیبت میں میرے متعلق جو کچھ چاہیں ان سے پوچھ سکتے ہیں۔ یہ میری خاطر جھوٹ نہ بولیں گے۔''

رما نے یہ الفاظ کچھ اس صداقت انگیز جوش کے ساتھ کہے کہ منشی دیاناتھ کے سارے شبہات حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ نادم ہو کر بولے۔ ''تمہارا بڑھتا ہوا خرچ دیکھ کر میرے دل میں شبہ ہوا تھا۔ میں اسے چھپاتا نہیں، لیکن جب تم کہہ رہے ہو کہ تمہاری نیت صاف ہے تو مجھے اطمینان ہے۔ میری صرف یہی منشا ہے کہ میرا لڑکا چاہے غریب رہے، مگر نیت درست رکھے۔''

رمیش نے مسکرا کر کہا۔ ''اچھا یہ قصہ تو ہو چکا۔ اب یہ بتاؤ اس نے تمہیں روپے کیوں دیئے؟''

رما: ''ٹھگ لایا ہوں۔''

رمیش: ''مجھ سے شرارت کرو گے تو کان پکڑ لوں گا۔ اگر ٹھگ ہی لائے ہو تو بھی میں تمہاری پیٹھ ٹھونکوں گا۔ جیتے رہو۔ خوب ٹھگو لیکن آبرو پر آنچ نہ آنے پائے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ایشور سے تو میں ڈرتا نہیں، وہ جو کچھ پوچھے گا اس کا جواب میرے پاس موجود ہے۔ مگر آدمی سے ڈرتا ہوں۔ سچ بتاؤ کس لیے روپے دیئے۔ کچھ دال ملنے والی ہو تو مجھے بھی شریک کر لینا۔''

رما نے اس طرح منہ بنا کر کہا گویا کوئی ناگوار فرض اس کے سر پر ڈال دیا گیا ہے۔ ''ایک کنگن بنوانے کو کہہ گئی ہیں۔''

رمیش: ''تو چلو میں ایک اچھے صراف سے بنوا دوں، مگر یہ جھنجھٹ تم نے برا مول لیا۔ عورتوں سے ایشور بچائے۔ تم چاہے دس پانچ روپے اپنے پاس سے ہی خرچ کر دو۔ وہ یہی سمجھیں گی کہ مجھے لوٹ لیا۔''

ذرا دیر بعد رما اندر جا کر جالپا سے بولا۔ ''رتن دیوی کنگن کے روپے دے گئیں۔ تم نے شاید آٹھ سو بتائے تھے۔ میں نے چھ سو لے لیے۔''

جالپا نے سر جھکا کر کہا۔ ''میں نے تو دل لگی کی تھی۔''

جالپا نے اس طرح اپنی صفائی تو دے دی، لیکن بہت دیر تک اس کا دل اسے ملامت کرتا رہا۔ رما نے اگر آٹھ سو روپے لے لیے ہوتے تو شاید وہ اپنی کامیابی پر خوش ہوئی ہوتی، لیکن رما کی حق شناسی نے اس کے ضمیر کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ پچھتا رہی تھی۔ ناحق جھوٹ بولی۔ مجھے دل میں کتنا حقیر سمجھ رہے ہوں گے اور رتن نے دغا باز سمجھ ہی لیا۔

چائے پارٹی میں کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ رتن کے ساتھ ان کی ایک رشتہ کی بہن اور تھی۔ وکیل صاحب نہ آئے تھے۔ دیاناتھ نے اتنی دیر کے لیے وہاں سے ٹل جانا ہی مناسب سمجھا۔ ہاں رمیش بابو برآمدے کے برابر کھڑے رہے۔ جالپا کی موجودگی میں وہ پارٹی میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔

جالپا نے دونوں مہمانوں کو اپنی ساس سے ملایا۔ جاگیشری کو وہ دونوں ضرورت سے زیادہ بے تکلف معلوم ہوئیں۔ ان کا سارے گھر میں دوڑنا۔ دھم دھم کر کے کوٹھے پر جانا۔ چھت پر ادھر ادھر اچکنا۔ قہقہے مار مار کر ہنسنا، انہیں ہڑدنگا پن معلوم ہوتا تھا۔ ان کے آئین اخلاق میں بہو بیٹیوں کو متین اور شرمیلی ہونا چاہیے تھا۔ تعجب یہ تھا کہ جالپا بھی آج انہی میں مل گئی تھی۔

ابھی تک رما کو پارٹی کی تیاریوں میں سے اتنی فرصت نہیں ملی تھی کہ گنگو کی دکان پر جاتا۔ اس نے سمجھا تھا گنگو کو چھ سو روپے پچھلے حساب میں دے کر نئے کنگن بنوا لوں گا۔ اس طرح میرا وقار جم جائے گا۔

دوسرے دن رما خوش ہوتا ہوا گنگو کی دکان پر پہنچا اور رعب سے بولا۔ ''کیا رنگ ڈھنگ ہیں مہاراج! کوئی نئی چیز بنوائی ہے؟'' ادھر رما کے ٹال مٹول سے گنگو اتنا بے دل ہو رہا تھا کہ آج کچھ روپے ملنے کی امید بھی اسے خوش نہ کر سکی۔ شکوہ آمیز انداز سے بولا۔ ''بابو صاحب چیزیں کتنی بنیں بکیں۔ آپ نے تو دکان پر آنا ہی چھوڑ دیا۔ اس طرح کی دکانداری ہم نہیں کرتے۔ آٹھ مہینے ہوئے، آپ کے یہاں سے ایک پیسہ بھی نہیں ملا۔''

رما: ''بھائی خالی ہاتھ دکان پر آتے شرم آتی تھی۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں

ہیں جس سے تقاضا کرنا پڑے۔ آج یہ چھ سو روپے جمع کر لو اور ایک جوڑا اچھا کنگن تیار کر دو۔''

گنگو نے روپے لے کر صندوق میں رکھے اور بولا۔ ''بن جائیں گے تو باقی روپے کب ملیں گے؟''

رما: ''بہت بہت جلد۔''

گنگو: ''ہاں بابو جی، پچھلا حساب صاف کر دیجیے۔''

گنگو نے وعدہ تو کر لیا لیکن ایک بار دھوکہ کھا چکا تھا۔ دوبارہ کسی علت میں پھنستے ہوئے ڈرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رما روز تقاضا کرتا اور گنگو روز حیلے کر کے ٹالتا۔ کبھی اس کا کاریگر بیمار پڑ جاتا۔ کبھی اس کے لڑکے بیمار پڑ جاتے۔ ایک مہینہ گزر گیا اور کنگن نہ بنے۔ اس کے تقاضوں کے ڈر سے رما نے پارک میں جانا چھوڑ دیا۔ مگر رتن نے گھر تو دیکھ ہی لیا تھا۔ اس ایک مہینے میں کئی بار تقاضا کرنے آئی۔ آخر جب ساون کا مہینہ آ گیا تو اس نے ایک دن رما سے کہا۔ ''جب وہ بدمعاش نہیں بنا کر دیتا تو تم کسی دوسرے کاریگر کو کیوں نہیں دیتے؟''

رما نے کہا۔ ''اس پاجی نے ایسا دھوکا دیا کہ کچھ نہ پوچھیے اور آج کل کیا کرتا ہے۔ میں نے بڑی غلطی کی جو اسے پیشگی روپے دے دیئے۔''

رتن: ''آپ مجھے اس کی دکان دکھا دیجیے۔ میں اس کے باپ سے وصول کر لوں گی۔ ایسے بے ایمان آدمی کو پولیس میں دینا چاہیے۔''

جالپا نے تائید کی۔ ''ہاں اور کیا۔ حیلے حوالے تو سبھی کرتے ہیں مگر ایسا نہیں کہ روپے ڈکار جائیں اور چیز کے لیے مہینوں دوڑائیں۔''

رما نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ دس دن اور صبر کریں۔ میں آج ہی اس سے روپے لے کر کسی دوسرے صراف کو دے دوں گا۔''

رتن: ''آپ مجھے اس بدمعاش کی دکان کیوں نہیں دکھا دیتے۔ میں ہنٹر سے بات کروں گی۔''

رما: ''کہتا تو ہوں، دس دن کے اندر آپ کو کنگن مل جائیں گے۔''

رتن: ''آپ خود ہی ڈھیلے آدمی ہیں۔ اس کے جھانسوں میں آجاتے ہیں۔ آپ ایک بار سخت پڑ جاتے تو مجال تھی یوں حیلے حوالے کرتا۔''

آج رتن بڑی مشکل سے رخصت ہوئی، مگر گنگو نے صاف جواب دے دیا۔ جب تک آدھے روپے پیشگی نہ مل جائیں، کنگن نہیں بن سکتے اور پچھلے حساب کا بیباق ہونا لازمی تھا۔

رما کو جیسے گولی لگ گئی۔ بولا۔ ''مہاراج یہ تو شرافت نہیں ہے۔ یہ میرے ایک دوست کی فرمائش ہے۔ میں نے ان سے دس دن کا وعدہ کیا تھا۔ سوچو میں انہیں کیا منہ دکھاؤں گا۔ مجھ سے پرونوٹ لکھا لو، اسٹامپ لکھا لو اور کیا کرو گے؟''

گنگو: ''پرونوٹ کو شہد لگا کر چاٹوں گا؟ آٹھ آٹھ مہینے کا ادھار نہیں ہوتا۔ آپ تو بڑے آدمی ہیں۔ آپ کے لیے پانچ چھ سو روپے کون سی بڑی بات ہے۔ روپے لائیے کنگن لے جائیے۔''

رما نے دانت پیس کر کہا۔ ''اگر یہ بات تھی تو تم نے ایک مہینہ پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا؟''

گنگو: ''میں کیا جانتا تھا، آپ اتنا بھی نہیں سمجھ رہے ہیں۔'' رما مایوس ہو کر گھر

لوٹ آیا، مگر اس وقت بھی اس نے سارا قصہ جالپا سے صاف صاف کہہ دیا ہوتا تو اسے چاہے کتنا ہی صدمہ ہوتا، اپنے کنگن اس کے حوالے کر دیتی، لیکن رما اتنا صاف گو نہ تھا۔ اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کر کے وہ اسے تشویش میں نہ ڈالنا چاہتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ رما کو سو روپے اوپر سے مل جاتے تھے اور وہ کفایت کرنا چاہتا تو ان آٹھ مہینوں میں دونوں صرافوں کے آدھے آدھے روپے ادا کر دیتا، لیکن اوپر کی آمدنی تھی تو اوپر کا خرچ بھی۔ کوڑیوں سے روپے بنانا بیوپاریوں کا کام ہے۔ بابو لوگ تو روپے کی کوڑیاں ہی بناتے ہیں۔

شام کو رما نے پھر ایک بار صرافے کا چکر لگایا۔ بہت چاہا کہ کسی صراف کو جھانسا دوں مگر کہیں دال نہ گلی۔ بازار میں تار کی خبریں چلا کرتی ہیں۔

رما کو رات بھر نیند نہ آئی۔ اگر آج کوئی مہاجن ایک ہزار کا اسٹامپ لکھا کر اسے پانچ سو روپے دے دیتا تو وہ اپنے کو خوش نصیب سمجھتا، مگر ایسے کسی مہاجن سے اس کا لین دین نہ تھا۔ اپنے ملنے والوں میں اس نے سبھی سے ہوا باندھ رکھی تھی۔ ان کی تواضع اور تکریم میں بے دریغ روپیہ خرچ کرتا تھا۔ اب کس منہ سے اپنی داستان غم کہے۔ وہ پچھتا رہا تھا کہ ناحق گنگو کو روپے دیے۔ گنگو نالش کرنے تو جاتا نہ تھا۔ اس وقت اگر رما کو کوئی عارضہ ہو جاتا تو وہ اس کا خیر مقدم کرتا۔ کم سے کم دس پانچ دن کی مہلت تو مل جاتی۔

مگر بلانے سے موت بھی نہیں آتی۔ وہ تو اسی وقت آتی ہے جب ہم اس کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ایسا کوئی دوست بھی نظر نہیں آتا تھا، جو اس کے نام فرضی تار

بھیج دے اور وہ یہاں سے کچھ دنوں کے لیے چلا جائے۔

وہ انہی تر ددات میں کروٹیں بدل رہا تھا کہ جالپا کی آنکھ کھل گئی۔ رما نے فوراً چادر تان لی۔ گویا بےخبر سو رہا ہے۔

جالپا نے چادر آہستہ سے اٹھا کر اس کا منہ دیکھا۔ نیند اور بیداری کا فرق اس سے چھپا نہ رہا۔ اسے ہلا کر بولی:

"کیا ابھی تک جاگ رہے ہو؟"

رما نیند کا بہانہ نہ کر سکا۔ "نہ جانے نیند کیوں نہیں آ رہی ہے۔ پڑے پڑے سوچتا تھا، کچھ دنوں کے لیے کہیں باہر چلا جاؤں اور کچھ روپے کما لاؤں۔"

"مجھے بھی لیتے چلو گے نا؟"

"تمہیں پردیس میں کہاں کہاں لیے پھروں گا؟"

"تو میں اکیلی رہ چکی۔ ایک منٹ نہ رہوں گی، مگر جاؤ گے کہاں؟"

"ابھی کچھ فیصلہ نہیں کر سکا۔"

"تو سچ مچ تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ مجھ سے تو ایک دن نہ رہا جائے گا۔ میں سمجھ گئی، تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔"

"تمہارتی محبت کی زنجیر ہی نے مجھے باندھ رکھا ہے۔ نہیں تو اب تک کبھی کا چلا گیا ہوتا۔"

"باتیں بنا رہے ہو۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہوتی تو مجھ سے کوئی پردہ نہ رکھتے۔ تمہارے دل میں ضرور کوئی ایسی بات ہے، جو تم مجھ سے چھپا رہے ہو۔ میں تمہیں کئی دنوں سے ہر وقت متفکر دیکھتی ہوں۔ جہاں اعتبار نہیں ہے، وہاں

محبت کیسے رہ سکتی ہے؟''

''یہ تمہارا شبہ ہے جالپا۔ میں نے تو تم سے کبھی پردہ نہیں کیا۔''

''تو تم مجھے سچ مچ دل سے چاہتے ہو؟''

''یہ کیا، جب منہ سے کہوں گا، جب ہی۔''

''اچھا میں ایک سوال کرتی ہوں۔تم مجھے کیوں چاہتے ہو؟ سچ بتانا؟''

''یہ تو بالکل مہمل سوال ہے۔اگر میں تم سے یہی سوال پوچھتا تو تم کیا جواب دیتیں؟''

''میں تو بالکل جانتی ہوں۔''

''بتاؤ؟''

''پہلے تم بتلا دو۔''

''میں تو جانتا ہی نہیں۔صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم میرے وجود کے ایک ایک ذرے میں بسی ہوئی ہو۔''

''سوچ کر بتاؤ۔ میں اپنے عیبوں سے واقف ہوں۔ میں نے اب تک تمہاری کوئی خدمت نہیں کی۔خوش قسمتی سے اب تک مجھے تمہارے لیے کوئی قربانی کی ضرورت نہیں پڑی۔گھر کے کام دھندے مجھے آتے نہیں، جو کچھ سیکھا یہاں سیکھا۔بات چیت کرنے کا مجھے سلیقہ نہیں۔اتنی حسین بھی نہیں ہوں۔پھر تمہیں مجھ سے کیوں محبت ہے؟''

رمانے سر کھجلاتے ہوئے کہا:

''میں کچھ نہیں جانتا۔ایمان سے کہتا ہوں، تم میں کوئی عیب ہے یا کوئی خامی

ہے۔ یہ بات آج تک میرے ذہن میں نہیں آئی، لیکن تم نے مجھ میں کون سی بات دیکھی؟ نہ میرے پاس دولت ہے نہ علم ہے، نہ صورت، بتلاؤ تو پھر؟''

جالپا نے محبت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''بتلا دوں؟ تم بہت نیک ہو۔ جب میں یہاں آئی تو کوئی بات کہتے یا کرتے مجھے خوف ہوتا تھا۔ تم اسے پسند کرو گے یا نہیں۔ اب مجھے اس بات کا یقین رہتا ہے کہ تم مجھ سے ناراض نہ ہو گے۔ اگر تمہارے عوض میری شادی کسی دوسرے آدمی سے ہوئی ہوتی، تو میں اس کے ساتھ بھی اسی طرح رہتی۔ یہ تو شوہر اور بیوی کا رواجی رشتہ ہے، لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ رواجی رشتہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب تو میں تمہیں گوپیوں کے کرشن سے بھی نہ بدلوں گی، لیکن تمہیں اب بھی مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔''

رما نے سر نیچا کر کے کہا۔ ''تمہارا الزام بے جا ہے۔ جالپا میں دوستوں سے بھی کوئی پردہ نہیں رکھتا۔ پھر تم سے کیا پردہ رکھوں گا۔''

رما کے جی میں ایک بار پھر آیا کہ اپنی پریشانیوں کی سرگزشت کہہ سنائے، لیکن جھوٹی خودداری نے پھر اس کی زبان بند کر دی۔

جالپا اس سے پوچھتی صرافوں کو روپے دیئے جاتے ہو کہ نہیں، تو وہ برابر کہتا ہاں کچھ نہ کچھ ہر مہینے دیتا جاتا ہوں، لیکن آج رما کی فکرمندی نے اس کے دل میں ایک شبہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ اسی شبہ کو مٹانا چاہتی تھی۔ ذرا دیر بعد اس نے پوچھا۔ ''صرافوں کو روپے تو ابھی روانہ ہوئے ہوں گے۔''

''اب تھوڑے ہی باقی ہیں۔''

''کتنے باقی ہوں گے، کچھ حساب کتاب لکھتے ہو؟''

''ہاں لکھتا کیوں نہیں، سات سو سے کچھ کم ہی ہوں گے۔''

''تم نے کہیں رتن کے روپے تو صرافوں کو نہیں دے دیئے؟''

رما کا دل کانپ رہا تھا۔کہیں جالپا رتن کے روپوؤں کا ذکر نہ کر بیٹھے۔آخر وہ وار اس کے سر پر آ ہی گیا۔

اس وقت بھی اگر رما نے ہمت کر کے سارا واقعہ بیان کر دیا ہوتا تو اس کی پریشانیوں کا خاتمہ ہو جاتا۔جالپا ایک منٹ تک ضرور سکتے میں آ جاتی۔ممکن ہے غصہ اور مایوسی کے عالم میں اس کی زبان سے دو چار کڑی باتیں بھی نکل جاتیں، لیکن پھر دونوں مل کر کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے۔

اگر مجبوری کی حالت میں جالپا اپنی سہیلی سے یہ واقعہ بیان کر دیتی تو رتن وہ عورت نہ تھی، جو غم و غصہ کا اظہار کرتی، پر اس جھوٹی خودداری و پروری کا برا ہو۔

رما نے اس سوال پر ایسا منہ بنایا گویا جالپا نے اس پر کوئی بے رحمانہ حملہ کیا ہے ۔بولا

''رتن کے روپے کیوں دیتا؟ آج چاہوں تو دو چار ہزار کا مال لا سکتا ہوں۔ کاریگروں کی عادت دیر کرنے کی ہوتی ہی ہے۔بس اور کوئی بات نہیں ہے۔دس دن میں یا تو چیز ہی لا دوں گا یا روپیہ واپس کر دوں گا،مگر تم نے یہ سوال کیوں کیا؟ پرائی رقم بھلا میں اپنے خرچ میں کیسے لاتا؟''

جالپا نے معذرت کے لہجہ میں کہا۔''کچھ نہیں، میں نے یونہی پوچھا تھا۔''

جالپا کو تھوڑی دیر میں نیند آ گئی، لیکن رما پھر اسی ادھیڑ بن میں پڑا رہا۔اگر وہ رمیش کو اپنا محرم راز بنا لیتا تو وہ کسی مہاجن سے روپوؤں کا انتظام کرا دیتے، لیکن وہ

ان پر کسی طرح اپنی پریشانیوں کا اظہار نہ کر سکتا تھا۔ اس نے صبح کو ناشتہ کر کے دفتر کی راہ لی۔ شاید وہاں کچھ انتظام ہو جائے، کیونکر انتظام کرے گا۔ اس کا اسے مطلق خیال نہ تھا، لیکن مایوسی کے عالم میں انسان کو کسی غیبی امداد کا گمان ہونے لگتا ہے۔ دفتر میں چپڑاسی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ رما دفتر کا رجسٹر کھول کر رقموں کی جانچ کرنے لگا۔ کئی دنوں سے میزان نہیں دیا گیا تھا، لیکن بڑے بابو کے دستخط موجود تھے۔ اب میزان دیا تو ڈھائی ہزار نکلے۔

یکا یک اسے ایک تدبیر سوجھی: ''کیوں نہ ڈھائی ہزار کے عوض میزان میں ڈھائی سو کر دے۔ ایک ہی صفر کا معاملہ ہے۔ رسید بہی کی جانچ پڑتال کون کرتا ہے۔ اگر چوری پکڑی بھی گئی تو کہہ دوں گا، میزان میں غلطی ہوئی۔''

مگر اس خیال کو اس نے دل میں جمنے نہ دیا۔

گاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوا، مگر بیوپاریوں نے جب دیکھا کہ بابو صاحب آج موجود ہیں تو سوچا، جلدی سے چنگی دے کر فراغت پا لیں۔

رما نے اس عنایت کے لیے دستوری کی دگنی رقم وصول کی اور گاڑی والوں نے شوق سے دی، کیونکہ یہ بازار کا وقت تھا اور بارہ ایک بجے تک چنگی گھر سے فرصت پانے کی حالت میں چوبیس گھنٹے کا ہرج ہوتا تھا۔

اگر بازار روپے میں آدھ پاؤ بھی گر گیا تو سینکڑوں کے وارے نیارے ہو گئے۔ دس پانچ روپے بل کھانے میں انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ رما کو آج یہ نئی بات معلوم ہوئی۔ سوچا آخر صبح کو میں گھر پر ہی تو بیٹھا رہتا ہوں۔ اگر یہاں آ کر بیٹھ جاؤں تو روز دس پانچ روپے ہاتھ آ جائیں۔ پھر تو چھ مہینے میں سارا قرضہ

صاف ہو جائے۔ مانا روز یہ چاندی نہ ہوگی، پندرہ نہ سہی دس ملیں گے۔ اگر صبح کو روز پانچ روپے مل جائیں اور اتنے ہی دن بھر میں اور مل جائیں، تو پانچ چھ مہینے میں قرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ اس نے دراز کھول کر پھر رجسٹر نکالا، لیکن میزان لگا دینے کے بعد رجسٹر میں کسی قسم کا تغیر یا تبدل کرنا اسے اتنا خوفناک نہ معلوم ہوا۔ نیا رنگ روٹ جو پہلے بندوق کی آواز سے چونک پڑتا ہے، مشاق ہو جانے پر گولیوں کی بارش میں نہیں گھبراتا۔

رما دفتر بند کر کے گھر جانے ہی والا تھا کہ ایک بساطی کا ٹھیلہ آ پہنچا۔ رما نے کہا ''لوٹ کر چنگی لوں گا۔''

بساطی نے منتیں کرنی شروع کیں۔ اسے کوئی بہت ضروری کام تھا۔ آخر دس روپے پر معاملہ طے ہوا۔ رما نے چنگی ہی، روپے جیب میں رکھے اور گھر چلا۔ پچیس روپے محض دو گھنٹوں میں آ گئے۔ اگر ایک مہینہ بھی یہی اوسط رہے تو بیڑا پار ہے۔ اسے اتنی خوشی ہوئی کہ وہ کھانا کھانے گھر نہ گیا، بازار سے بھی کچھ نہ منگوایا۔ روپیہ بھناتے ہوئے اسے ایک روپیہ کم ہو جانے کا اندیشہ ہوا۔ وہ شام تک بیٹھا کام کرتا رہا۔ چار روپے اور وصول کیے۔ چراغ جلے جب وہ گھر چلا تو اس کے دل پر فکر اور مایوسی کا بوجھ بہت اتر چکا تھا۔ اگر دس دن یونہی تیزی رہی تو رتن سے منہ چھپانے کی نوبت نہ آئے گی۔

(17)

نو دن گزر گئے۔

رما روز علی الصبح دفتر جاتا اور چراغ جلے لوٹتا۔ وہ روز یہی امید کر کے جاتا تھا کہ

آج کوئی بڑا شکار پھنسے گا، مگر کبھی امید پوری نہ ہوئی۔ اتنا ہی نہیں کہ پہلے دن کی سی شاندار کامیابی پھر نہ ہوئی۔ تاہم اس کے لیے کچھ کم فخر کی بات نہ تھی کہ ان دنوں میں اس نے سو روپے جمع کر لیے تھے۔ جالپا نے کئی بار سیر کرنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن رما نے اسے برابر باتوں میں ٹالا۔ بس کل کا دن اور تھا۔ کل رتن آ کر کنگن مانگے گی تو وہ اسے کیا جواب دے گا۔ دفتر سے آ کر وہ اسی فکر میں بیٹھا ہوا تھا۔

کیا وہ ایک مہینے کی مہلت اور نہ دے گی۔ اتنے دن اور وہ خاموش رہے تو شاید رما اس کے قرض سے سبکدوش ہو جائے۔

ساون کے دن تھے، اندھیرا ہو چلا تھا۔ آسمان سیاہ چھتری کی طرح سر پر تنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ رما سوچ رہا تھا کہ رمیش بابو کے پاس چل کر دو بازیاں کھیل آؤں، مگر بادلوں کو دیکھ دیکھ کر رک جاتا تھا۔ دفعتہً رتن آ پہنچی۔ اس کا چہرہ تند تھا۔ معلوم ہوتا تھا آج وہ لڑنے کے لیے تیار ہو کر آئی ہے اور منہ ملاحظہ اور مروت کے خیال کو بھی قریب نہیں آنے دینا چاہتی۔

جالپا نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ ”تم خوب آئیں۔ میں ذرا تمہارے ساتھ گھوم آؤں گی۔ انہیں کام کے بوجھ سے آج کل سر اٹھانے کی بھی فرصت نہیں ہے۔“

رتن نے بے اعتنائی سے کہا۔ ”مجھے آج بہت جلد گھر واپس جانا ہے۔ بابو جی کو کل یاد دلانے آئی ہوں۔“

رما اس کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر دل میں سہم رہا تھا۔ کسی باتوں میں لگا کر خوش کرنا چاہتا تھا۔ بڑے تپاک سے بولا۔ ”جی ہاں خوب یاد ہے۔ ابھی صراف کی دکان

سے چلا آ رہا ہوں۔ روز صبح شام گھنٹہ بھر حاضری دیتا ہوں۔مگر ان چیزوں کی تیاری میں وقت بہت صرف ہوتا ہے۔ دو آدمی لگے ہوئے ہیں۔مگر ابھی شاید ایک مہینہ سے کم میں چیز تیار نہ ہو۔ ہاں ہوگی لاجواب۔ ان چیزوں میں دام تو کاریگری کے ہیں۔مالیت چاہے کچھ ہو یا نہ ہو۔''

رتن ذرا بھی نہ پگھلی۔تنک کر بولی۔''اچھا ابھی مہینہ بھر اور لگے گا۔ایسے کیا موتی پرو رہا ہے کہ تین مہینہ میں بھی ایک چیز نہ بنی؟ آپ اس سے کہہ دیجیے میرے روپے واپس کردے۔امید کے کنگن دیویاں پہنتی ہوں گی، مجھے ضرورت نہیں۔''

رما:''ایک مہینہ لگے گا۔شاید اس سے پہلے ہی بن جائے۔ایک مہینہ تو میں نے اندازاً کہہ دیا تھا۔اب تھوڑی ہی کسر اور رہ گئی ہے۔کئی دن تو نگینے تراش کرنے میں لگ گئے۔''

رتن:''مجھے کنگن پہننا ہی نہیں صاحب! آپ میرے روپے واپس کردیجیے۔جوہری میں نے بھی بہت دیکھے ہیں۔آپ کی عنایت سے اس وقت بھی تین جوڑے کنگن میرے پاس ہوں گے،لیکن ایسی دھاندلی کہیں نہیں دیکھی۔''

دھاندلی کے لفظ پر رما تلملا اٹھا۔''دھاندلی نہیں میری حماقت کہیے۔مجھے کیا ضرورت تھی کہ مفت کی زحمت سر لیتا۔میں نے تو پیشگی روپے اس لیے دیئے کہ صراف خوش ہو کر جلد تیار کردے گا۔اگر آپ روپے واپس مانگ رہی ہیں، مجھے امید نہیں کہ صراف روپے لوٹا دے۔''

رتن نے خشمگیں آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔''روپے کیوں نہ لوٹا دے گا؟''

رما: ''اس لیے کہ جو چیز آپ کی فرمائش سے بنائی ہے، اسے وہ کہاں بیچتا پھرے گا۔ ممکن ہے اس کے بکنے میں دو سال لگ جائیں۔ ہر ایک کی پسند ایک سی نہیں ہوتی۔''

رتن نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی۔ اس نے وعدہ خلافی کی ہے۔ اس کا تاوان دے۔ مجھے کل یا تو کنگن لا دیجیے یا روپے۔ اگر صراف سے آپ کا یارانہ ہے اور آپ لحاظ و مروت کے باعث اس سے کچھ نہیں کہہ سکتے، تو مجھے اس کی دکان دکھا دیجیے۔ اس میں بھی آپ کو شرم آتی ہو تو اس کا نام بتا دیجیے۔ میں پتا لگا لوں گی۔ واہ، اچھی دل لگی ہے۔ وہ ہے کس خیال میں۔ دکان نیلام کرا لوں گی۔ جیل بھجوا دوں گی۔''

رما کھسیا کر زمین کی طرف تاکنے لگا۔ وہ کتنی منحوس ساعت تھی، جب اس نے رتن سے روپے لیے۔ بیٹھے بٹھائے دردِ سر خریدا۔

جالپا نے کہا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ انہیں کیوں نہیں صراف کی دکان پر لے جاتے۔ چیز کو آنکھوں سے دیکھ کر انہیں تسلی ہو جائے گی۔''

رتن: ''میں وہ چیز پہننا ہی نہیں چاہتی۔''

رما: ''اچھی بات ہے، آپ کو روپے مل جائیں گے کل۔''

رتن: ''کل کس وقت؟''

رما: ''دفتر سے لوٹتے وقت لیتا آؤں گا۔''

رتن: ''روپے پورے لوں گی۔ ایسا نہ ہو سو روپے دے کر ٹال دے۔''

رما: ''کل آپ اپنے سب روپے لے جایئے گا۔''

یہ کہتا ہوا امر دانے کمرے میں آیا اور رمیش بابو کے نام ایک رقعہ لکھ کر گوپی سے بولا:

''اسے رمیش بابو کے پاس لے جا کر فوراً جواب لاؤ۔''

پھر اس نے دوسرا رقعہ لکھ کر بشمبر کو دیا کہ مانک داس کو دکھا کر جواب لا دے۔

بشمبر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''پانی آ رہا ہے۔''

رما: ''تو کیا ساری دنیا بہہ جائے گی۔ دوڑتے ہوئے جاؤ۔''

''اور جو وہ گھر پر نہ ملیں؟''

''ملیں گے وہ اس وقت کہیں نہیں جاتے۔''

آج زندگی میں پہلا موقع تھا کہ اس نے دوستوں سے روپے قرض مانگے۔ منت وسماجت، خوشامد واصرار کے جتنے الفاظ اسے یاد آئے، وہ اس نے سب صرف کر دیئے۔ جیسے رقعے آج اس نے لکھے، ویسے ہی رقعے اس کے پاس کتنی بار آ چکے تھے۔ ان رقعوں کو پڑھ کر اس کا دل کتنا بے قرار ہو جاتا تھا، پر مجبوری کے باعث اسے بہانے کرنے پڑتے تھے۔

کیا رمیش بھی بہانہ کر جائیں گے؟ وہ تہی دستی کا بہانہ نہیں کر سکتے۔ کیا میرے ساتھ اتنا سلوک بھی نہ کریں گے؟ آدھ گھنٹہ ہو گیا اور اب تک دو میں سے ایک بھی نہیں آیا۔ وہ دروازے پر ٹہلنے لگا۔ اس اضطراب کی حالت میں بیٹھنا مشکل تھا۔

رتن کی موٹر اب تک کھڑی تھی۔ اتنے میں رتن باہر آئی۔ مگر اسے ٹہلتے دیکھ کر بھی کچھ نہ بولی۔ موٹر روانہ ہو گئی۔

رمانے راستے کی طرف نگاہیں دوڑا کر سوچا، دونوں کہاں رہ گئے۔ کہیں کھیلنے

لگے ہوں گے۔ شیطان تو ہیں ہی۔ کہیں رمیش روپے دے دیں تو چاندی ہے، میں نے دو سو ناحق مانگے۔ شاید اتنے روپے اس وقت ان کے پاس نہ ہوں۔ مانک چاہے تو ہزار پانچ سو دے سکتا ہے۔ آج دونوں کی آزمائش ہے۔

اگر آج انہوں نے انکار کیا تو دوستی کا خاتمہ ہے۔ کسی کا نوکر نہیں ہوں کہ جب وہ شطرنج کھیلنے کے لیے بلائیں تو دوڑا چلا جاؤں۔

بشمبر نے لوٹ کر مانک کا رقعہ دیا۔ ''میں آج کل بہت تنگ دست ہوں۔ میں تو تمہی سے مانگنے والا تھا۔''

رما نے پرزہ پھاڑ کر پھینک دیا۔ ''خود غرض کہیں کا۔ اگر کسی سب انسپکٹر نے روپے مانگے ہوتے تو پرزہ دیکھتے ہی لے کر دوڑتے جاتے۔ خیر دیکھا جائے گا۔ چنگی کے لیے مال تو آئے گا ہی۔ اس کی کسر نکل جائے گی۔''

اتنے میں گوپی بھی لوٹا۔ رمیش نے لکھا تھا۔ ''میں نے اپنی زندگی کے دو چار اصول بنا لیے ہیں اور ان کی بڑی سختی سے پابندی کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ دوستوں سے لین دین کا تعلق نہ پیدا کروں گا۔ ابھی تمہیں تجربہ نہیں ہوا ہے لیکن میں بھوگ چکا ہوں۔ تم میرے پیارے دوست ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے اور تمہارے ارتباط میں خلل پیدا ہو۔ اس لیے مجھے معاف کرو۔''

رما نے اس خط کو بھی پڑھ کر پھینک دیا اور کرسی پر بیٹھ کر چراغ کی طرف محویت کے عالم میں دیکھنے لگا۔ اس چراغ کی لو کے اندر رمیش اور مانک اور رتن تینوں بیٹھے نظر آتے تھے۔ پھر وہ چراغ اس کی آنکھوں سے غائب ہو گیا۔

دل کی حالت وہ بھی ہوتی ہے، جب آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور کچھ نظر نہیں آتا۔ جب کان کھلے ہوتے ہیں اور کچھ سنائی نہیں پڑتا۔

(18)

شام ہوگئی تھی۔ میونسپلٹی کے احاطے میں سناٹا چھا گیا تھا۔ عملہ ایک ایک کر کے جا رہا تھا۔ مہتر کمروں میں جھاڑو لگا رہا تھا۔ خوانچہ والے دن بھر کی بکری کے پیسے گن رہے تھے، مگر رما ناتھ اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا رجسٹر لکھ رہا تھا۔

آج بھی وہ صبح ہی آیا تھا، مگر کوئی بڑا شکار نہ پھنسا۔ وہ سوچ رہا تھا، اب اپنی آبرو کیسے بچائے؟ آخر اس نے رتن کو جھانسہ دینے کی ٹھانی۔ وہ خوب جانتا تھا کہ رتن کی یہ بے صبری محض اس لیے ہے کہ وہ یہ سمجھتی ہے میں نے اس کے روپے خرچ کر ڈالے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ اس کے روپے عندالطلب مل سکتے ہیں، تو اسے تسکین ہو جائے گی۔ رما اسے روپے سے بھری تھیلی دکھا کر اس کا شبہ مٹا دینا چاہتا تھا۔ وہ خزانچی صاحب کے چلے جانے کی راہ دیکھ رہا تھا، اسی لیے آج اس نے دیر کی تھی۔ آج کی آمدنی کے ڈیڑھ سو روپے اس کے پاس تھے۔ اسے وہ اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔ خزانچی صاحب ٹھیک پانچ بجے اٹھے۔ انہیں کیا غرض تھی کہ رما سے آج کی آمدنی طلب کرتے۔ روپے گننے ہی سے چھٹی نہ ملی۔ دن بھر روپے گنتے گنتے اور لکھتے لکھتے بیچارے کی کمر دکھ رہی تھی۔

رما کو جب معلوم ہو گیا کہ خزانچی صاحب دور نکل گئے تو اس نے رجسٹر بند کیا اور چپڑاسی سے بولا:

''تھیلی اٹھاؤ چل کر جمع کراؤ۔''

چپڑاسی نے کہا۔ ''خزانچی صاحب تو بہت دور چلے گئے۔''

رما نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ''خزانچی صاحب چلے گئے۔ تم نے مجھ سے کہا کیوں نہیں؟ ابھی کتنی دور گئے ہوں گے؟''

''سڑک کی نکڑ تک پہنچے ہوں گے۔''

''تو یہ آمدنی کیسے جمع ہو گی؟''

''حکم ہو تو بلا لاؤں؟''

رما نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ 'اجی جاؤ بھی۔ اب تک تو کہا نہیں۔ اب انہیں آدھے راستے سے بلانے جاؤ گے۔ کیا آج زیادہ چھان گئے تھے۔ خیر روپے اسی دراز میں رکھ دو۔ تمہاری نگرانی رہے گی۔''

چپڑاسی نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ''نہیں بابو صاحب، میں یہاں روپے نہیں رکھنے دوں گا۔ سب دن برابر نہیں جاتے۔ کہیں روپے اٹھ جائیں تو میں بے گناہ مارا جاؤں۔''

رما نے پوچھا: ''تو پھر یہ روپے کہاں رکھوں؟''

چپڑاسی: ''حضور اپنے ساتھ لیتے جائیں۔''

رما تو یہ چاہتا ہی تھا۔ ایک یکہ منگوایا۔ اس پر روپوؤں کی تھیلی رکھی اور گھر چلا۔ سوچتا جاتا تھا، اگر رتن بھگی میں آ گئی تو کیا پوچھنا۔

جالپا نے تھیلی دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا کنگن نہ ملے؟''

''ابھی تیار نہ تھے۔ میں روپے اٹھا لایا۔''

''رتن بھی آتی ہو گی۔ اسے چین کہاں۔''

جب چراغ جلے تک رتن نہ آئی تو رمانے سمجھا اب نہ آئے گی۔ روپے الماری میں رکھے اور گھومنے چل دیا۔ مگر ابھی اسے گئے دس منٹ بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ رتن آ پہنچی اور آتے ہی بولی۔ ''کنگن تو آ گئے ہوں گے؟''

جالپا نے تمسخر کے انداز میں کہا۔ ''ہاں آ گئے ہیں، پہن لو۔ بیچارے کئی دفعہ صراف کے پاس گئے۔ ظالم دیتا ہی نہیں۔ حیلے حوالے کرتا ہے۔''

رتن بے گمان ہو کر بولی۔ ''کیسا صراف ہے کہ اتنے دنوں سے حیلے حوالے کر رہا ہے۔ میں جانتی کہ روپے ایسے جھمیلے میں پڑ جائیں گے تو دیتی ہی کیوں۔ نہ روپے ملتے ہیں اور نہ کنگن ملتا ہے۔''

رتن نے یہ الفاظ کچھ ایسے دلدوز طریقے سے کہے کہ جالپا بھپر اٹھی۔ بولی:

''آپ کے روپے رکھے ہوئے ہیں۔ جب چاہے لے جایئے۔ اپنے بس کی بات ہے نہیں۔ آخر جب صراف دے گا تبھی تو لائیں گے۔''

''کچھ وعدہ کرتا ہے، کب تک دے گا؟''

''اس کے وعدوں کا کیا اعتبار؟ سینکڑوں وعدے تو کر چکا ہے!''

''تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کنگن نہ بنائے گا۔''

''جو چاہے سمجھ لو۔''

''تو لاؤ روپے ہی دے دو، باز آئی میں ایسے کنگن سے۔''

جالپا جھمک کر اٹھی۔ الماری سے تھیلی نکالی اور رتن کے سامنے پٹک کر بولی۔

''آپ کے روپے رکھے ہیں لے جایئے۔''

فی الواقعہ رتن کی بے صبری کا وہی سبب تھا، جو رمانے سمجھا تھا۔ اسے گمان ہو رہا

تھا کہ ان لوگوں نے میرے روپے خرچ کر ڈالے۔ روپے سامنے دیکھ کر اس کے شکوک کا ازالہ ہو گیا۔ شرمندہ ہو کر بولی:

''اگر دو چار دن میں دینے کا وعدہ کرتا ہے تو روپے رہنے دو۔''

جالپا نے بے اعتنائی سے کہا۔ ''مجھے تو امید نہیں کہ اتنی جلدی دے۔ چیز تیار ہونے پر روپے مانگ لیے جائیں گے۔''

رتن نے بہت اصرار کیا کہ جالپا روپے رکھ لے، موقع پر روپے نہ مل سکے تو شرمندگی ہو، لیکن جالپا راضی نہ ہوئی۔ بولی:

''پرائی رقم گھر میں رکھنا خطرے کی بات ہے۔ کوئی گول مال ہو جائے تو مفت میں تاوان دینا پڑے۔ میری شادی کے چوتھے ہی دن میرے سارے گہنے چوری چلے گئے۔ ہم لوگ جاگتے ہی رہے، مگر نہ جانے کب آنکھ لگ گئی اور چوروں نے اپنا کام کر لیا۔ دس ہزار کی چپت پڑ گئی۔ کہیں وہی حادثہ پھر ہو جائے تو کہیں کے نہ رہیں۔''

رتن نے مایوس ہو کر روپے موٹر میں رکھے اور چلی گئی۔ جالپا خوش تھی کہ سر سے بوجھ ٹلا۔ رتن کو افسوس تھا کہ ناحق روپے واپس مانگے۔ کہیں لوگوں نے میری بدگمانی بھانپ نہ لی ہو۔

رما نو بجے گھوم کر لوٹا۔ جالپا اسے دیکھتے ہی بولی۔ ''رتن آئی تھی، میں نے اس کے سب روپے دے دیئے۔''

رما کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ آنکھیں پھیل کر پیشانی پر جا پہنچیں۔ گھبرا کر بولا۔ ''کیا کہا؟ رتن کے روپے دے دیئے، یہ تم سے کس نے کہا

تھا؟''

جالپا بولی۔''اسی کے روپے تو تم نے لاکر رکھے تھے،تم خود اس کا انتظار کرتے رہے۔تمہارے جاتے ہی وہ آئی اور کنگن مانگنے لگی۔میں نے جھلا کر اس کے روپے پھینک دیئے۔''

رمانے غصہ ضبط کر کے کہا۔''اس نے روپے مانگے تو نہ تھے؟''

جالپا: ''مانگے کیوں نہیں۔ہاں جب میں نے دے دیئے تو البتہ کہنے لگی، اسے کیوں لوٹاتی ہو۔میں نے کہہ دیا کہ ایسے شکی مزاج والوں کے روپے میں نہیں رکھتی۔''

رما کو ایسی تھکان معلوم ہوئی کہ اس سے کھڑا نہ رہا گیا،توکل کے انداز سے بولا:

''ایشور کے لیے تم مجھ سے بغیر پوچھے ایسے کام مت کیا کرو۔''

جالپا یہ معمہ کیا سمجھے۔بولی''تو ابھی کیا ہوا۔اس کے پاس جا کر روپے مانگ لاؤ۔''

رما چارپائی پر بیٹھ کر سر پر ہاتھ رکھے ہوئے صورت حال پر غور کرنے لگا۔جالپا سے ناراض ہونا بے انصافی تھی۔جب اس نے صاف کہہ دیا کہ یہ روپے رتن کے ہیں اور یہ اشارہ تک نہ کیا کہ مجھ سے پوچھے بغیر رتن کو مت دینا تو جالپا کی کوئی خطا نہیں۔رتن سے کسی طرح روپے واپس لینے چاہئیں۔جس وقت وہ یہاں آئی، کاش وہ خود موجود ہوتا،تو کتنی خوبصورتی سے ساری مشکل آسان ہو جاتی۔آخر اس نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ آج رتن آئے گی نہیں۔ایک دن گھومنے نہ جاتا،کون مرا

جاتا تھا۔

ضرور کوئی غیبی طاقت اس کی تباہی کے سامان جمع کر رہی ہے۔ دس منٹ کی غیر حاضری نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ روپے رکھ لیجیے۔ جالپا نے ذرا دانائی سے کام لیا ہوتا۔ نہیں! اس نے کوئی دانائی نہیں کی۔ اس کی جگہ رما خود وہی کرتا۔ سوال یہ ہے کہ رتن سے روپے واپس کیسے لیے جائیں؟ کیوں نہ رتن سے جا کر کہے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ روپے لوٹانے سے ناراض ہو گئی ہیں۔ دراصل میں روپے آپ کو واپس دینے کو نہ لایا تھا۔ اس لیے مانگ لایا تھا کہ صراف خوب تندہی سے کام کرے۔

رما نے سوچا، شاید رتن شرمندہ ہو کر خود ہی معافی مانگے اور روپے دے دے۔ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ رتن ضرور گھر پر ہو گی۔ رما نے سائیکل اٹھائی اور اس سے ملنے چلا۔

رتن کے بنگلے پر آج بڑی بہار تھی۔ یہاں ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی دعوت، کوئی نہ کوئی جشن ہوتا رہتا۔ رتن کی طبیعت اس خلوت اور تنہائی سے تنگ آ کر ان دلچسپیوں کی طرف اسی طرح لپکتی تھی جیسے پیاسا پانی کی طرف لپکتا ہے۔ اس وقت وہاں بچوں کا جمگھٹ تھا۔ ایک آم کے درخت میں جھولا پڑا ہوا تھا۔ بجلی کی بتیاں جل رہی تھیں۔ بچے جھولا جھول رہے تھے اور رتن جھولا جھلا رہی تھی۔ ہو حق مچا ہوا تھا۔ وکیل صاحب اس موسم میں بھی اونی اوورکوٹ پہنے برآمدے میں بیٹھے سگار پی رہے تھے۔

رما کا جی چاہا کہ جھولے کے پاس جا کر رتن سے باتیں کرے، مگر وکیل کو

کھڑے دیکھ کر مارے لحاظ کے ادھر نہ جا سکا۔

وکیل صاحب نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ بڑھا دیا اور بولے۔ ''آؤ رما بابو کہو تمہارے میونسپل بورڈ کی کیا خبریں ہیں؟''

رما نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔''

وکیل: ''آپ کے بورڈ میں لڑکیوں کی لازمی تعلیم کی قرارداد کب پاس ہو گی؟ اور کئی بورڈوں نے تو پاس کر دیا۔ جب تک عورتوں کی تعلیم کا رواج نہ ہو گا، ملکی ترقی غیر ممکن ہے۔ آپ تو یورپ نہ گئے ہوں گے۔ واہ کیا آزادی ہے، کیا دولت ہے۔ کیا زندگی ہے۔ کیا جوش ہے۔ بس معلوم ہوتا ہے کہ یہی جنت ہے اور عورتیں بھی سچ مچ دیویاں ہیں۔ اتنی خوش مزاج، اتنی آزاد۔ یہ سب عورتوں کی تعلیم کی برکت ہے۔''

رما نے اخباروں میں ان ملکوں کا تھوڑا بہت حال پڑھا تھا۔ اسی اعتبار سے بولا۔ ''وہاں عورتوں کے اطوار تو بہت اچھے نہیں ہیں۔''

وکیل: ''نان سینس! اپنے اپنے ملک کا رواج ہے۔ آپ ایک حسینہ کو کسی کے ساتھ تنہا دیکھ کر دانتوں میں انگلی دباتے ہیں۔ ہم اتنے بدگمان ہو گئے ہیں کہ عورت اور مرد کو یکجا دیکھ کر شبہ کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے، لیکن جہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتی ہیں، وہاں جنسی اختلاط کا وجود نہیں رہتا۔ آپس میں شوق اور دلچسپی کی اتنی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ جنسیت کے لیے بہت تھوڑی گنجائش رہ جاتی ہے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ جس ملک میں عورتوں کو جتنی ہی آزادی حاصل ہے، وہ ملک اتنا ہی مہذب ہے۔''

عورتوں کو قید میں یا پردہ میں یا مردوں سے کوسوں دور رکھنے کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ آپ کے یہاں لوگ اتنے بداطوار ہیں کہ عورتوں کی توہین کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کرتے۔ نوجوانوں کے لیے فلکیات، مذہب، فنون لطیفہ، ادبیات، فلسفہ، تاریخ، نظریات اور ہزاروں ہی ایسے مضامین ہیں، جن کی بنا پر آپس میں گہرے تعلقات پیدا ہو سکتے ہیں۔ میں سال بھر امریکہ اور یورپ میں رہ چکا ہوں۔ کتنی ہی عورتوں کے ساتھ میرا ربط ضبط تھا۔ ان کے ساتھ سیریں کی ہیں۔ مباحثے کیے ہیں، لیکن کسی نوجوان کو ایسے چرچے کرتے نہیں سنا جس پر کوئی عورت شرم سے سر جھکائے اور پھر اچھے اور برے کہاں نہیں ہوتے۔''

رما کو اس وقت اس موضوع میں کوئی لطف نہ آیا۔ وہ تو دوسری ہی فکر میں پریشان تھا، مگر وکیل صاحب کی طبیعت روانی پر تھی۔ پھر بولے:

''جب تک ہم مردوں اور عورتوں کو آزادی کے ساتھ ساتھ اپنی ذہنی نشو و نما نہ کرنے دیں گے، ہم زوال کی طرف گرتے جائیں گے۔

بندشوں سے سماج کا پیر نہ باندھیے، اس کے گلے میں قیدیوں کی زنجیر نہ ڈالیے۔ بیواؤں کی شادی کیجیے۔ خوب زوروں سے، لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب کوئی ادھیڑ عمر آدمی کسی جوان عورت سے شادی کرتا ہے تو کیوں اتنا کہرام مچ جاتا ہے؟ یورپ میں اسی اسی سال کے بوڑھے جوان عورتوں سے شادی کرتے ہیں۔ ستر سال کی بوڑھیاں جوان مردوں سے شادی کرتی ہیں، کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

ہم بوڑھوں کو موت آنے سے پہلے ہی مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ انسان کو

اگر کبھی رفیق کی ضرورت ہوتی ہے، تو بڑھاپے میں۔ جب اسے ہمیشہ کسی دستگیر کی خواہش ہوتی ہے۔ جب وہ دوسروں کا دست نگر ہو جاتا ہے۔''

رما کا دھیان جھولے کی طرف تھا۔ کسی طرح رتن سے دو دو باتیں کرنے کا موقع ملے۔ اس وقت اسے یہی دھن لگی ہوئی تھی، مگر اس کا وہاں جانا آداب مجلس کے خلاف تھا۔ آخر اس نے وکیل صاحب سے پوچھا۔ ''آج اتنے لڑکے یہاں کیسے آ گئے؟''

وکیل صاحب نے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''اجی کچھ نہ پوچھئے، رتن بائی کو بچوں سے بڑی محبت ہے۔ نہ جانے کہاں سے اتنے لڑکے جمع ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کو جھولے سے کچھ شوق ہے تو جائیے۔''

رما تو یہ چاہتا ہی تھا۔ چٹ پٹ جھولے کے پاس جا پہنچا۔ رتن اسے دیکھ کر مسکرائی اور بولی:

''ان شیطانوں نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ جھولے سے ان کا پیٹ ہی نہیں بھرتا۔ آئیے ذرا آپ بھی بیگار کیجیے۔ میں تو تھک گئی۔''

یہ کہہ کر وہ پکے چبوترے پر بیٹھ گئی۔ رما جھولے دینے لگا۔ بچوں نے نیا آدمی دیکھا تو سب کے سب اپنی باری کے لیے بے قرار ہو گئے۔ رتن کے ہاتھوں دو باریاں آ چکی تھیں، مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کچھ لڑکے تو تیسری بار جھولیں اور باقی بیٹھے منہ تاکتے رہیں۔ دو اترے تو چار بیٹھے۔ رما کو بچوں سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ مگر اس وقت پھنس گیا تھا۔ کیا کرتا۔

آخر آدھ گھنٹہ کی بیگار کے بعد اس کا جی اوب گیا۔ گھڑی میں ساڑھے نو بج

رہے تھے۔ مطلب کی بات کیسے چھیڑے۔ رتن تو جھولے میں اتنی مگن تھی گویا اسے روپوؤں کی یاد نہیں ہے۔ یکا یک اس نے رما سے کہا:

"بابو جی، میں جھولے پر بیٹھتی ہوں آپ مجھے جھلایئے۔ مگر نیچے سے نہیں، جھولے پر کھڑے ہو کر پینگ ماریئے۔"

رما بچپن ہی سے جھولے پر بیٹھتے ڈرتا تھا۔ ایک بار دوستوں نے زبردستی جھولے پر آنے کے لیے مجبور کر دیا، مگر اپنی مجبوری کا اظہار کیونکر کرتا۔ رتن دو بچوں کو لے کر بیٹھ گئی اور یہ گیت گانے لگی:

کدم کی ڈریاں جھولا پڑے گیوری
رادھا رانی جھولن آئی

رما جھولے پر کھڑا ہو کر پینگ مارنے لگا، لیکن اس کے پاؤں کانپ رہے تھے اور دل بیٹھا جاتا تھا۔ جب جھولا اوپر سے گرتا تھا تو اسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کوئی رقیق شے اس کے سینے کے اندر چبھتی چلی جا رہی ہے اور رتن بچوں کے ساتھ گا رہی تھی۔

کدم کی ڈریاں جھولا پڑے گیوری

ایک لمحہ کے بعد رتن نے کہا۔ "ذرا اوپر بڑھایئے صاحب۔ آپ سے تو جھولا اوپر بڑھتا ہی نہیں۔"

رما نے شرمندہ ہو کر اور زور لگایا، مگر جھولا نہ بڑھا۔ رما کے سر میں چکر آنے لگا۔

رتن: "آپ کو پینگ مارنا نہیں آتا۔ کبھی جھولا نہیں جھولے؟"

رما نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ’’ہاں، ادھر تو برسوں سے نہیں جھولا۔‘‘

رتن: ’’تو آپ بچوں کو سنبھال کر بیٹھیے۔ میں آپ کو جھلاؤں گی۔ اگر جھولا اس ڈال کو نہ چھولے تو کہیے گا۔‘‘

رما کی روح فنا ہوگئی۔ بولا۔ ’’آج بہت دیر ہو رہی ہے، پھر کبھی آؤں گا۔‘‘

رتن: ’’ابھی کیا دیر ہوگئی ہے، دس بھی تو نہیں بجے۔ گھبرایئے نہیں۔ ابھی بہت رات پڑی ہے۔ خوب جھول کر جایئے گا۔ کل جالپا دیوی کو بھی لایئے گا۔ ہم دونوں جھولیں گے۔‘‘

رما جھولے پر سے اتر آیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ سر میں ایسا چکر آ رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب گرا، اب گرا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا سائیکل کی طرف چلا اور اس پر بیٹھ کر بھاگا۔

کچھ دور تک اسے ہوش نہ رہا۔ پاؤں آپ ہی آپ پیڈل گھماتے جاتے تھے۔ آدھی دور جانے کے بعد اسے ہوش آیا۔ اس نے سائیکل گھما دی۔ کچھ دور چلا پھر اتر کر سوچنے لگا، اب کیا کرے۔ آج ملاحظہ میں پڑ کر اس نے کتنا چرکا کھایا۔ کیوں اس کے منہ سے آواز نہیں نکلی۔ رتن کوئی ہوا تو تھی نہیں، جو اسے کھا جاتی۔

دفعتاً اسے یاد آیا، اس تھیلی میں آٹھ سو روپے تھے، شاید رتن نے روپے گنے نہیں۔ ورنہ ضرور ذکر کرتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تھیلی کسی کو دے دے یا اسے اور روپوؤں کے ساتھ ملا دے، پھر تو غضب ہی ہو جائے۔ کہیں کا نہ رہوں گا، کیوں نہ اسی وقت چل کر بیشی روپیہ مانگ لاؤں، لیکن اب تو دیر بہت ہوگئی۔ سویرے پھر

آنا پڑے گا۔

اس نے پھر سوچا۔ اگر یہ دو سو روپے مل بھی گئے پھر بھی تو پانچ سو روپوں کی کمی رہے گی۔ اس کا کیا انتظام ہوگا۔ اب تو ایشور ہی بیڑا پار لگائے تو لگے گا۔ صبح تک کوئی انتظام نہ ہو سکا تو مصیبت کا سامنا ہوگا۔

زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں جب مایوسی میں بھی ہمارا رشتۂ امید نہیں ٹوٹتا۔

رما نے سوچا، ایک بار پھر گنگو کے پاس چلوں۔ اس کے ہاتھ پاؤں پڑوں۔ ممکن ہے اسے کچھ رحم آ جائے۔ وہ فوراً صرافہ جا پہنچا، مگر گنگو کی دکان بند تھی۔ وہ پیچھے پھرا ہی تھا کہ چرن داس آتا ہوا نظر آیا۔ رما کو دیکھتے ہی بولا: ''بابو جی! آپ نے تو ادھر کا راستہ ہی چھوڑ دیا۔ کہیے روپے کب ملیں گے؟''

رما نے عاجزی سے کہا۔ ''اب بہت جلد ملے جاتے ہیں۔ دیر نہیں ہے۔''

''گنگو نے ہوشیاری سے روپے وصول نہ کر لیے ہوتے تو ہماری طرح بیٹھے ٹاپتے۔ سال گزر گیا ہے روپیہ کے ساتھ سود بھی لگایئے تو چوراسی روپے ہوتے ہیں۔ کل دکان پر آ کر حساب کر جایئے۔ پورا نہیں تو آدھا تہائی کچھ تو دیجیے۔ لین دین جاری رہنے سے مہاجن کی تسلی رہتی ہے۔ کان میں تیل ڈال کر بیٹھے رہنے سے اسے شبہ ہونے لگتا ہے کہ اس کی نیت خراب ہے ہو تو کل کب آیئے گا؟''

رما: ''بھائی کل میں روپے لے کر تو نہ آسکوں گا۔ یوں جب کہو تب چلا آؤں۔ کیوں اس وقت اپنے سیٹھ جی سے چار پانچ سو کا بندوبست نہ کرا دو گے؟ تمہاری مٹھی بھی گرم کر دوں گا۔''

چرن داس: ''کہاں کی بات لیے پھرتے ہو بابو جی۔انہوں نے یہی بڑا سلوک کیا کہ نالش نہیں کر دی۔آپ کے پیچھے مجھے بھی باتیں سننی پڑتی ہیں۔کیا بڑے منشی جی سے کہنا پڑے گا۔''

رما نے جھلا کر کہا۔''تمہارا دین دار میں ہوں۔بڑے منشی جی نہیں ہیں۔میں مر نہیں گیا ہوں۔گھر چھوڑ کر نہیں بھاگا جاتا۔اتنے بے صبرے کیوں ہوئے جاتے ہو؟''

چرن داس: ''سال بھر ہوا ایک کوڑی تک نہیں ملی۔کہاں تک صبر کریں۔کل کم سے کم دو سو روپے کی فکر رکھیے گا۔''

رما: ''میں نے کہہ دیا،میرے پاس ابھی روپے نہیں ہیں۔''

چرن داس: ''یہ روز رقمیں مارتے ہو وہ کہاں جاتی ہیں۔گھر میں کوئی ایسا لمبا خرچ بھی تو نہیں ہے؟''

رما نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔سائیکل بڑھا دی۔ادھر آیا تھا کہ شاید نجات کی کوئی صورت نکلے۔الٹے تقاضا سہنا پڑا۔کہیں یہ شیطان سچ مچ بابو جی کے پاس تقاضا نہ بھیج دے۔آگ ہی ہو جائیں گے۔جالپا بھی سمجھے گی کیسا کباڑیا آدمی ہے۔اس وقت رما کی آنکھوں سے آنسو نہ نکلے تھے،مگر اس کا رواں رواں رو رہا تھا۔جالپا سے اپنی اصلی حالت چھپا کر اس نے کتنی بڑی غلطی کی۔وہ سمجھدار عورت ہے۔اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں اتنا تنگ دست ہوں تو وہ مجھے کبھی زیر بار نہ کرتی۔اس نے تو کبھی اپنی زبان سے کچھ کہا ہی نہیں۔میں ہی اپنی شان دکھانے کے لیے مرا جا رہا تھا۔قرض کا اتنا بھاری بوجھ سر پر رکھ کر بھی اس نے کیوں نہ کنایت سے

کام لیا۔ اسے ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑنا چاہیے تھا۔

اس دوران میں اس کی آمدنی ایک ہزار سے کم نہ ہوئی ہوگی۔ اگر اس نے جزرسی اختیار کی ہوتی تو ان دونوں مہاجنوں کے آدھے آدھے روپے ضرور ادا ہو جاتے۔

مگر وہاں تو سر پر شیطان سوار تھا۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ جالپا محلّہ بھر کی عورتوں کو جمع کرکے روز سیر کرنے جائے۔

سینکڑوں روپے تو تانگہ والا ہی لے گیا ہوگا۔ پر اسے تو بیوی پر رعب جمانے کی دھن سوار تھی۔ سارا بازار جان جائے کہ لالہ نرے لفنگے ہیں، لیکن اپنی رفیق بیوی سے پردہ کیا جائے۔

وہ گھر پہنچا تو جالپا نے پوچھا ''کہاں چلے گئے تھے، بڑی دیر لگادی؟''

رما: ''تمہارے کارن رتن کے بنگلے پر جانا پڑا۔ تم نے پوری تھیلی اٹھا کر دے دی۔ اس میں دوسو روپے میرے بھی تھے۔''

جالپا: ''تو مجھے کیا معلوم تھا۔ تم نے بتایا بھی تو نہیں، لیکن اس کے پاس سے روپے نہیں جاسکتے۔ آپ ہی بھیج دیں گی۔''

رما: ''مانا مگر سرکاری رقم تو کل داخل کرنی پڑے گی۔''

جالپا: ''مجھ سے دوسو روپے لے لینا، میرے پاس ہیں۔''

رما کو یقین نہ آیا، بولا۔ ''تمہارے پاس اتنے روپے کہاں سے آئے؟''

جالپا: ''تمہیں اس سے کیا مطلب۔ میں تو دوسو دینے کو کہتی ہوں۔''

رما کا چہرہ شگفتہ ہوگیا۔ دوسو روپے یہ دے دے۔ دوسو روپے رتن سے مل

جائیں۔ سو روپے اس کے پاس ہیں ہی تو کل تین سو روپے کی کمی رہ جائے گی۔ مگر وہ تین سو روپے کہاں سے آئیں گے۔ ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا، جس سے اتنے روپے ملنے کی امید کی جا سکے۔ جب وہ کھانا کھا کر لیٹا تو جالپا نے کہا:

''آج کس سوچ میں پڑے ہو؟''

رما: ''سوچ کس بات کی، کیا میں متفکر ہوں؟''

جالپا: ''ہاں کسی فکر میں پڑے ہوئے ہو۔ مگر مجھ سے چھپا رہے ہو۔''

رما: ''میں نے تو تم سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔''

جالپا: ''واہ، تم اپنے دل کی بات مجھ سے کیوں کہنے لگے۔ رشیوں کا حکم نہیں ہے۔''

رما: ''میں ان رشیوں کا معتقد نہیں ہوں۔''

جالپا: ''وہ تو جب معلوم، جب میں تمہارے دل میں بیٹھ کر دیکھتی۔''

رات کو جالپا نے ایک خوفناک خواب دیکھا اور چلا پڑی۔ رما نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا ہے جالپا۔ کیا خواب دیکھ رہی ہو؟'' جالپا نے ادھر ادھر سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا:

''بڑے عذاب میں جان پڑی تھی۔ بڑا برا خواب دیکھا۔''

رما: ''کیا دیکھا؟''

جالپا: ''کیا بتاؤں، کچھ کہا نہیں جاتا۔ دیکھتی تھی کہ تمہیں کئی سپاہی پکڑے لیے جا رہے ہیں۔ کتنی ڈراؤنی صورت تھی ان کی۔''

رما کا خون خشک ہو گیا۔ دو چار دن قبل اس خواب کو اس نے ہنسی سے اڑا دیا

ہوتا۔ اس وقت اسے خواہ مخواہ ایک تشویش پیدا ہوگئی۔ مگر باہر سے ہنس کر بولا:

''تم نے سپاہیوں سے پوچھا نہیں، انہیں کیوں پکڑے لیے جاتے ہو؟''

جالپا: تمہیں ہنسی سوجھ رہی ہے اور میرا دل کانپ رہا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد رما نے نیند میں بکنا شروع کیا:

''اماں کہے دیتا ہوں، پھر میرا منہ نہ دیکھو گی۔ میں ڈوب مروں گا۔''

جالپا کو ابھی نیند نہ آئی تھی۔ وہ ڈر گئی۔ رما کو زور سے ہلا کر بولی۔ ''مجھے تو ہنستے تھے اور خود بکنے لگے۔ سن کر روئیں کھڑے ہوگئے۔ خواب دیکھتے تھے کیا؟''

رما نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ''ہاں جی، نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا؟ کچھ یاد نہیں!''

جالپا نے پوچھا۔ ''اماں جی کو کیوں دھمکا رہے تھے، سچ بتاؤ کیا دیکھتے تھے؟''

رما نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ ''کچھ یاد نہیں آتا، یونہی بکنے لگا ہوں گا۔''

جالپا: ''اچھا تو کروٹ سے سونا، چت سونے سے آدمی بکنے لگتا ہے۔''

رما کروٹ سے لیٹ گیا، لیکن اسے معلوم ہوتا تھا گویا فکر اور خوف آنکھوں میں بیٹھے ہوئے نیند کے حملوں سے ان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ جاگتے جاگتے دو بج گئے۔ دفعتاً جالپا اٹھ بیٹھی اور صراحی سے پانی انڈیلتی ہوئی بولی ''بڑی پیاس لگی تھی، کیا تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟''

رما: ''ہاں جی! نیند اچٹ گئی ہے۔ میں سوچ رہا تھا تمہارے پاس دو سو روپے کہاں سے آ گئے؟''

جالپا: ''یہ روپے میں اپنے گھر سے لائی تھی۔ کچھ بدائی میں ملے تھے، کچھ منہ دکھائی ہیں۔''

رما: ''تب تو تم روپے جمع کرنے میں بڑی ہوشیار ہو۔ یہاں کیوں نہیں کچھ جمع کیا؟''

جالپا نے مسکرا کر کہا۔ ''تمھیں پا کر اب روپے کی پروا نہیں رہی۔''

رما: ''اپنی تقدیر کو کوستی ہوگی۔''

جالپا: ''تقدیر کو کیوں کوسوں۔ تقدیر کو وہ روئے، جس کا شوہر نکھٹو ہو، شرابی ہو، بدچلن ہو، طعنوں سے عورت کا دل چھیدتا رہے اور بات بات پر بگڑے۔ آدمی اپنے مرضی کا ہو تو عورت اس کے ساتھ فاقہ کر کے بھی خوش رہے گی۔''

رما نے تمسخر کر کے پوچھا۔ ''تو میں تمہارے من کا ہوں؟''

جالپا نے محبت آمیز غرور سے کہا۔ ''میری جو امید تھی، اس سے تم کہیں بڑھ کر نکلے۔ میری تین سہیلیاں ہیں۔ مگر ایک کا شوہر بھی تم جیسا نہیں۔ ایک ایم۔ اے پاس ہے مگر دائم المریض، دوسرا تعلیم یافتہ بھی اور مالدار بھی، مگر عیاش۔ تیسرا بالکل نکھٹو ہے۔''

رما غمگین ہو گیا۔ ایسی وفادار اور خلوص کی دیوی کے ساتھ اس نے کتنا دغا کیا۔ جب اتنا پردہ رکھنے پر بھی جالپا کو اس پر اتنا اعتماد ہے، تو ان ظاہرداریوں کو مٹا کر اس کی زندگی کتنی پر عاقبت تھی۔

(19)

علی الصبح رما نے رتن کے پاس اپنا آدمی بھیجا۔

خط میں لکھا تھا۔ ''مجھے بڑا افسوس ہے کہ کل جالپا نے آپ کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جو اسے لازم نہ تھا۔ میری منشا ہرگز نہ تھی کہ آپ کو روپے واپس کر دوں۔ میں

نے صراف کو تنبیہ کرنے کے لیے اس سے روپے لے لیے تھے۔ کنگن دو چار روز میں ضرور مل جائیں گے۔ آپ روپے بھیج دیں۔ اس تھیلی میں دو سو روپے میرے بھی تھے۔ اس کا خیال رکھیے گا۔‘‘

غرض اپنی خودداری کا لحاظ رکھتے ہوئے جتنا انکسار ممکن تھا، وہ اس نے ظاہر کیا۔ جب تک آدمی لوٹ کر نہ آیا۔ وہ بڑی بے صبری سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ سوچ رہا تھا کہیں بہانہ ہی نہ کر دے یا گھر پر ملے ہی نہیں یا دو چار دن بعد دینے کا وعدہ کرے۔ سارا دارومدار رتن کے روپوں پر تھا۔ اگر اس نے صاف جواب دے دیا تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔

اس کے انکار کا خیال کر کے ہی اس کی روح فنا ہو رہی تھی۔ آخر نو بجے آدمی لوٹا۔ رتن نے دو سو روپے تو دے دیئے تھے مگر خط کا جواب نہ دیا تھا۔

رما نے مایوس آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ سوچنے لگا، رتن نے خط کا جواب کیوں نہیں دیا، کیا اتنی کج خلق ہے؟ کتنی مکار عورت ہے۔ رات کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شرافت اور اخلاق کی پتلی ہے۔ مگر دل میں یہ غبار بھرا ہوا تھا۔

باقی روپوؤں کی فکر میں رما کو نہانے اور کھانے کی بھی یاد نہ رہی۔

کہار اندر گیا تو جالپا نے پوچھا۔ ’’تمہیں کچھ دھندے کی بھی فکر ہے کہ مٹر گشتی ہی کرتے رہو گے۔ دس بج رہے ہیں اور ابھی تلک ساگ بھاجی کا کہیں پتا نہیں۔‘‘

کہار نے تیوریاں بدل کر کہا۔ ’’تو کیا چار ہاتھ پیر کر لوں۔ کام ہی سے تو گیا تھا۔ بابو نے میم صاحب کے پاس روپیہ لینے کو بھیجا تھا۔‘‘

جالپا: ''میم صاحب کون؟''

کہار: ''وہی جو موٹر پر چڑھ کر آتی ہیں۔''

جالپا: ''تو لائے روپے؟''

کہار: ''لایا کیوں نہیں۔ سو کوس پر تو رہتی ہیں۔ دوڑتے دوڑتے پاؤں ٹوٹ گئے۔''

جالپا: ''اچھا جھٹ پٹ جا کر ترکاری لاؤ۔''

کہار تو ادھر گیا۔ رما روپے لیے ہوئے اندر پہنچا تو جالپا نے پوچھا:

''تم نے اپنے روپے رتن سے منگوا لیے نا۔ اب تو مجھ سے نہ لوگے؟''

رما نے مایوسانہ انداز سے کہا: ''مت دو۔''

جالپا: ''میں نے کہہ دیا تھا کہ روپے دے دوں گی، پھر آدمی کیوں دوڑایا۔ سمجھی ہوں گی انہیں میرا اتنا اعتبار بھی نہیں۔''

رما: ''میں نے روپے نہیں مانگے تھے، صرف اتنا لکھ دیا تھا کہ تھیلی میں دو سو روپے زیادہ ہیں۔''

جالپا ہنس کر بولی ''میرے روپے بڑے بھاگوان ہیں۔ دکھاؤں، چن چن کر نئے روپے رکھے ہیں۔ سب چماچم، دیکھو تو آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔''

یکا یک کسی نے نیچے سے آواز دی۔ ''بابو جی سیٹھ نے روپے کے لیے بھیجا ہے۔''

منشی دیا ناتھ کسی کام سے اندر آ رہے تھے۔ سیٹھ کے پیادے کو دیکھ کر پوچھا۔

''کون سیٹھ؟ کیسے روپے؟ میرے یہاں کسی کے روپے نہیں آتے۔''

پیادہ بولا۔ ''چھوٹے بابو نے کچھ مال لیا تھا۔ سال بھر ہو گیا۔ ابھی تک ایک پیسہ نہیں دیا۔ سیٹھ جی نے کہا ہے۔ بات بگڑنے پر دیئے تو کیا دیئے۔ آج کچھ ضرور دلوا دیجیے۔''

دیاناتھ نے رما کو پکارا اور بولے ''دیکھو کس سیٹھ کا آدمی آیا ہے۔ اس کا کچھ حساب باقی ہے۔ صاف کیوں نہیں کر دیتے، کتنا باقی ہے؟''

رما کچھ جواب نہ دے پایا تھا کہ پیادہ بول اٹھا۔ ''پورے سات سو بابو جی؟''

منشی دیاناتھ کی آنکھیں پھیل کر پیشانی تک جا پہنچیں۔ ''سات سو کیوں جی۔ یہ تو سات سو کہتا ہے؟''

رما نے ٹالنے کے ارادے سے کہا۔ ''مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔''

پیادہ: ''معلوم نہیں، پرزہ تو میرے پاس ہے۔ تب سے کچھ دیا ہی نہیں، کم کہاں سے ہو گئے۔''

رما: ''تم چلو دکان پر، میں خود آتا ہوں۔''

پیادہ: ''ہم بغیر روپے لیے نہ جائیں گے صاحب! آپ یونہی ٹال دیا کرتے ہیں اور باتیں ہم کو سننی پڑتی ہیں۔''

رما کو ساری دنیا کے سامنے ذلیل ہونا گوارا تھا، لیکن باپ کے سامنے اس طرح کی ذلت اس کے لیے موت سے کم نہ تھی۔ جس آدمی نے اپنی زندگی میں کبھی حرام کا ایک پیسہ نہ چھوا ہو، جس نے قرض لے کر کھانے کے بدلے بھوکوں سو رہنا منظور کیا ہو، اس کا لڑکا اتنا بے شرم اور بے غیرت ہو۔

رما اپنے والد کی روح کو اور زیادہ صدمہ نہ پہنچا سکتا تھا۔ تند لہجے میں پیادہ سے

بولا:

''تم ابھی یہیں کھڑے ہو، ہٹ جاؤ نہیں تو دھکے دے کر نکال دیئے جاؤ گے۔''

پیادہ: ''ہمارے روپے دلوایئے، ہم چلے جائیں۔ ہمیں آپ کے دروازے سے کیا مٹھائی ملتی ہے؟''

رما: ''جا کر لالہ سے کہہ دو، نالش کر دیں۔''

منشی دیا ناتھ نے ڈانٹ کر کہا۔ ''کیا بے شرمی کی باتیں کرتے ہو جی۔ جب گرہ میں روپے نہ تھے تو چیز لائے ہی کیوں؟ اور جب لائے تب ادا کرو۔ کہہ دیا نالش کر دو۔ نالش کر دے گا تو کیا آبرو رہ جائے گی تمہاری اور تمہیں یہ سوجھی کیا کہ اتنا بڑا بوجھ سر پر لاد لیا۔ کوئی شادی بیاہ کا موقع ہوتا تو ایک بات بھی تھی۔ یہ عورت کیسی ہے، جو شوہر کو ایسی بے ہودگی کرتے دیکھتی ہے اور منع نہیں کرتی۔''

رما کو یہ تنبیہ ہی بری معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے خیال میں منشی جی کو اس معاملے میں بولنے کا حق نہ تھا۔ گستاخی سے بولا۔ ''آپ ناحق اتنا بگڑ رہے ہو، آپ سے روپے مانگنے جاؤں تو کہیے گا۔''

اپنے دل میں اس نے کہا۔ ''ذلت آپ ہی کی بدولت ہو رہی ہے۔ آپ ہی کی کرنی کا پھل بھوگ رہا ہوں۔''

پیادے نے باپ بیٹے میں تکرار ہوتی دیکھی تو چپکے سے راہ لی۔ منشی جی جھنجھناتے ہوئے نہانے چلے گئے۔ رما اوپر گیا تو چہرے پر خفت چھائی ہوئی تھی۔ جس بے عزتی سے بچنے کے لیے وہ ڈال ڈال پات پات بھاگتا پھرتا تھا، وہ آج

ہو ہی گئی۔ اس ذلت کے سامنے سرکاری روپوؤں کی فکر بھی غائب ہو گئی۔ رما ابھی عام قرض خوروں کی طرح بے غیرت نہیں ہوا تھا۔ اگر موت کا فرشتہ اس کی جان لینے آتا تو وہ دوڑ کر اس کا خیر مقدم کرتا۔

جالپا نے پوچھا۔ ''تم نے کہا تھا، اس کے اب تھوڑے ہی روپے باقی ہیں۔''

رما نے سر جھکا کر کہا۔ ''بدمعاش جھوٹ بول رہا تھا؟''

جالپا: ''دیئے ہوتے تو کیوں روپوؤں کا تقاضا کرتا؟ جب تمہاری آمدنی اتنی کم تھی تو گہنے لیے ہی کیوں؟ میں نے کبھی ضد نہ کی تھی اور مان لو میں ضد بھی کرتی تو تمہیں سمجھ بوجھ کر کام کرنا تھا۔ اپنے ساتھ مجھے بھی چار گالی سنوا دیں۔ آدمی ساری دنیا سے پردہ رکھتا ہے، لیکن اپنی بیوی سے تو پردہ نہیں رکھتا۔ اگر میں جانتی کہ تمہاری آمدنی اتنی تھوڑی ہے تو مجھے کیا کتے نے کاٹا تھا کہ سارے محلے کی عورتوں کو تانگے میں بٹھا بٹھا کر سیر کرانے لے جاتی۔ کہیں نالش کر دے تو سات سو کے ایک ہزار ہو جائیں۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ تم مجھ سے یہ فریب کر رہے ہو۔ کوئی بازاری عورت تو تھی نہیں کہ تمہیں نوچ کھسوٹ کر اپنا گھر بھر لیتی۔ میں تو بھلے برے دونوں ہی کی ساتھن ہوں۔ بھلے میں تم چاہے میری بات نہ پوچھو، لیکن برے میں تو تمہارے گلے پڑوں گی ہی۔''

رما کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ دفتر کا وقت آ گیا تھا۔ کھانا کھانے کی مہلت نہ تھی۔ کپڑے پہنے اور دفتر چلا۔ ابھی گھر سے نکلا ہی چاہتا تھا کہ جالپا لپک کر نیچے آئی اور بولی:

''میرے پاس جو دو سو روپے ہیں، وہ کیوں نہیں صراف کو دے دیتے؟''

رما نے چلتے وقت عمداً جالپا سے روپے نہ مانگے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جالپا مانگتے ہی دے دے گی، لیکن باتیں سننے کے بعد روپے کے لیے اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اسے شرم آتی تھی۔ جالپا کی آواز سن کر ٹھٹھک گیا اور بولا:

"اچھی بات ہے، لاؤ دے دو۔"

وہ باہر کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ جالپا دوڑ کر اوپر سے روپے لائی اور گن گن کر اس کی تھیلی میں ڈال دیئے۔ اس نے سمجھا تھا، رما روپے پا کر پھولا نہ سمائے گا، مگر اس کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی، اسے ابھی تین سو روپوں کی فکر اور کرنی تھی۔ وہ کہاں سے آئیں گے۔

سڑک پر آ کر رما نے ایک تانگہ لیا اور رتن کے بنگلے پر جا پہنچا۔ شاید رتن سے ملاقات ہو جائے۔ وہ چاہے تو تین سو روپوں کا بڑی آسانی سے انتظام کر سکتی ہے۔ راستے میں وہ سوچتا جاتا تھا کہ آج ذرا بھی تکلف نہ کروں گا۔ ذرا دیر میں رتن کا بنگلہ آ گیا۔ وہ سامنے ہی برآمدہ میں بیٹھی تھی۔ رما نے اسے دیکھ کر ہاتھ اٹھایا۔ اس نے بھی ہاتھ اٹھایا۔ تانگہ سامنے سے نکل گیا۔ وہ بنگلہ کے اندر نہ جا سکا۔ رتن بلاتی تو وہ چلا جاتا۔ وہ برآمدے میں نہ بیٹھی ہوتی تب بھی شاید وہ اندر چلا جاتا، لیکن اسے بیٹھی دیکھ کر وہ محجوب ہو گیا۔

جب تانگہ اور آگے پہنچا تو رما نے اسے چنگی کے دفتر چلنے کو کہا اور گیارہ بجتے بجتے وہاں جا پہنچا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ چھاتی دھڑک رہی تھی۔ رمیش بابو نے اس کو ضرور پوچھا ہو گا، جاتے ہی بلائیں گے۔ دفتر کے کاموں میں وہ ذرا بھی رعایت نہیں کرتے۔ تانگہ سے اترتے ہی اس نے پہلے اپنے کمرے کی طرف نگاہ

ڈالی۔ دیکھا کئی آدمی اس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ وہ ادھر نہ جا کر رمیش بابو کے یہاں پہنچا۔ یہ انتشار اب اس کی برداشت سے باہر تھا۔

رمیش بابو نے پوچھا ''تم اب تک کہاں تھے جی! خزانچی صاحب تمہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں، چپڑاسی ملا تھا؟''

رما نے اٹک اٹک کر کہا۔ ''میں گھر پر نہ تھا، ذرا وکیل صاحب کی طرف چلا گیا تھا۔ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔''

رمیش: ''کیسی مصیبت، گھر میں تو خیریت ہے؟''

رما: ''جی ہاں خیر و عافیت تو ہے، کل شام کو یہاں کام بہت تھا۔ میں اس میں ایسا پھنسا کہ وقت کی یاد نہ رہی۔ جب کام ختم کر کے اٹھا تو خزانچی صاحب چلے گئے تھے۔میرے پاس آمدنی کے آٹھ سو روپے تھے۔سوچنے لگا اسے کہاں رکھوں گا۔میرے کمرے میں کوئی صندوق تو ہے نہیں۔یہی فیصلہ کیا کہ ساتھ لیتا جاؤں۔ پانچ سو روپے نقد تھے۔وہ تو میں نے تھیلی میں رکھے، تین سو روپے کے نوٹ جیب میں رکھ لیے اور گھر چلا۔چوک میں دو ایک چیزیں لینی تھیں، ادھر سے ہوتا ہوا گھر پہنچا تو نوٹ غائب تھے۔''

رمیش نے آنکھیں پھاڑ کر کہا ''تین سو روپے کے نوٹ غائب ہو گئے؟''

رما: ''جی ہاں! کوٹ کے اوپر کی جیب میں تھے۔کسی نے نکال لیے۔''

رمیش: ''اور تم کو مار کر تھیلی نہیں چھین لی؟''

رما: ''کیا بتاؤں بابو جی! تب سے ایسے خلجان میں پڑا ہوں کہ کچھ نہیں سوجھتا ۔صبح سے اسی فکر میں دوڑ رہا ہوں لیکن کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔''

رمیش: ''منشی جی سے تو تم نے کہا ہی نہ ہوگا؟''

رما: ''ان کی عادت سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ روپے تو کیا دیتے، الٹی ڈانٹ سناتے۔''

رمیش: ''تو پھر کیا کرو گے؟''

رما: ''آج شام تک مہلت دیجیے، کچھ نہ کچھ کروں گا ہی۔''

رمیش نے ترش ہو کر کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا تم سے اتنی لاپروائی کیوں ہوئی۔ میری جیب سے تو آج تک ایک پیسہ بھی گرا۔ آنکھیں بند کر لی تھیں یا نشہ میں تھے۔ مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آتا۔ سچ سچ بتلا دو کہیں اناپ شناپ تو نہیں خرچ کر ڈالے۔ اس دن تم نے مجھ سے روپے کیوں مانگے تھے؟''

رما کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ رمیش کا قیاس اصلیت کے بہت قریب جا پہنچا تھا، بولا:

''کیا سرکاری روپے خرچ کر ڈالوں گا۔ اس دن آپ سے روپے اس لیے مانگے تھے کہ بابو جی کو ایک ضرورت آن پڑی تھی۔ میں نے آپ کا خط انہیں سنا دیا۔ بہت ہنسے۔ نوٹوں کے غائب ہونے کا تو مجھے خود ہی تعجب ہے۔''

رمیش: ''تمہیں منشی جی سے مانگتے شرم آتی ہو تو میں لکھ کر منگوا لوں؟''

رما نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اس سے کہیں بہتر ہے، آپ مجھے گولی مار دیں۔''

رمیش نے ذرا تامل کر کے کہا۔ ''تمہیں یقین ہے، شام تک روپے مل جائیں گے؟''

رما: ''جی ہاں امید تو ہے۔''

رمیش: ''پھر یہ پانچ سو روپے جمع کر دو، مگر دیکھو بھائی میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں، اگر کل دس بجے تک روپے نہ لائے تو مجھے الزام نہ دینا۔ قاعدہ تو یہی کہتا ہے کہ میں اسی وقت تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں، لیکن تم ابھی لڑکے ہو اس لیے رعایت کرتا ہوں، ورنہ تمہیں معلوم ہے کہ میں سرکاری کاموں میں کسی قسم کی رعایت نہیں کرتا۔ تمہاری جگہ اگر میرا لڑکا یا بھائی بھی ہوتا تو میں اس کے ساتھ بھی یہی برتاؤ کرتا، بلکہ شاید اس سے بھی سخت۔ میرے پاس روپے ہوتے تو تمہیں دے دیتا، لیکن میری عادت تو جانتے ہو، نہ کسی کو قرض دیتا ہوں، نہ کسی سے لیتا ہوں۔ کل روپے نہ آئے تو برا ہوگا۔ میری دوستی بھی تمہیں پولیس کے پنجے سے نہ بچا سکے گی۔ میری دوستی نے تو آج اپنا حق ادا کر دیا، ورنہ اس وقت تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوتیں۔''

''ہتھکڑیاں؟'' رما سر سے پیر تک کانپ اٹھا۔ اس ذلت اور رسوائی کا خیال کر کے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ سزا یافتہ قیدی کی طرح اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مگر وہ لفظ رہ رہ کر اس کے دل کو مسوس لیتا تھا۔

(20)

رما شام کو دفتر سے چلنے لگا تو رمیش بابو دوڑے ہوئے آئے اور کل روپے لانے کی سخت تاکید کی۔ رما دل میں جھنجھلا اٹھا۔ آپ بڑے ایماندار کی دم بنے ہیں۔ مکار کہیں کا۔ اگر اپنی ضرورت آ پڑے تو دوسروں کے تلوے سہلاتے پھریں گے، مگر میرا کام ہے تو آپ اصول پرور بن بیٹھے۔ یہ سب دکھانے کے دانت ہیں۔ مرنے کے وقت اس کی جان بھی جلد نہ نکلے گی۔

کچھ دور جا کر اس نے سوچا۔ ایک بار پھر رتن کے پاس چلوں۔ وہ جب اس کے بنگلے پر پہنچا تو وہ اپنے باغیچہ میں چبوترے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک گھرتی جوہری بیٹھا ہوا تھا۔ صندوق سے گہنے نکال نکال کر دکھا رہا تھا۔ رما کو دیکھ کر وہ بہت ہی خوش ہوئی۔

''بابو جی دیکھئے سیٹھ جی کیسی اچھی اچھی چیزیں لائے ہیں۔ اس ہار کے دام بارہ سو روپے بتلاتے ہیں؟''

رما نے ہار کو ہاتھ میں لے کر دیکھا اور کہا۔ ''ہاں چیز تو اچھی معلوم ہوتی ہے۔''

رتن: ''دام بہت کہتے ہیں۔''

جوہری: ''بائی جی ایسا ہار اگر کوئی دو ہزار میں لا دے تو جو جرمانہ کہیے دوں۔ میں نے تو لاگت بتلائی ہے۔''

رما نے مسکرا کر کہا۔ ''ایسا نہ کہیے، سیٹھ جی جرمانہ دینا پڑے گا۔''

جوہری: ''نہ بابو صاحب! ہار تو سو روپیہ میں آ جائے گا اور بالکل ایسا ہی۔ بلکہ چمک دمک میں اس سے بڑھ کر۔ مگر مال پرکھنا چاہیے۔ میں نے خود ہی آپ سے مول تول کی بات نہیں کی۔ مول تول اناڑیوں سے کیا جاتا ہے۔ آپ سے کیا مول تول۔ ہم لوگ نرے روزگاری نہیں ہیں بابو صاحب، آدمی کا مزاج پایا ہے کہ واہ۔''

رتن نے ہار کو للچائی ہوئی نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ ''کچھ تو کم کیجیے سیٹھ جی۔ آپ نے تو جیسے قسم کھائی ہے۔''

رتن: ''اچھا تو ایک بات بتلا دیجیے، کم سے کم آپ اس کا کیا لیں گے؟''

جوہری نے کچھ رنجیدہ ہو کر کہا۔ ''بارہ سو روپے اور بارہ کوڑیاں ہوں گی۔ حضور اسی شہر میں پندرہ سو کی بیچوں گا اور آپ سے کہہ جاؤں گا کس نے لیا۔''

جوہری نے ہار رکھنے کے لیے کیس نکالا۔ رتن کو یقین آ گیا کہ یہ کچھ کم نہ کرے گا۔ بچوں کی طرح بے صبر ہو کر بولی۔ ''آپ تو ایسا سمیٹے لیتے ہیں۔ گویا ہار کو نظر لگ جائے گی۔''

جوہری: ''کیا کروں صاحب۔ جب ایسے دربار میں چیز کی قدر نہیں ہوتی تو رنج ہوتا ہے۔''

رتن نے کمرے میں جا کر رما کو بلایا اور بولی۔ ''آپ کے خیال میں یہ کچھ اور نیچے اترے گا؟''

رما: ''میرے خیال میں تو یہ چیز ایک ہزار سے زیادہ کی نہیں ہے۔''

رتن: ''اونہہ ہو گا۔ میرے پاس تو چھ سو روپے ہیں۔ آپ چار سو روپے کا انتظام کر دیں تو لے لوں۔ یہ اسی گاڑی سے کاشی جا رہا ہے۔ ادھار نہ مانے گا۔ وکیل صاحب کسی جلسے میں گئے ہوئے ہیں، نو دس بجے سے پہلے نہ لوٹیں گے۔ میں آپ کو کل روپیہ لوٹا دوں گی۔''

رما نے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''یقین مانیے میں اس وقت بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ میں تو آپ سے روپے مانگنے آیا تھا، وہ روپے مجھے دے دیجیے۔ میں آپ کے لیے یہیں سے کوئی اچھا سا ہار لا دوں گا۔ سات آٹھ سو سے زیادہ نہ لگیں گے۔''

رتن: ''چلئے میں آپ کی باتوں میں نہیں آتی۔ چھ مہینے میں ایک کنگن کا جوڑا تو

بنوا نہ سکے، اب ہار کیا لائیے گا۔ میں یہاں کئی دکانیں دیکھ چکی ہوں۔ ایسی چیز شاید ہی کہیں نکلے اور نکلے گی بھی تو اس کے ڈیوڑھے دام دینے پڑیں گے۔''

رما: ''تو اسے کل کیوں نہ بلایئے۔ سودا بیچنے کی غرض ہوگی۔ تو آپ ٹھہرے گا۔''

رتن: ''اچھا۔ کہیے، دیکھئے کیا کہتا ہے؟''

دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ رمانے جوہری سے کہا۔ ''تم کل آٹھ بجے کیوں نہیں آتے؟''

جوہری: ''نہیں حضور! کل کاشی میں دو چار بڑے رئیسوں سے ملنا ہے۔ آج نہ جانے سے بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

رتن: ''میرے پاس تو اس وقت چھ سو روپے ہیں۔ باقی روپے کل لینے ہوں، تو ہار دے دیجیے۔''

جوہری: ''روپے کی تو کوئی بات نہیں۔ مہینہ دو مہینہ میں لے لیتا، لیکن ہم پردیسیوں کا کیا ٹھکانا۔ کون جانے یہاں پھر کب آنا ہو۔ آپ اس وقت ایک ہزار دے دیں۔ دو سو پھر دے دیجیے گا۔''

دفعتاً موٹر کی آواز سن کر رتن نے پھاٹک کی طرف دیکھا۔ وکیل صاحب چلے آ رہے تھے۔ رتن نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''آپ تو نو بجے آنے کو کہہ گئے تھے۔''

وکیل: ''وہاں کورم ہی پورا نہ ہوا۔ بیٹھ کر کیا کرتا۔ کوئی دل سے تو کام کرنا نہیں چاہتا۔ سب مفت میں نام کمانا چاہتے ہیں۔ یہ کیا کوئی جوہری ہے؟''

جوہری نے اٹھ کر سلام کیا۔

وکیل صاحب رتن سے بولے۔ ''کیوں تم نے کوئی چیز پسند کی۔''

رتن: ''ہاں ایک ہار پسند کیا ہے۔ بارہ سو مانگتے ہیں۔''

وکیل: ''بس! اور کوئی چیز پسند کرو۔''

رتن: ''اس وقت تو مجھے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

وکیل صاحب کو رتن سے شوہر کی سی محبت نہیں۔ باپ کی سی محبت تھی، جیسے کوئی محبتی باپ لڑکیوں سے پوچھ پوچھ کر کھلونے لیتا ہے، وہ بھی رتن سے پوچھ پوچھ کر آرائش کے کھلونے لیتے تھے۔ ان کے پاس خوش کرنے کے لیے دولت کے سوا اور چیز ہی کیا تھی، انہیں اپنی زندگی میں ایک مجسم سہارے کی ضرورت تھی۔ ایک مجسم سہارے کی، جس کی قوت سے وہ اس عالم ضعیفی میں بھی کارزار ہستی میں کھڑے رہ سکیں۔ جیسے کسی بڈھے کو لاٹھی کی ضرورت ہوتی ہے یا کسی اپاسک کو مورتی کی۔ بغیر مورتی کے وہ کس پر پھول چڑھائے۔ کسے گنگا جل سے نہلائے۔ کسے لذیذ چیزوں کا بھوگ لگائے۔

رتن نے کیس میں سے ہار نکال کر دکھایا اور بولی۔ ''اس کے بارہ سو مانگے ہیں۔''

وکیل صاحب کی نگاہ میں روپے کی قیمت اس سے پیدا ہونے والی خوشی تھی۔ اگر ہار رتن کو پسند ہے تو انہیں اس کی پروا نہیں کہ اس کے کیا دینے پڑیں گے۔ انہوں نے چیک بک نکال کر جوہری کی طرف دیکھا اور پوچھا: ''سچ سچ بولو کتنا لکھوں اور اگر فرق پڑا تو تم جانو گے۔''

جوہری نے ہار کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا ''ساڑھے گیارہ سو کر دیجیے۔''

وکیل صاحب نے چیک لکھ کر اس کو دیا اور وہ سلام کر کے رخصت ہوا۔

رما کچھ دیر تو بیٹھا۔ وکیل صاحب کے سیاحت یورپ کے تذکرے سنتا رہا۔

آخر مایوس ہو کر چلا آیا۔

(21)

اگر اس وقت کسی کو دنیا میں سب سے زیادہ فکر مند، مصیبت زدہ اور زندگی سے بیزار انسان کی صورت دیکھنی ہو تو اس نوجوان کو دیکھے، جو سائیکل پر بیٹھا ہوا الفریڈ پارک کے سامنے چلا آ رہا ہے۔ اس وقت اگر کوئی کالا سانپ نظر آئے تو وہ غالباً دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے گلے سے لگائے گا اور اس کے زہر کو امرت کی طرح پیئے گا۔ اس کی نجات اب امرت میں نہیں، زہر ہی میں ہے۔ موت ہی اب اس کی فکروں کا خاتمہ کر سکتی ہے، لیکن کیا موت اسے زندگی سے بھی بچا سکتی ہے۔

اگر رما تھا اس وقت بھی جا کر جالپا سے سارا واقعہ بے کم و کاست کہہ سناتا ہو تو وہ اس کے ساتھ ضرور ہمدردی کرتی۔ یقیناً وہ اپنے سارے زیور اس کے سپرد کر دیتی۔ ان زیوروں کو گروی رکھ کر سرکاری روپے ادا کر دیتا۔

دل میں یہی فیصلہ کر کے رما گھر کی طرف چلا، لیکن گھر پہنچ کر اس نے سوچا جب یہی کرنا ہے تو جلدی کیا ہے، جب چاہوں گا مانگ لوں گا۔ کچھ دیر گپ شپ کرتا رہا۔ تب کھانا کھا کر لیٹا۔ دفعتاً اس کے جی میں آیا کیوں نہ چپکے سے کوئی چیز اٹھا کر لے جاؤں۔ خاندانی وقار کی حفاظت کرنے کے لیے اس نے ایک بار یہ چال چلی تھی۔ اس نسخہ سے کیا وہ اپنی جان کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ اپنی زبان سے تو شاید وہ کبھی اپنا پردہ فاش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شش و پنج میں پڑے سویرا ہو

جائے گا اور تب اسے کچھ کہنے کا موقع نہ ملے گا۔

مگر اندیشہ ہوا کہ کہیں جالپا کی آنکھ نہ کھل جائے۔ پھر تو وہ اس کے لیے ترجیبنی کے سوا اور کوئی جگہ ہی نہ رہے گی۔ جو کچھ بھی ہو، ایک بار کوشش کرنا شرط ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ جالپا کا ہاتھ اپنے سینے پر سے ہٹایا اور چارپائی سے اتر کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔ اسے ایسا شبہ ہوا کہ جالپا ہاتھ اٹھاتے ہی چونکی، لیکن پھر معلوم ہوا یہ محض شبہ تھا۔ اب اسے جالپا کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکالنا تھا۔ دیر کرنے کا موقع نہ تھا، لیکن نیند میں بھی حواس ثانی قائم رہتے ہیں۔ بچہ کتنا ہی غافل سویا ہوا ہو، ماں کے چارپائی سے اٹھتے ہی جاگ پڑتا ہے۔ جب وہ چابی نکالنے کے لیے جھکا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ جالپا مسکرا رہی ہے۔ اس نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور لیمپ کی روشنی میں جالپا کے منہ کی طرف تاکنے لگا۔

جالپا کا رہ رہ کر مسکرانا بتلا رہا تھا کہ وہ کوئی دلآویز خواب دیکھ رہی ہے۔ اس تبسم نے گویا رما کے دل کو منور کر دیا۔ اس محبت اور وفا کی دیوی کے ساتھ وہ کتنا کمینہ پن کر رہا ہے۔ جس وقت اسے معلوم ہوگا کہ اس کے گہنے چوری ہو گئے تو اس کی کیا حالت ہوگی۔ وہ کن انکھیوں سے اسے چھاتی پیٹتے اور سر کے بال نوچتے دیکھے گا۔

وہ پھر چارپائی پر لیٹ رہا۔ اسی وقت جالپا کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کے منہ کی طرف دیکھ کر بولی:

''تم کہاں گئے تھے؟ میں بڑا اچھا خواب دیکھ رہی تھی۔ ایک سہانا باغ ہے، ہم تم دونوں اس میں ٹہل رہے ہیں۔ اتنے میں تم نہ جانے کہاں جاتے ہو اور ایک

سادھو آ کر میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی صورت بالکل دیوتاؤں جیسی ہے۔ وہ مجھ سے کہتا ہے، بیٹی! میں تم سے بہت خوش ہوں۔ مجھ سے جو چاہے مانگ لے۔ میں تمہیں ادھر ادھر ڈھونڈ رہی ہوں کہ تم سے پوچھ کر کچھ مانگوں۔ پر تم کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ میں سارا باغ چھان آئی۔ درختوں کی آڑ میں دیکھا، تم نہ جانے کہاں چلے گئے ہو۔ بس اتنے میں نیند کھل گئی، کچھ مانگنے نہ پائی۔''

رما نے مسکرا کر کہا ''کیا مانگتیں؟''

جالپا: ''مانگتی، جو جی میں آتا، تمہیں کیوں بتاؤں؟''

رما: ''میں سمجھ گیا، تم بہت سی دولت مانگتیں۔''

جالپا: ''دولت کو تو تم بہت بڑی چیز سمجھتے ہوگے، میں تو کچھ نہیں سمجھتی۔''

رما: ''ہاں میں تو سمجھتا ہوں۔ مطمئن رہ کر جینا مرنے سے بھی بدتر ہے۔ میں تو اگر کسی دیوتا کو پکڑ پاؤں تو بغیر کافی روپے لیے نہ چھوڑوں۔ میں سونے کی دیوار نہیں کھڑی کرنا چاہتا۔ راک فیلر اور کارنیگی بننے کی مجھے ہوس نہیں ہے۔ صرف اتنی دولت چاہتا ہوں کہ روزمرہ کی ضرورتوں کے لیے ترسنا نہ پڑے۔

بس کوئی دیوتا مجھے پانچ لاکھ روپے دے دے تو میں پھر اس سے کچھ نہ مانگوں گا۔ ہمارے غریب **ملک** میں ایسے کتنے ہی رئیس ہیں، جو پانچ لاکھ سالانہ خرچ کرتے ہیں۔ میں تو اتنے میں ساری عمر کی غلامی لکھنے کو تیار ہوں، مگر مجھے کوئی اتنا بھی نہیں دیتا۔''

جالپا: ''تو پھر تم کیا مانگتیں؟ اچھے اچھے گہنے؟''

جالپا نے ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''کیوں چڑاتے ہو مجھے؟ کیا

میں گہنوں پر اور عورتوں سے زیادہ جان دیتی ہوں؟ میں نے تو کبھی تم سے ضد نہیں کی۔ تمہیں ضرورت ہو آج اٹھا کر لے جاؤ۔ مجھے مطلق ملال نہ ہو گا۔''

رما نے جھینپ مٹاتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر بتلاتی کیوں نہیں؟''

جالپا نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''میں یہی مانگی ہوں کہ تم ہمیشہ مجھ سے محبت کرتے رہو۔ تمہارا دل مجھ سے کبھی برگشتہ نہ ہو۔''

رما نے ہنس کر کہا ''اچھا تو کیا تمہیں یہ خوف بھی ہے؟''

جالپا: ''اوروں کی حالت دیکھ کر مجھے بھی کبھی یہ خوف ہونے لگتا ہے۔ مجھے تو کوئی ایسی عورت نہ ملی، جس نے اپنے شوہر کی بے مہری اور بے التفاتی کا قصہ نہ کہا ہو۔''

یہ کہتے ہوئے جالپا نے رما کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور پیار میں ڈوبی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی:

''سچ بتانا، تم اب بھی مجھے اتنا ہی چاہتے ہو، جتنا پہلے چاہتے تھے؟''

رما نے جالپا کو گلے سے لگا کر کہا۔ ''اس سے کہیں زیادہ، لاکھ گنا۔''

جالپا نے ہنس کر کہا۔ ''بالکل جھوٹ۔ سولہ آنے جھوٹ۔''

رما: ''یہ تمہاری زبردستی ہے۔ آخر یہ تمہیں کیونکر معلوم ہوا؟''

جالپا: ''کیوں میری آنکھیں نہیں ہیں۔ تم نے میرے پاس بیٹھنے کی قسم کھائی ہے۔ جب دیکھو گم صم بیٹھے رہتے ہو۔ مجھ سے محبت ہوتی تو مجھ پر اعتبار بھی ہوتا۔ جس سے تم اپنے دل کی بری سے بری بات نہ کہہ سکو۔ اس سے تمہیں محبت نہیں ہو سکتی۔ تم اس کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھا سکتے ہو۔ عیش کر سکتے ہو۔ اسی طرح جیسے

کوئی بازاری عورتوں کے پاس جاتا ہے۔ وہاں آدمی زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے ہی جاتا ہے۔ اپنے دل کا دکھ کہنے نہیں جاتا۔ میرے ساتھ تمہارا یہی سلوک ہے۔ بولو ہے یا نہیں؟ کیا میں دیکھتی نہیں کہ تم باہر سے کچھ پریشان آتے ہو۔ باتیں کرتے ہو، تو ایسا معلوم ہوتا ہے، دل کہیں اڑا ہوا ہے۔ کھانا بھی اسی طرح کھاتے ہو جیسے بیگار ٹالتے ہو۔ کیا میں یہ ساری باتیں نہیں دیکھتی۔ تمہارے خیال سے مجھے دیکھنا نہ چاہیے۔ تم صرف میرے حسن کے شیدا ہو۔ میرا کام ہے سیرو تفریح کرنا، آرائش میں مصروف رہنا۔ مجھے تمہاری فکروں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ مگر کیا کروں مجھے ایشور نے وہ دل نہیں دیا ہے۔"

وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ جالپا نے اس کی فطرت کا اتنا صحیح مطالعہ کیا ہے، اس کا اسے گمان بھی نہ تھا۔ فی الواقعہ وہ اس کے حسن کا شیدائی تھا، کبھی اس کا حسن باطن دیکھنے کی کوشش نہ کی۔

اگر اس کی صورت اتنی دلکش نہ ہوتی تو شاید وہ اس سے بولنا پسند نہ کرتا۔ اس کی ساری کشش، اس کی ساری مسرت جالپا کے حسن میں مرکوز تھی۔ وہ سمجھتا تھا مگر آج اس پر روشن ہوا کہ اس کی حسن پرستی جالپا کو آسودہ نہیں کرسکتی۔ وہ اس کی شریک درد ہونے کے لیے بے قرار ہے۔ اس وقت اسے اپنا درد کہہ ڈالنے کا اچھا موقع تھا، لیکن شرم نے پھر اس کی زبان بند کردی۔ جو باتیں وہ اتنے دنوں سے چھپائے ہوئے تھا، وہ اب کیسے کہے؟ کیا ایسا کرنا جالپا کے الزاموں کو صحیح تسلیم کرنا نہ ہوگا۔

رما انہی خیالوں میں پڑا سو گیا۔

آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سویا تو اس ارادے سے تھا کہ بہت سویرے اٹھ جاؤں گا، لیکن نیند کھلی تو کمرے میں روشنی پھیل چکی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور بغیر ہاتھ منہ دھوئے کپڑے پہن کر رمیش بابو کے یہاں جانے کو تیار ہو گیا۔ انہیں اب محرم راز بنانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جالپا اس وقت کھانا بنانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ رما کو اس طرح جاتے دیکھ کر اس کے چہرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

رما کے چہرے پر اضطراب اور کلفت اور خوف کی کیفیت نمایاں تھی۔ ان کی یہ کیا حالت ہے؟ اس سے وہ کچھ کہتے کیوں نہیں۔ وہ اور کچھ نہ کر سکے، ہمدردی تو کر ہی سکتی ہے۔ تسکین تو دے ہی سکتی ہے۔ اس کے جی میں آیا، رما کو پکڑ کر پوچھے کیا بات ہے؟ اٹھ کر دروازے تک آئی بھی، لیکن رما تھ سڑک پر دور نکل گیا تھا۔ اس نے دیکھا، وہ بڑی تیزی سے چلا جا رہا ہے، جیسے سنک گیا ہو۔ نہ داہنی طرف تاکتا ہے، نہ بائیں طرف۔ صرف سر جھکائے راہ گیروں سے ٹکراتا، تانگہ اور موٹر کی پروانہ کرتا ہوا بھاگا ہوا چلا جا رہا تھا۔ وہ ایک محویت کے عالم میں کئی منٹ تک دروازے پر کھڑی رہی۔ پھر اندر آ کر کھانا بنانے لگی، لیکن اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھی کہ کیا بات ہے۔ وہ اس سے کیوں اتنا چھپاتے ہیں۔

رما، رمیش کے گھر پہنچا تو آٹھ بج گئے تھے۔ بابو صاحب چوکی پر بیٹھے سندھیا کر رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد سندھیا سے فارغ ہو کر بولے:

”کیا ابھی تک ہاتھ منہ نہیں دھویا۔ یہی لچر پن مجھے ناپسند ہے اور کچھ نہ کرو،

جسم کی صفائی کا تو خیال رکھو۔ کیا ہوا، روپیہ کا کچھ انتظام ہوا؟''

رمانے دل پر جبر کر کے کہا۔ ''اسی فکر میں تو آپ کے پاس آیا ہوں۔''

رمیش: ''تم بھی عجیب آدمی ہو۔ آخر منشی جی سے کہتے تمہیں کیوں شرم آتی ہے۔ یہی تو ہوگا کچھ سخت سست کہیں گے، لیکن اس بلا سے تو نجات مل جائے گی۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ایسے حادثے زندگی میں ہوتے رہتے ہیں۔ نہیں تو چلو میں کہے دیتا ہوں۔''

رما: ''ان سے کہنا ہوتا تو کبھی کا کہہ چکا ہوتا۔ کیا آپ کوئی بندوبست نہیں کر سکتے؟''

رمیش: ''کر کیوں نہیں سکتا، مگر کرنا نہیں چاہتا۔ ایسے آدمی کے ساتھ مجھے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی، جو بات تم مجھ سے کہہ سکتے ہو، کیا ان سے نہیں کہہ سکتے۔ پہلے ان سے کہو۔ اگر روپے نہ دیں، تب میرے پاس آنا۔'' اس بے التفاتی نے رما کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اتنی یگانگت کے باوجود یہ بے دردی اس کے منہ سے کوئی دوسرا لفظ نہ نکلا۔ وہاں سے اٹھ کر چلا، مگر کچھ سود نہ پڑتا تھا۔ چودائی میں آسمان سے گرتے ہوئے پانی کے قطروں کی جو حالت ہوتی ہے، وہی حالت اس وقت رما کی تھی۔ دس قدم تیزی سے آگے چلتا تو پھر کچھ سوچ کر رک جاتا اور دس پانچ قدم پیچھے لوٹ جاتا۔ کبھی اس گلی میں گھس جاتا، کبھی اس گلی میں۔ دفعتاً ایک ترکیب سوجھی۔ کیوں نہ جالپا کو ایک رقعہ لکھ کر سارا ماجرہ کہہ سنائے۔ زبان سے تو وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا، مگر قلم سے لکھنے میں اسے کوئی مشکل نہ ہوتی تھی۔ اس نے سوچا رقعہ لکھ کر جالپا کو دے دوں گا اور باہر کے کمرے میں آ بیٹھوں گا۔ زبانی

گفتگو کا موقع ہی نہ آنے دوں گا۔ وہ بھاگا ہوا گھر آیا اور فوراً رقعہ لکھا:

''جانِ من!

کیا کہوں، کس مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اگر ایک گھنٹہ کے اندر تین سو روپے کا انتظام نہ ہو سکا تو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی۔ میں نے بہت ہاتھ پیر مارے کہ کسی سے قرض لے لوں گا، مگر کوئی صورت نہ نکلی۔ اگر تم اپنے دو ایک زیور دے دو تو میں گروی رکھ کر کام نکال لوں۔ جونہی روپے ہاتھ آ جائیں گے چھڑا دوں گا۔ اگر مجبوری نہ آ پڑتی تو تمہیں تکلیف نہ دیتا۔ ایشور کے لیے ناراض نہ ہونا۔ میں نے تم سے اب تک راز کو چھپایا، اس کا مجھے افسوس ہے۔''

ابھی یہ خط پورا نہ ہوا تھا کہ رمیش بابو مسکراتے ہوئے آ کر بیٹھ گئے اور بولے:

''کہا ان سے تم نے؟''

رما نے سر کھجلا کر کہا۔ ''ابھی تو موقع ہی نہیں ملا۔''

رمیش: ''تو کیا دو چار دن میں موقع ملے گا؟ میں ڈرتا ہوں کہ آج بھی کہیں خالی ہاتھ نہ چلے جاؤ نہیں تو غضب ہی ہو جائے۔''

رما: ''جب ایک بات دل میں طے کر لی تو اب کیا فکر؟''

رمیش: ''آج موقع ملے تو ذرا رتن کے پاس چلے جانا۔ اس دن میں نے کتنا زور دے کر کہا تھا، لیکن شاید تم بھول گئے تھے۔''

رما: ''بھول تو نہیں گیا، ان سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

رمیش: ''واہ رے آپ کی شرم۔ ذلیل تو مجھے وہ سمجھیں گی۔ تمہیں کاہے کی شرم۔ آج دفتر سے لوٹ کر ضرور چلے جانا۔ ذرا زبان ہلا دینے سے کسی غریب کا

کام نکلتا ہو تو ہمیں دریغ نہ کرنا چاہیے۔''

رمیش بابو چلے گئے تو رما نے رقعہ اٹھا کر جیب میں ڈالا اور اندر داخل ہوا۔

جالپا آج کسی سہیلی کے گھر جانے کو تیار تھی۔ تھوڑی دیر ہوئی، بلاوا آیا تھا۔ اپنی بہترین ساڑھی پہنے تھی۔ ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن زیب دے رہے تھے۔ گلے میں چندن ہار کھلا ہوا تھا۔ آئینہ سامنے رکھ کر کانوں میں جھومک پہن رہی تھی۔ کچھ روکھے پن سے بولی:

''آج سویرے کہاں چلے گئے تھے۔ ہاتھ منہ تک نہ دھویا۔ دن بھر تو باہر رہتے ہی ہو، شام سویرے تو گھر پر رہا کرو۔ تم نہیں رہتے تو گھر سونا سونا لگتا ہے۔ میں ابھی سوچ رہی تھی، مجھے میکے جانا پڑے تو میں نہ جاؤں۔ میرا جی تو وہاں بالکل نہ لگے۔''

رما: ''تم تو کہیں جانے کو تیار بیٹھی ہو؟''

جالپا: ''سیٹھانی جی نے بلا بھیجا ہے۔ دوپہر تک چلی آؤں گی۔''

اس وقت رما کی حالت اس شکاری کی سی تھی، جو ہرنی کو اپنے بچوں کے ساتھ کلیلیں کرتے دیکھ کرتنی ہوئی بندوق اپنے کندھوں پر رکھ لیتا ہے اور مادرانہ محبت کا نظارہ دیکھنے میں محو ہو جاتا ہے۔

اسے اپنی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ کر جالپا نے کہا:

''دیکھو مجھے نظر نہ لگا دینا۔ میں تمہاری آنکھوں سے بہت ڈرتی ہوں۔''

رما ایک ہی پرواز میں موجودات کی دنیا سے شعر اور تخیل کی دنیا میں جا پہنچا۔ ایسے موقعوں پر جب جالپا کا دل خوشی سے ناچ رہا تھا، وہ اپنا خط دے کر اس کی

مسرت ناک سرگرمیوں کو خاک میں نہیں ملائے گا۔ وہ کون سا بے رحم صیاد ہے، جو چہکتی ہوئی چڑیا کی گردن پر چھری چلا دے گا۔

وہ کون سا مردہ دل آدمی ہے، جو کسی گل نورس کو توڑ کر پیروں میں کچل دے گا۔ رما اتنا بے رحم اور مردہ دل نہیں ہے۔ وہ کتنی ہی بڑی مصیبت میں کیوں نہ گرفتار ہو جائے، اس کی کتنی ہی رسوائی ہو، اس کی زندگی ہی کیوں نہ تباہ ہو جائے، مگر وہ اتنا بے حس نہیں ہو سکتا۔ اس نے مدہوش ہو کر کہا:

''نظر تو نہ لگاؤں گا۔'' اسی ایک جملہ میں اس کی ساری پریشانیاں اور ساری مشکلیں نظر انداز ہو گئیں۔

وہ اس نادان بچے کی طرح تھا، جو پھوڑے پر نشتر کی عارضی تکلیف کو نہ برداشت کر کے اس کے پھوٹنے، ناسور پڑنے مہینوں چارپائی پر پڑے رہنے کی تکلیف منظور کر لیتا ہے۔

جالپا نیچے جانے لگی تو رما نے فرط محبت سے اسے گلے لگا لیا اور اس طرح بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگا، گویا محبت کے خزانے کو آج ہی لٹا دے گا۔ کون جانتا ہے کہ یہی اس کی آخری ملاقات ہے۔

دفعتاً جالپا بولی۔ ''مجھے کچھ روپے تو دے دو۔ شاید وہاں ضرورت پڑے؟''

رمانے چونک کر کہا۔ ''روپے، روپے تو اس وقت نہیں ہیں۔''

جالپا: ''نہیں ہیں، مجھ سے بہانہ کر رہے ہو، بس مجھے دو سو روپے دے دو۔ زیادہ نہیں چاہتی۔''

یہ کہہ کر اس نے رما کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا اور کچھ پیسوں کے ساتھ وہ رقعہ

بھی نکال لیا۔

رمانے ہاتھ بڑھا کر رقعے کو جالپا کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کر کے کہا:

''یہ کاغذ مجھے دے دو، سرکاری کاغذ ہے۔''

جالپا: ''کس کا خط ہے، بتا دو؟''

پھر اس نے تہہ کیے ہوئے پرزے کو کھول کر کہا:

''یہ سرکاری کاغذ ہے؟ جھوٹے کہیں کے۔ یہ تمہارا ہی لکھا.........!''

رما: ''دے دو۔''

رمانے پھر کاغذ چھین لینا چاہا، مگر جالپا نے ہاتھ پیچھے پھیر کر کہا:

''میں بغیر پڑھے نہیں دوں گی۔ زیادہ ضد کرو گے تو پھاڑ ڈالوں گی۔''

رما: ''اچھا پھاڑ ڈالو۔''

جالپا: ''تب تو میں ضرور پڑھوں گی۔''

اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر پرزہ کھولا اور پڑھنے لگی۔

رمانے دوبارہ اس کے ہاتھ سے رقعہ چھیننے کی کوشش نہیں کی۔ اسے ایسا معلوم ہوا، گویا آسمان پھٹ پڑا ہے اور کوئی خوفناک جانور اسے نگلنے چلا آ رہا ہے۔ وہ دھم دھم کرتے ہوئے اوپر سے اترا اور باہر چلا گیا۔

کہاں اپنا منہ چھپائے۔ کہاں روپوش ہو جائے کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ اس کی حالت کسی برہنہ تن آدمی کی سی تھی۔ افسوس! سارا پردہ کھل گیا۔ اس کی ساری دروغ بیانیوں کا پردہ فاش ہو گیا۔ جن باتوں کو جالپا سے چھپانے کی اس نے اتنے دن کوشش کی، ایسی ایسی مصیبتیں جھیلیں، وہ آج اس کے منہ پر سیاہ داغ بن کر اس

کی تشہیر کر رہی تھیں۔ وہ اب یہاں رہ کر اپنی ذلت اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔

جالپا کی سسکیاں، منشی جی کی جھڑکیاں، ہمسایوں کی چٹکیاں سننے سے مر جانا کہیں آسان تر تھا۔ جب وہ اس دنیا میں نہ رہے گا تو اسے اس کی کیا پروا ہو گی کہ کوئی اسے کیا کہہ رہا ہے۔ ہائے، محض تین سو روپوؤں کے لیے اس کا ستیاناس ہوا جا رہا ہے۔

جالپا سے کتنا بدنیت، کتنا مکار اور کتنا فتنہ ساز سمجھ رہی ہو گی۔ کیا وہ اسے اپنا منہ دکھا سکتا ہے؟ کیا دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے، جہاں وہ ایک نئی زندگی کا نقشہ ڈالے۔ جہاں وہ دنیا سے الگ تھلگ سب سے منہ موڑ کر اپنی زندگی کے دن کاٹ سکے۔ جہاں وہ اس طرح چھپ جائے کہ پولیس اس کا پتا نہ پا سکے۔ گنگا کی گود کے سوا اور کہاں ہے، ایسی جگہ اگر زندہ رہا تو مہینہ دو مہینہ میں ضرور ہی پکڑ لیا جائے گا۔ اس وقت اس کی کیا حالت ہو گی۔ وہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنے ہوئے عدالت میں کھڑا ہو گا۔ سپاہیوں کی ایک فوج اسے گھیرے کھڑی ہو گی۔ سارے شہر کے آدمی اس کا تماشا دیکھ رہے ہوں گے۔ انہی میں جالپا بھی ہو گی۔ رتن بھی ہو گی۔ اس کے ماں باپ، عزیز و اقارب اور دوست آشنا سبھی مختلف انداز سے اس کی ذلت کا تماشا دیکھیں گے۔

نہیں.....وہ اپنی مٹی یوں خراب نہیں کرے گا.... ہرگز نہیں۔ اس سے کہیں بہتر ہے وہ ڈوب مرے۔

مگر پھر خیال آیا کہ جالپا کا کیا حشر ہو گا۔ ماں باپ تو رو دھو کر صبر کر لیں گے،

مگر اس کا دستگیر کون ہوگا؟ کیا وہ چھپ کر کہیں نہیں رہ سکتا۔ کیا شہر سے دور کسی چھوٹے گاؤں میں وہ روپوش نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کبھی جالپا کو اس پر رحم آ جائے۔ اس کی خطائیں معاف کر دے۔ کیا عجب ہے کبھی اس کے دن پھریں، لیکن یہ غیر ممکن ہے کہ وہ اس کے سامنے آنکھیں سیدھی کر سکے۔ نہ جانے اس وقت جالپا کی کیا حالت ہوگی۔ شاید اس رقعہ کا مطلب سمجھ گئی ہو۔ شاید صورت کا اس نے صحیح اندازہ کر لیا ہو۔ شاید اس نے جاگیشری کو وہ رقعہ دکھایا ہو اور دونوں گھبرائی ہوئی اسے تلاش کر رہی ہوں۔ شاید منشی جی کو بلانے کے لیے لڑکوں کو بھیجا گیا ہو۔ چاروں طرف اس کی تلاش ہو رہی ہوگی۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی ادھر بھی نہ آتا ہو۔ شاید موت کو بھی سامنے دیکھ کر وہ اتنا بدحواس نہ ہوتا، جتنا کسی صورت آشنا کو دیکھ کر۔

آگے پیچھے چوکنی نگاہوں سے تاکتا ہوا وہ اس جلتی دھوپ میں چلا جا رہا تھا، کچھ خبر نہیں کہاں۔ دفعتاً ریل کی سیٹی سن کر وہ چونک پڑا۔ ارے میں اتنا دور نکل آیا۔ ریل گاڑی سامنے کھڑی تھی۔ گاڑی نے گویا زبردستی اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ جیسے اس میں بیٹھتے ہی اس کی ساری پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا، مگر جیب میں روپے نہ تھے۔ صرف انگلی میں انگوٹھی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے قلی کو بلا کر کہا:

''کیوں بھائی یہ انگوٹھی بیچ کرا سکتے ہو؟ ایک روپیہ تمہیں دوں گا۔ مجھے گاڑی میں جانا ہے۔ گھر سے روپے لے کر چلا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہیں گر گئے۔ روپے لینے کے لیے گھر جاؤں تو گاڑی نہ ملے گی اور بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔''

قلی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ سمجھ گیا کوئی مفرور ملزم ہے۔ انگوٹھی لی

اور سٹیشن کے اندر چلا گیا۔ رما ٹکٹ گھر کے سامنے ٹہلنے لگا۔ آنکھیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ مگر دس منٹ گزر گئے قلی کا کہیں پتا نہیں۔ کہاں چلا گیا کم بخت۔ انگوٹھی لے کر، غائب تو نہ ہو جائے گا۔ سٹیشن کے اندر جا کر اسے تلاش کرنے لگا۔ گھبراہٹ میں قلی کا نمبر تک نہ دیکھا تھا۔ اِدھر گاڑی چھوٹی جا رہی تھی۔ رما سے صبر نہ ہو سکا۔ سمجھ گیا، قلی نے چپ کا دیا۔ بغیر ٹکٹ لیے ہوئے گاڑی میں جا بیٹھا۔ دل میں طے کر لیا، صاف کہہ دوں گا کہ میرے پاس ٹکٹ نہیں ہے۔ اگر اترنا بھی پڑا تو یہاں سے دس پانچ کوس تو چلا ہی جاؤں گا۔

گاڑی چل دی۔ اس وقت رما کو اپنی حالت پر رونا آگیا۔ افسوس! اسے نہ جانے کبھی لوٹنا بھی نصیب ہو گا کہ نہیں۔ پھر یہ سکھ کے دن کہاں ملیں گے۔ یہ دن تو گئے ہمیشہ کے لیے۔ اسی طرح دنیا سے منہ چھپا کر وہ ایک دن مر جائے گا۔ کوئی اس کی لاش پر آنسو بہانے والا بھی نہ ہو گا۔ گھر والے بھی رو دھو کر چپ ہو رہیں گے۔ صرف تھوڑے سے شک و شبہ کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی۔ اس نے شروع ہی سے جالپا سے اپنی سچائی اور حالت زار بتا دی ہوتی تو آج اسے اپنے منہ پر کالک مل کے نہ بھاگنا پڑتا۔ مگر کہتا کیسے؟ وہ اپنے کو بدنصیب نہ سمجھنے لگی؟ کچھ نہ سہی، کچھ دن تو اس نے جالپا کو سکھی رکھا۔ اس کی خواہشات اور آرزوؤں کا خون تو نہیں کیا ہے؟ رما کو قلبی سکون کے لیے اب اتنا ہی کافی تھا۔

ابھی گاڑی کو چلے دس منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ گاڑی کا دروازہ کھلا اور ٹکٹ چیکر اندر آیا۔

رما کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ایک لمحہ میں اس کے پاس آ جائے

گا۔ اتنے آدمیوں کے سامنے اسے کتنا شرمندہ ہونا پڑے گا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ جیسے جیسے ٹکٹ بابو اس کے قریب آتا تھا، اس کی سانسوں کی رفتار تیز ہوتی جاتی تھی۔ آخر بلا سر پر آ ہی گئی۔ ٹکٹ چیکر نے پوچھا ''آپ کا ٹکٹ؟''

رما نے ذرا سنبھل کر کہا۔ ''میرا ٹکٹ تو قلی کے پاس ہی رہ گیا۔ اسے ٹکٹ لانے کے لیے روپے دیئے تھے، نہ جانے کدھر نکل گیا۔''

ٹکٹ چیکر کو یقین نہ آیا۔ بولا:

''میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ کو اگلے سٹیشن پر اترنا ہوگا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

رما: ''سفر تو بڑی دور کا ہے، کلکتہ تک جانا ہے۔''

ٹکٹ چیکر: ''آگے کے سٹیشن پر ٹکٹ لیجیے۔''

رما: ''یہی مشکل ہے میرے پاس پچاس کا نوٹ تھا، کھڑکی پر بڑی بھیڑ تھی۔ میں نے نوٹ اس قلی کو ٹکٹ لانے کے لیے دیا، لیکن وہ ایسا غائب ہوا کہ لوٹا ہی نہیں۔ شاید آپ اسے پہچانتے ہوں۔ وہ قلیوں کا جمعدار ہے۔ لمبا لمبا چیچک رو آدمی ہے۔''

ٹکٹ چیکر: ''اس سلسلے میں آپ لکھا پڑھی کر سکتے ہیں۔ مگر بلا ٹکٹ جا نہیں سکتے۔''

رما نے بڑے ادب اور ملتجی انداز میں کہا۔ ''بھائی صاحب! آپ سے کیا چھپانا، میرے پاس اور روپے نہیں ہیں۔ آپ جیسا مناسب سمجھیں، کریں۔''

ٹکٹ چیکر: ''مجھے افسوس ہے۔ میں قانون وقاعدے سے مجبور ہوں۔''

ڈبے کے سارے مسافر آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔ تیسرا درجہ تھا، زیادہ تر مزدور بیٹھے ہوئے تھے، جو مزدوری کی تلاش میں پورب جارہے تھے۔ وہ ایک بابو کو ٹکٹ چیکر کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھ رہے تھے۔

شاید رما کو ٹکٹ چیکر نے دھکے دے کر اتار دیا ہوتا تو اور بھی خوش ہوتے۔ رما کو زندگی میں کبھی بھی اتنی شرمندگی نہ ہوئی تھی۔ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا۔ ابھی تو اس زندگی کے سفر کی ابتدا ہے۔ نہ جانے آگے کیا کیا مصیبتیں برداشت کرنا ہوں گی۔ کس کس کے ہاتھوں دھوکا کھانا پڑے گا۔ اس کے جی میں آیا کہ گاڑی سے کود پڑے۔ اس جھنجٹ سے تو مر جانا ہی اچھا ہے۔

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے کھڑکی سے سر باہر نکال لیا اور رونے لگا۔

یکا یک ایک بوڑھے آدمی نے، جو اس کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا، پوچھا۔ ''کلکتہ میں کہاں جاؤ گے بابو جی؟''

رما نے سمجھا، یہ گنوار مجھے بنا رہا ہے۔ جھنجلا کر بولا۔ ''تم سے مطلب؟ میں کہیں بھی جاؤں؟''

بوڑھے نے اس کے اس رویہ پر دھیان نہیں دیا اور بولا: ''میں بھی وہیں چلوں گا۔ ہمارا تمہارا ساتھ ہو جائے گا۔'' پھر آہستہ سے بولا۔ ''کرائے کے روپے مجھ سے لے لو۔ پھر وہاں دے دینا۔''

اب رما کو اس پر کچھ اعتبار آیا۔ اس کی طرف غور سے دیکھا۔ کوئی ساٹھ ستر سال کا بوڑھا کھلا ہوا آدمی تھا۔ گوشت تو کیا، ہڈیاں تک گل گئی تھیں۔ مونچھ اور سر

کے بال منڈے ہوئے تھے۔ایک چھوٹی سی گٹھڑی کے سوااس کے پاس اورکوئی اثاثہ بھی نہ تھا۔

رما کو اپنی طرف تاکتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ ''آپ ہاوڑہ ہی اتریں گے یا کہیں اور جائیں گے؟''

رما نے احسان مندانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''بابا! میں اگلے سٹیشن پر اتر جاؤں گا۔ روپے کا کوئی انتظام کر کے پھر آؤں گا۔''

بوڑھا: ''تمھیں کتنے روپے چاہئیں، مجھ سے لے لو۔ میں بھی تو وہیں چل رہا ہوں۔ جب چاہے دے دینا۔ کیا میرے دس پانچ روپے لے کر بھاگ جاؤ گے۔ گھر کہاں ہے؟''

رما: ''میں الہ آباد میں رہتا ہوں۔''

بوڑھے نے عقیدت کے جوش سے کہا۔ ''پراگ راج کی کیا بات ہے۔ میں بھی تربینی کا اشنان کر کے آ رہا ہوں۔ سچ مچ دیوتاؤں کی پور ہے، تو کتنے روپے نکالوں؟''

رما نے شرماتے ہوئے کہا:

''میں چلتے ہی چلتے روپے نہ دے سکوں گا۔ یہ سمجھ لو۔''

بوڑھا مسکرا کر بولا:

''بھیا میرے دس پانچ روپے لے کر تم بھاگ تھوڑے جاؤ گے؟ میں نے تو دیکھا پراگ کے پنڈے جاتریوں کو بنا لکھا پڑھی روپے دے دیتے ہیں۔ دس روپے میں تمہارا کام چل جائے گا؟''

رما نے سر جھکا کر کہا ''ہاں اتنے کافی ہیں۔''

ٹکٹ چیکر کو کرایہ دے کر رما سوچنے لگا۔ یہ بوڑھا کتنا صاف دل، کتنا بے لوث، کتنا نیک نیت واقع ہوا ہے۔ جو لوگ مہذب کہلاتے ہیں، ان میں کتنے آدمی ایسے نکلیں گے، جو اتنی فراخدلی سے کسی مسافر کی مدد کر سکیں۔

دوران گفتگو رما کو معلوم ہوا کہ بوڑھا ذات کا کھٹک ہے۔ کلکتہ میں اس کی سبزی کی دکان ہے۔ اس کا وطن تو بہار ہے، مگر چالیس سال سے کلکتے ہی میں دکان کر رہا ہے۔ دیبی دین نام ہے۔ اس وقت بدری ناتھ کی یاترا کر کے لوٹا جا رہا ہے۔

رما نے تعجب سے پوچھا۔ ''تم بدری ناتھ کی یاترا کر آئے۔ وہاں تو پہاڑوں کی بڑی چڑھائیاں ہیں؟''

دیبی: ''بھگوان کی مرضی ہوتی ہے تو سب کچھ ہو جاتا ہے بابو جی۔ ان کی نگاہ چاہیے۔''

رما: ''تمہارے بال بچے تو کلکتہ ہی میں ہوں گے؟''

دیبی دین نے دردناک تبسم سے کہا۔ ''بال بچے تو سب بھگوان کے گھر چل دیئے۔ چار بیٹے تھے، دو لڑکوں کا تو بیاہ ہو چکا تھا۔ سب چل دیئے۔ میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اپنے بوئے ہوئے بیج کو کسان ہی تو کاٹتا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ پھر ہنسا اور بولا:

''بڑھیا ابھی جیتی ہے۔ دیکھیں ہم دونوں میں پہلے کون چلتا ہے۔ وہ کہتی ہے پہلے میں جاؤں گی۔ میں کہتا ہوں پہلے میں جاؤں گا۔ دیکھیں دونوں میں کس کی

ٹیک رہتی ہے۔ تم کبھی آنا تو دکھاؤں گا۔ اب بھی اسے گہنوں کا شوق ہے۔ سونے کی بالیاں اور سونے کی ہنسلی پہنے دکان پر بیٹھی رہتی ہے۔ جب کہا تیرتھ کر آویں تو بولی۔ تمہارے تیرتھ کے لیے کیا اپنی دکان مٹی میں ملا دوں۔ آدمی کی ہوس ایسی ہوتی ہے، آج مرے کل دوسرا دن۔ مگر دکان نہ چھوڑے گی، نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔ نہ کوئی رونے والا، نہ کوئی ہنسنے والا، مگر ہوس نہیں جاتی۔ اب بھی کوئی نہ کوئی گہنا بنواتی رہتی ہے۔ نہ جانے کب اس کا پیٹ بھرے گا۔ گھر گھر یہی حال ہے۔ جہاں دیکھو ہائے گہنے! ہائے گہنے! گہنے کے پیچھے جان دے دیں۔ گھر کے آدمیوں کو بھوکا ماریں۔ گھر کی چیزوں کو کوڑا کر دیں اور کہاں تک کہوں۔ اپنی آبرو تک بیچ دیں۔ چھوٹے بڑے امیر غریب سبھی کو یہی روگ لگا ہوا ہے۔ کلکتہ میں کہاں کام کرتے ہو بھیا؟''

رما: ''ابھی تو جا رہا ہوں قسمت آزمانے۔ دیکھوں کوئی نوکری چاکری ملتی ہے یا نہیں؟''

دیبی: ''تو پھر میرے یہاں ٹھہرنا۔ نیچے دو کوٹھڑیاں ہیں اور ایک دالان۔ اوپر ایک کوٹھڑی اور چھت ہے۔ آج بیچ دوں تو دس ہزار ملیں۔ اوپر والی کوٹھڑی تمہیں دے دوں گا۔ جب کہیں کام مل جائے، اپنا گھر لے لینا۔ پچاس سال ہوئے گھر سے بھاگ کر ہوڑے آ گیا تھا۔ دانے دانے کو محتاج تھا۔ تب سے سکھ بھی دیکھے اور دکھ بھی دیکھے۔ اب تو یہی کہتا ہوں بھگوان لے چلو۔ ہاں بڑھیا جیتی رہے۔ نہیں تو اس کی دکان کون لے گا۔ گھر کون لے گا اور گہنے کون لے گا؟''

یہ کہہ کر دیبی دین پھر ہنسا۔ وہ اتنا زندہ دل، اتنا خوش مزاج تھا کہ رما تعجب کر

رہا تھا۔ بے بات کی بات پر ہنستا تھا۔ جس بات پر اور لوگ روتے ہیں، اس پر اسے ہنسی آتی تھی۔ اتنی ہی دیر میں اس نے اپنی زندگی کی ساری داستان کہہ سنائی۔ کتنے ہی لطیفے یاد تھے۔ بات بات پر لطیفہ کہتا تھا۔ گویا رما سے برسوں کی ملاقات ہے۔ رما کو بھی اپنے متعلق ایک فرضی قصہ کہنا پڑا۔

دیبی دین: ''تو یہ کہو تم بھی گھر سے بھاگ کر آئے ہو۔ سمجھ گیا۔ گھر میں جھگڑا ہوا ہو گا؟ بہو کہتی ہو گی۔ میرے پاس گہنے نہیں۔ میرے نصیب جل گئے۔ ساس بہو میں ٹھنی رہتی ہو گی۔ تم نہ ادھر سے بول سکتے ہو، نہ ادھر سے۔ جب نہ برداشت ہوئی بھاگ کھڑے ہوئے۔''

رما: ''ہاں بابا! بالکل یہی کیفیت ہے مگر تم نے کیسے تاڑا؟''

دیبی دین ہنس کر بولا: ''یہ بھی ایک علم ہے بھائی۔ بڑی محنت سے آتا ہے۔ ابھی لڑکے بالے تو نہ ہوں گے؟''

رما: ''نہیں، ابھی تو نہیں ہیں۔''

دیبی: ''چھوٹے بھائی ہوں گے؟''

رما حیرت میں آ کر بولا۔ ''ہاں دادا ٹھیک کہتے ہو، تم نے کیسے جانا؟''

دیبی دین پھر قہقہہ مار کر بولا۔ ''یہ سب منتروں کا کھیل ہے۔ سسر مالدار ہے، کیوں؟''

رما: ''ہاں ہے تو۔''

دیبی: ''مگر ہمت نہ ہو گی؟''

رما: ''بہت ٹھیک کہتے ہو دادا، جب سے شادی ہوئی، اپنی لڑکی تک کو تو بلایا

نہیں۔''

دیبی: ''سمجھ گیا بھیا! یہی دنیا کا دستور ہے۔ بیٹے کے لیے کہو چوری کریں، بھیک مانگیں۔ بیٹی کے نام گھر میں کچھ ہے ہی نہیں۔''

تین دن سے رما کو نیند نہیں آئی تھی۔ دن بھر روپوؤں کی فکر میں مارا مارا پھرتا۔ رات بھر تارے گنا کرتا۔ اس وقت سنتے سنتے اسے نیند آ گئی۔ جھپکی لینے لگا۔ دیبی دین نے فوراً اپنی بقچی کھولی۔ اس میں سے ایک دری نکالی اور تختہ پر بچھا کر بولا:

''اس پر لیٹ رہو بھیا! میں تمہاری جگہ بیٹھ جاتا ہوں۔''

رما لیٹ رہا۔ دیبی دین بار بار محبت آمیز نگاہوں سے دیکھتا تھا، گویا اس کا اپنا لڑکا کہیں پردیس سے لوٹا ہو۔

(22)

جب رما ناتھ اوپر سے نیچے اتر رہا تھا۔ اس وقت جالپا کو اس کا ذرا بھی اندیشہ نہ تھا کہ وہ گھر سے بھاگا جا رہا ہے۔ اس نے وہ رقعہ پڑھ لیا تھا۔ اسے ایسا اشتعال ہو رہا تھا کہ جا کر رما کو خوب کھری کھری سنائے، مجھ سے یہ دغا، مگر ایک ہی لمحہ میں اس کا غصہ فرو ہو گیا۔ خیال آیا کہیں ایسا تو نہیں ہوا ہے کہ سرکاری روپے خرچ کر ڈالے ہوں۔ ضرور یہی بات ہے۔ رتن کے روپے صراف کو دے دیئے ہوں گے۔ اس دن رتن کو دکھلانے کے لیے شاید وہ سرکاری روپے اٹھا لائے تھے۔ اسی کو پورا کرنے کے لیے روپوؤں کی ضرورت ہوگی۔ یہ سوچ کر اسے رما پر غصہ آیا۔ یہ مجھ سے کیوں اتنا پردہ کرتے ہیں۔ کیوں مجھ سے بڑھ بڑھ کر باتیں کرتے تھے۔ کیا میں اتنا بھی نہیں جانتی کہ دنیا میں امیر و غریب دونوں ہی ہوتے ہیں۔ کیا سبھی

عورتیں زیوروں سے لدی ہوئی ہوتی ہیں ۔ جب اور ضروری کاموں سے روپے بچتے تب زیور بھی بن جاتے ہیں ۔ پیٹ اور تن کاٹ کر چوری یا بے ایمانی کر کے تو زیور نہیں بنواء جاتے ۔ کیا انہوں نے مجھے اتنا خود غرض سمجھ لیا ہے ۔

اس نے سوچا رما اپنے کمرے میں ہوں گے ۔ چل کر پوچھوں کون کون سے زیور چاہتے ہیں ۔ صورت حال اتنی خطرناک ہے ۔ اس کا خیال کر کے اس کے دل پر غصے کے بجائے خوف طاری ہو گیا ۔ وہ بڑی تیزی سے نیچے اتری ۔ اسے یقین تھا کہ رما نیچے بیٹھے ہوئے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے ، مگر مرے میں آئی تو ان کا پتہ نہ تھا ۔ سائیکل رکھی ہوئی تھی ۔ فوراً دروازے سے جھانکا ۔ سڑک پر بھی نہیں ۔ کہاں چلے گئے ۔ دونوں لڑکے اسکول گئے تھے ۔ کس کو بھیجے کہ جا کر انہیں بلا لاوے ۔ اس کے دل پر موہوم دہشت کا غلبہ ہوا ۔ فوراً اوپر گئی ۔ گلے کا ہار اور ہاتھ کے کنگن رومال میں باندھے ۔ پھر نیچے اتری ۔ سڑک پر آ کر ایک تانگہ لیا اور کوچوان سے بولی :

’’چنگی کچہری چلو ۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اتنی پس و پیش میں کیوں پڑی رہی ؟ کیوں نہ فوراً زیور اتار کر انہیں دے دیئے ۔‘‘

راستہ میں وہ دونوں طرف غور سے دیکھتی جاتی تھی ۔ کیا اتنی جلدی دور نکل آئے ۔ شاید دیر ہو جانے کے باعث وہ بھی آج تانگے پر ہی گئے ہوں ۔ نہیں تو اب تک ضرور مل گئے ہوتے ۔ تانگے والے سے بولی :

’’کیوں جی تم نے ابھی کسی بابو جی کو تانگے پر جاتے دیکھا ہے ؟‘‘

تانگے والے نے کہا :

''ہاں بہوجی، ابھی ادھر سے تو گئے ہیں۔''

جالپا کو کچھ تسکین ہوئی۔ رما کے پہنچتے پہنچتے وہ بھی پہنچ جائے گی۔

کوچوان سے بار بار گھوڑا بڑھانے کو کہتی تھی۔ جب وہ دفتر پہنچی تو گیارہ بج گئے تھے۔ سینکڑوں آدمی اِدھر اُدھر دوڑے نظر آتے تھے۔ کس سے پوچھے؟ کس کے پاس جائے۔ وہ نہ جانے کہاں بیٹھتے ہیں؟

دفتر کا چپڑاسی دکھائی دیا۔ جالپا نے اسے بلا کر کہا:

''سنوجی! ذرا بابو رمانا تھ کوتو بلاؤ؟''

چپڑاسی بولا: ''انہی کو تو بلانے جا رہا ہوں۔ بڑے بابو نے بھیجا ہے۔ آپ کیا ان کے گھر سے ہی آ رہی ہیں؟''

جالپا: ''ہاں میں تو گھر ہی سے آ رہی ہوں۔ ابھی دس منٹ ہوئے، وہ گھر سے چلے گئے ہیں۔''

چپڑاسی: ''یہاں تو نہیں آئے۔''

جالپا کو بڑی تشویش ہوئی۔ ''وہ یہاں بھی نہیں آئے۔ راستے میں بھی نہیں ملے۔ تو پھر گئے کہاں۔''

کسی سانحہ کے خیال سے اس کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ آنکھیں بھر بھر آنے لگیں۔ وہاں بڑے بابو کے سوا اور کسی کو نہ جانتی تھی۔ ان سے ہم کلام ہونے کا اسے بھی کبھی سابقہ نہ پڑا تھ، مگر اس وقت اس کا حجاب رخصت ہو گیا۔ خوف دل کے سارے جذبات پر حاوی ہو جاتا ہے۔

چپڑاسی سے بولی: ''ذرا بڑے بابو سے کہہ دو۔ نہیں چلو میں ہی چلتی ہوں۔''

جالپا کی وضع قطع دیکھ کر چپڑاسی رعب میں آ گیا۔ الٹے پاؤں بڑے بابو کے کمرے کی طرف چلا۔ جالپا اس کے پیچھے ہو لی۔ بڑے بابو خبر پاتے ہی باہر نکل آئے۔

جالپا نے بڑے بابو کو سلام کر کے کہا:

''معاف کیجیے گا بابو جی۔ آپ کو تکلیف ہوئی۔ انہیں گھر سے چلے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہوئے، مگر ابھی یہاں تک نہیں پہنچے۔ آپ سے کچھ کہا تو نہیں؟''

رمیش: ''آپ مسز رماناتھ ہیں؟ مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ وہ تو وقت کے بڑے پابند ہیں۔ تعجب ہے، کہاں رہ گئے؟''

جالپا نے چپڑاسی کی طرف تاکتے ہوئے کہا:

''میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔''

رمیش: ''ہاں ہاں! میرے کمرے میں آ جاؤ۔ کہیں بیٹھے شطرنج کھیل رہے ہوں گے۔''

جالپا: ''نہیں بابو جی! مجھے اندیشہ ہے کہ وہ کہیں اور نہ چلے گئے ہوں۔ ابھی آدھ گھنٹہ ہوا انہوں نے میرے نام ایک پرزہ لکھا تھا (جیب سے پرزہ نکال کر) دیکھئے۔ وہ پرزہ موجود ہے۔ آپ ان پر شفقت کی نگاہ رکھتے ہیں، آپ سے کیا پردہ۔ ان کے ذمے کوئی سرکاری رقم تو نہیں آتی؟''

رمیش نے متعجب ہو کر کہا: ''کیوں، انہوں نے تم سے کچھ ذکر نہیں کیا؟''

جالپا: ''بالکل نہیں۔''

رمیش: ''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آج انہیں تین سو روپے جمع کرنے ہیں۔

پرسوں کی آمدنی انہوں نے جمع نہیں کی تھی۔ روپے تھیلی میں رکھے اور نوٹ جیب میں رکھ کر گھر چلے گئے۔ بازار میں کسی نے جیب سے نوٹ نکال لیے (مسکرا کر) چال چلن کے بارے میں تو مجھے کبھی شک کرنے کا موقع نہیں ملا، مگر جوانی کے جنون میں اگر طبیعت بہک گئی ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔"

جالپا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی "آپ بزرگ ہیں۔ آپ سے کیا عرض کروں مگر جیب سے نوٹوں کا نکل جانا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں۔ ایسے واقعے آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ کسی نے نکال لیے ہوں گے۔ مارے شرم کے انہوں نے مجھ سے کہا نہ ہو گا۔ ذرا سا بھی اشارہ کرتے تو فوراً روپے نکال کر دے دیتی۔ اس میں بات ہی کیا تھی۔"

رمیش: "کیا گھر میں روپے ہیں؟"

جالپا نے بے باکانہ انداز سے کہا: "تین سو چاہئیں نا؟ میں ابھی لے کر آتی ہوں۔"

رمیش: "اگر وہ آ گئے ہوں تو بھیج دینا۔"

جالپا آ کر تانگے پر بیٹھی اور کوچوان سے چوک چلنے کو کہا۔ اس نے اپنا ہار بیچ ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں اس کی کئی سہیلیاں تھیں، جن سے اس کو روپے مل سکتے تھے۔ عورتوں میں باہم بڑا خلوص ہوتا ہے۔ مردوں کی طرح ان کی دوستی محض پان چھوں ہی تک ختم نہیں ہو جاتی، مگر اس کا موقع نہ تھا۔ صرافہ میں پہنچ کر وہ سوچنے لگی۔ کس دکان پر جاؤں۔ خوف ہو رہا تھا۔ ٹھگی نہ جاؤں۔ اس سرے سے اس سرے تک ایک چکر لگا آئی۔ کسی دکان پر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ ادھر وقت بھی

گزرا جاتا تھا۔ آخر ایک دکان پر ایک بوڑھے صراف کو دیکھ کر اس کا حجاب کچھ کم ہوا۔ صراف بڑا گھاگ تھا۔ جالپا کو جھجکتے اور ہچکتے دیکھ کر سمجھ گیا کہ اچھا شکار پھنسا۔

جالپا نے ہار دکھا کر کہا۔ ''میں اسے بیچنا چاہتی ہوں۔''

صراف نے ہار کو ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھا اور بولا۔ ''مال تو چوکھا نہیں ہے، آپ نے کہاں سے بنوایا تھا؟''

جالپا: ''اس سے تمہیں کیا مطلب؟ تمہیں پسند ہے یا لینا ہے تو بتلاؤ کیا دو گے؟''

صراف نے ساڑھے تین سو دام لگائے اور بڑھتے بڑھتے چار سو تک پہنچا۔

چھ سو کی چیز چار سو میں دیتے ہوئے قلق ہو رہا تھا، لیکن مجبوری تھی۔ مارے لالچ کے ہار کو بڑی احتیاط سے پہنا تھا۔ مفت میں دو سو کا نقصان ہو رہا تھا، مگر کوئی علاج نہ تھا۔ روپے لیے اور چل کھڑی ہوئی۔ جس ہار کو اس نے اتنے ارمانوں سے خریدا تھا، اسے آج آدھے داموں بیچ کر اسے ذرا بھی رنج نہ ہوا۔ بلکہ ایک غرور آمیز مسرت ہو رہی تھی۔

جس وقت رما کو معلوم ہوگا کہ اس نے روپے ادا کر دیئے ہیں، انہیں کتنی خوشی ہوگی۔ کہیں دفتر پہنچ گئے ہوں۔ وہ روپے لیے پہنچے، تو بڑا لطف آئے۔

رمیش بابو اسے دیکھ کر بولے۔ ''کیا ہوا، گھر پر ملے؟''

جالپا: ''کیا ابھی تک یہاں نہیں آئے۔ گھر پر تو نہیں ملے۔'' یہ کہہ کر اس نے نوٹوں کا پلندہ رمیش بابو کی طرف بڑھا دیا۔ بڑے بابو نے نوٹوں کو گن کر کہا:

''ٹھیک ہیں، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اب تک ہیں کہاں؟ اگر نہ آنا تھا تو کم

سے کم ایک خط لکھ دیتے، مجھے تو بڑا تردد ہو رہا تھا۔ تم بڑے موقع سے آ گئیں۔ اس وقت تمہاری دور اندیشی اور ذہانت دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ شریف عورتوں کا یہی وطیرہ ہے۔''

جالپا جب گھر چلی تو اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ قد میں کچھ اونچی ہو گئی ہے۔ اس کے جسم میں خون کی حرکت زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ اسے یقین تھا رما اگر مکان پر متفکر بیٹھے ہوں گے، وہ جا کر پہلے انہیں خوب آڑے ہاتھوں لے گی اور خوب شرمندہ کرنے کے بعد یہ خبر سنائے گی، لیکن جب گھر پہنچی تو رما ناتھ کا کہیں نشان نہ تھا۔

جاگیشری نے پوچھا۔ ''کہاں چلی گئی تھیں، دھوپ میں بہو؟''

جالپا: ''ایک کام سے چلی گئی تھی۔ آج انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے؟''

جاگیشری: دفتر گئے ہوں گے۔''

جالپا: ''نہیں دفتر نہیں گئے۔ وہاں سے ایک چپڑاسی پوچھنے آیا تھا۔''

یہ کہتی ہوئی وہ اوپر چلی گئی۔ بچے ہوئے روپے صندوق میں رکھے اور پنکھا جھلنے لگی، مگر گرمی سے جسم پھنکا جا رہا تھا۔ اس کے کان دروازے کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ابھی تک اسے اس کا ذرا بھی اندیشہ نہ تھا کہ رما نے پردیس کی راہ لی ہے۔ چار بجے تک تو جالپا کو بہت زیادہ تردد نہ ہوا، لیکن جوں جوں دن ڈھلنے لگا اس کا انتشار بڑھنے لگا۔ آخر وہ سب سے اونچی چھت پر چڑھ گئی۔ حالانکہ وہ چھت مخدوش ہونے کے باعث کوئی اوپر نہیں جاتا تھا اور وہاں سے چاروں طرف

نظر دوڑائی، لیکن رما کسی طرف سے آتا نہ دکھائی دیا۔

جب شام ہوگئی اور رما گھر نہ آیا تو جالپا کی طبیعت گھبرانے لگی۔ آخر کہاں چلے گئے۔ اگر کسی دوست کے گھر ہوتے تو کیا اب تک نہ لوٹتے۔ معلوم نہیں جیب میں کچھ ہے یا نہیں؟ بیچارے دن بھر سے نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہے ہوں گے۔ وہ پھر پچھتانے لگی۔ ان کا خط پڑھتے ہی اس نے کیوں نہ باہر نکال کر دے دیا۔ کیوں پس و پیش میں پڑ گئی۔ وہ بیچارے مارے شرم کے گھر نہ آتے ہوں گے۔

چراغ جل گئے تو اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ سوچا شاید رتن سے کچھ پتا چلے۔ لیکن اس کے بنگلے پر گئی تو معلوم ہوا آج تو وہ ادھر آئے ہی نہیں۔

تب جالپا نے ان سبھی میدانوں اور پارکوں کو چھان ڈالا۔ جہاں رما کے ساتھ وہ اکثر گھومنے جایا کرتی تھی اور نو بجتے بجتے مایوس ہو کر گھر واپس آئی۔ اب تک اس نے اپنے آنسوؤں کو روکا تھا۔ شاید کچھ امید تھی کہ گھر پر آ گئے ہوں، لیکن جب گھر میں قدم رکھتے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اب تک نہیں آئے، تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ یہ شبہ اب مضبوط ہو گیا کہ وہ کہیں چلے گئے۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید میرے پیچھے آئے ہوں اور پھر چلے گئے ہوں۔ جا کر جاگیشری سے پوچھا:

”آئے ہی نہیں۔ یا دوستوں میں بیٹھے گپ شپ کر رہے ہوں گے۔ گھر تو سرائے ہے۔ دس بجے گھر سے نکلے تھے، اب تک پتا نہیں۔“

جالپا: ”وہ دفتر سے گھر آ کر تب کہیں جاتے تھے۔ آج تو آئے ہی نہیں۔ دفتر بھی نہیں گئے۔ کہیے تو گوپی بابو کو بھیج دوں۔ جا کر دیکھیں کہاں رہ گئے۔“

جالپا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ دفتر کی کوئی بات اس سے نہ کہی۔ جاگیشری سن کر گھبرا جاتی اور اسی وقت رونا پیٹنا شروع کر دیتی۔ وہ اوپر جا کر لیٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رہ رہ کر ایسی بے قرار ہو جاتی تھی کہ اس کا سانس تیز چلنے لگتا تھا۔ بار بار خیال آتا اگر رات بھر نہ آئے تو کیا کرنا ہوگا۔ جب تک کچھ پتا نہ چلے کہ وہ کدھر گئے تب تک کوئی جائے تو کہاں جائے۔ آج اس کے ضمیر نے پہلی بار تسلیم کیا کہ یہ سب اس کی کرنی کا پھل ہے۔ مانا کہ اس نے زیوروں کے لیے کبھی ضد نہیں کی، لیکن اس نے کبھی صاف طور پر منع بھی تو نہیں کیا۔ اگر چوری ہو جانے کے بعد اس نے کہرام نہ مچایا ہوتا تو آج یہ نوبت کیوں آتی۔ مایوسی کی حالت میں جالپا اپنے ہی کو مطعون کرنے لگی۔ وہ جانتی تھی، رما رشوت لیتا ہے۔ اس کا خرچ آمدنی سے زیادہ ہے۔ پھر بھی اس نے کبھی منع نہیں کیا۔ اس نے خود کیوں اپنی چادر کے باہر پاؤں پھیلایا۔ کیوں اسے روز سیر و تفریح کی سوجھتی تھی۔ جب رما اسے تحفے لا لا کر دیتا ہے تو کیوں پھولی نہ ساتی تھی۔ اس ذمہ داری کو بھی جالپا اس وقت اپنے اوپر ہی لے رہی تھی۔ کیوں اسے یہ سمجھ نہ آئی کہ آمدنی سے زیادہ خرچ کرنے کی سزا ایک دن بھگتنی پڑے گی۔ اب اسے ایسی کتنی ہی باتیں یاد آ رہی تھیں، جن سے رما کی پریشانی اور بے اطمینانی کا اظہار ہوتا تھا، مگر اس نے کبھی ان معاملات کی طرف دھیان نہ دیا۔

جالپا انہی افسوس ناک خیالات میں ڈوبی نہ جانے کب تک بیٹھی رہی۔ جب چوکیداروں کی سیٹیوں کی آواز اس کے کانوں میں آئی، تو وہ نیچے جا کر جاگیشری سے بولی:

''وہ اب تک نہیں آئے۔ آپ چل کر کھانا کھا لیجیے۔''

جاگیشری بیٹھے بیٹھے جھپکیاں لے رہی تھی۔ چونک کر بولی۔ ''کہاں چلے گئے تھے؟''

جالپا: ''وہ تو اب تک نہیں آئے۔''

جاگیشری: ''اب تک نہیں آئے۔ آدھی رات تو ہو گئی ہو گی۔ جاتے وقت تم سے کچھ کہا بھی نہیں؟''

جالپا: '' کچھ بھی نہیں۔''

جاگیشری: ''تم نے تو کچھ نہیں کہا؟''

جالپا: ''میں بھلا کیا کہتی؟''

جاگیشری: ''تو میں تمہارے دادا جی کو جا کر جگاؤں؟''

جالپا: ''اس وقت جگا کر کیا کیجیے گا۔ آپ چل کر خود کھا لیجیے۔''

جاگیشری: ''مجھ سے اب کچھ نہ کھایا جائے گا۔ ایسا من موجی لڑکا ہے کہ کچھ کہا نہ سنا، نہ جانے کہاں بیٹھ رہا۔ کم سے کم کہلا تو دیتا کہ میں اس وقت نہ آؤں گا۔''

جاگیشری پھر لیٹ رہی، مگر جالپا اسی طرح بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ ساری رات گزر گئی۔ پہاڑ سی رات، جس کا ایک پل ایک ایک برس کی طرح کٹ رہا تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ رما کا کہیں پتا نہ تھا۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ۔ بیچارے رمیش بابو دن میں کئی کئی بار آ کر پوچھ جاتے ہیں۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ رمانا تھ گیارہ بجے سٹیشن کی طرف گئے تھے۔ منشی دیانا تھ کا خیال ہے اگر چہ وہ اسے برملا ظاہر نہیں کرتے کہ رما نے خودکشی کر لی۔ ایسی حالتوں میں یہی ہوا کرتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں انہوں نے خود آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ ساس اور سسر دونوں ہی جالپا پر سارا الزام تھوپ رہے ہیں، صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ یہی ان کی جان کی گاہک ہوئی۔ اس نے ان کا ناک میں دم کر دیا۔ پوچھو تھوڑی سی تو آپ کی آمدنی، پھر تمہیں روز سیر سپاٹے، دعوت تماشے کی کیوں سوجھتی تھی۔ جالپا پر کسی کو رحم نہیں آتا۔ کوئی اس کے آنسو نہیں پونچھتا۔ صرف رمیش بابو اس کی دور اندیشی اور مستعدی کی تعریف کرتے ہیں، لیکن منشی دیانا تھ کی آنکھوں میں ان فعلوں کی کوئی وقعت نہیں۔ آگ لگا کر پانی کے لیے دوڑنے سے کوئی بری الذمہ نہیں ہو جاتا۔

ایک دن دیانا تھ کتب خانے سے لوٹے، تو منہ لٹکا ہوا تھا۔ ایک تو ان کی صورت یونہی محرمی تھی، اس پر منہ لٹکا لیتے تھے تو کوئی بچہ بھی کہہ سکتا تھا کہ ان کا مزاج برہم ہے۔ جاگیشری نے پوچھا:

"کیا ہے، کیا کسی سے بحث ہو گئی کیا؟"

دیانا تھ: "نہیں جی! ان تقاضوں کے مارے حیران ہو گیا۔ جدھر جاؤ ادھر نوچنے دوڑتے ہیں۔ نہ جانے کتنا قرض لے رکھا ہے، آج تو میں نے صاف کہہ دیا میں کچھ نہیں جانتا۔ میں کسی کا دیندار نہیں، جا کر میم صاحب سے مانگو۔"

اسی وقت جالپا آ پڑی۔ یہ الفاظ اس کے کانوں میں پڑ گئے۔ ان سات دنوں میں اس کی صورت ایسی بدل گئی تھی کہ پہچاننا مشکل تھا۔ روتے روتے آنکھیں سوجھ آئی تھیں۔ منشی جی کے یہ بے رحمانہ الفاظ سن کر جیسے زخم پر نمک پڑ گیا۔ بولی:

''ہاں آپ انہیں سیدھے میرے پاس بھیج دیجیے۔ میں یا تو انہیں سمجھا دوں گی یا ان کے دام چکا دوں گی۔''

دیاناتھ نے برہم ہو کر کہا۔ ''کیا دے دو گی تم۔ سات سو تو ایک ہی صراف کے ہیں۔ ابھی کے پیسے دیئے ہیں تم نے۔''

جالپا: ''اس کے گہنے موجود ہیں۔ مشکل سے دو چار بار پہنے گئے ہوں گے، وہ آئے تو میرے پاس بھیج دیجیے۔ میں اس کی چیزیں واپس کر دوں گی۔ بہت ہو گا۔ دو چار روپے تاوان کے لیے لے گا۔''

یہ کہتی ہوئی وہ اوپر جا رہی تھی کہ رتن آ گئی اور گلے سے لگاتے ہوئے بولی:

''کیا اب تک کوئی خبر نہیں ملی؟''

جالپا پر ان الفاظ میں ہمدردی اور محبت کا تسلی بخش اثر ہوا۔ یہ غیر ہو کر اتنی دلگیر ہے اور یہاں اپنے ہی ساس سسر ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہیں۔ ان اپنوں سے تو غیر ہی اچھے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی:

''ابھی تو کچھ خبر نہیں بہن۔''

رتن: ''یہ کیا بات ہوئی۔ تم سے کچھ تکرار تو نہیں ہو گئی؟''

جالپا: ''ذرا بھی نہیں۔ قسم کھاتی ہوں۔ انہوں نے نوٹوں کی چوری ہونے کا مجھ سے ذکر ہی نہیں کیا۔ اگر اشارہ کر دیتے تو میں روپے دے دیتی۔ جب وہ دوپہر

تک نہیں آئے اور میں ان کی تلاش میں دفتر گئی۔تب یہ حقیقت کھلی۔میں نے اسی وقت روپے جمع کرا دیئے۔"

رتن: "میں تو سمجھتی ہوں کہ کسی سے آنکھیں لڑ گئیں۔دس پانچ دن میں آپ ہی پتا لگ جائے گا۔بات سچ نہ نکلے تو جرمانہ دوں۔"

جالپا نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔"کیا تم نے کچھ سنا ہے؟"

رتن: "نہیں سنا تو نہیں، لیکن میرا قیاس ہے۔"

جالپا: "تو تمہارا قیاس بالکل غلط ہے۔مجھے اس پر رتی بھر بھی اعتبار نہیں۔ان میں اور چاہے جتنی برائیاں ہوں، یہ عیب نہیں۔"

رتن نے ہنس کر کہا۔"اس فن میں یہ لوگ بڑے استاد ہوتے ہیں۔تم بیچاری کیا جانو۔"

جالپا: "اگر وہ اس فن میں استاد ہوتے ہیں تو ہم بھی مزاج شناسی کے فن میں کچھ دخل رکھتے ہیں۔میں اسے نہیں مان سکتی۔"

رتن: "اچھا چلو، کہیں گھومنے چلتی ہو؟"

جالپا: "نہیں اس وقت تو مجھے فرصت نہیں ہے۔پھر گھر والے یونہی درپے ہو رہے ہیں۔تب تو زندہ ہی نہیں چھوڑیں گے، کدھر جانے کا ارادہ ہے؟"

رتن: "کہیں نہیں، ذرا بازار تک جانے کا اردہ ہے۔"

جالپا: "کیا لینا ہے؟"

رتن: "جوہریوں کی دکان پر دو ایک چیزیں دیکھوں گی۔بس تمہارے جیسا کنگن چاہتی ہوں۔بابو جی نے بھی کئی مہینے کے بعد روپے لوٹا دیئے۔اب خود

تلاش کروں گی۔''

جالپا: ''میرے کنگن میں ایسے کون سے روپ لگے ہیں۔ بازار میں اس سے بہت اچھے مل سکتے ہیں۔''

رتن: ''میں تو اسی نمونے کے چاہتی ہوں۔''

جالپا: ''اس نمونے کا تو بنا بنایا بہت مشکل سے ملے گا اور بنوانے میں مہینوں کا جھنجٹ۔ اگر صبر نہ آتا ہو تو میرا ہی کنگن لے لو۔ میں پھر بنوا لوں گی۔''

رتن نے اچھل کر کہا: ''واہ کیا تم اپنا کنگن دے دو تو کیا کہنا ہے۔ موسلوں ڈھول بجاؤ۔ چھ سو کا تھا نا؟''

جالپا: ''ہاں تھا تو چھ سو کا، مگر مہینوں صراف کی دکان کی خاک چھاننی پڑی تھی۔ جڑائی تو خود بیٹھ کر کروائی تھی۔ تمہاری خاطر دے دوں گی۔''

جالپا نے کنگن نکال کر رتن کے ہاتھ میں پہنا دیئے۔ رتن کا چہرہ ایسا شگفتہ ہو گیا گویا کسی کنگلے کو پارس مل گیا ہو۔ احسان مندانہ انداز سے بولی:

''تم جتنا کہو، اتنا دے دوں۔ تمہیں دبانا نہیں چاہتی۔ تمہارے لیے یہی کیا کم ہے کہ تم میری اتنی خاطر کر رہی ہو۔ مگر ایک بات ہے ابھی میں سب روپے نہ دے سکوں گی۔ اگر دو سو روپے پھر دے دوں تو کچھ ہرج ہے؟''

جالپا نے فراخدلی سے کہا: ''کچھ بھی ہرج نہیں، کچھ بھی مت دو۔''

رتن: ''نہیں، اس وقت میرے پاس چار سو روپے ہیں۔ یہ میں دیئے جاتی ہوں۔ میرے پاس رہیں گے تو کسی دوسرے کام میں خرچ ہو جائیں گے۔ میرے ہاتھ میں تو روپے ٹکتے ہی نہیں کیا کروں۔ جب تک خرچ نہ ہو جائیں،

میرے سر پر ایک بوجھ سوار رہتا ہے۔''

جالپا کا دل اس وقت مسوس اٹھا۔ اس کی کلائی پر یہ کنگن دیکھ کر رما تھ کیسے خوش ہوتے تھے۔ آج وہ ہوتے تو کیا یہ چیز اس طرح جالپا کے ہاتھ سے نکل جاتی۔ پھر کون جانے کنگن پہننا اسے نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔ اس نے بہت ضبط کیا مگر آنسو نکل ہی آئے۔ رتن اس کے آنسو دیکھ کر بولی:

''اس وقت رکھ لو بہن! پھر لے لوں گی۔ جلدی ہی کیا ہے؟''

جالپا نے کنگن کی ڈبیا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''کیوں کیا میرے آنسو دیکھ کر، تمہیں خوشی سے دے رہی ہوں نہیں تو یہ چیز جان سے زیادہ مجھے عزیز تھی۔ تمہارے ہاتھ میں دیکھ کر مجھے اتنی ہی خوشی ہوگی جتنی اپنے ہاتھوں میں دیکھ کر۔ ہاں اتنی مہربانی کرنا کہ کسی دوسرے کو مت دے دینا۔''

رتن: ''کسی دوسرے کو کیوں دینے لگی۔ میں اسے تمہاری نشانی سمجھوں گی۔ آج بہت دنوں کے بعد میری دلی تمنا پوری ہوئی۔ رنج اتنا ہی ہے کہ بابو جی اس وقت نہیں ہیں۔ میرا دل تو کہتا ہے، وہ جلد ہی آجائیں گے۔ مارے شرم کے کہیں چلے گئے ہیں۔ اور کوئی بات نہیں۔ وکیل بڑے کٹھ کلیجے ہوتے ہیں مگر ان کی تو یہ حالت ہے کہ کوئی دردناک بات سنی اور تڑپ اٹھے۔''

جالپا نے مسکرا کر کہا۔ ''ایک بات پوچھوں؟ برا تو نہ مانو گی۔ وکیل صاحب سے تمہارا دل تو نہ ملتا ہوگا؟''

رتن کا شگفتہ بشاش چہرہ ذرا دیر کے لیے تاریک ہوگیا۔ گویا کسی نے ایک ایسے دوست کی یاد دلا دی ہو، جس کے نام کو وہ بہت پہلے بھول چکی تھی۔ بولی:

''بہن! مجھے تو کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ میں جوان ہوں اور یہ بوڑھے۔ میرے دل میں جتنی محبت جتنا ایثار ہے، وہ سب میں نے ان کے اوپر قربان کر دیا۔ محبت جوانی یا دولت یا شکل وصورت سے نہیں پیدا ہوتی۔ محبت محبت سے پیدا ہوتی ہے۔ میرے ہی لیے وہ اس عمر میں اتنی محنت کرتے ہیں اور دوسرا ہے ہی کون۔ کیا جھوٹی بات ہے۔ کل کہیں گھومنے چلو گی۔ کہو تو شام کو آؤں؟''

جالپا: ''جاؤں گی تو میں کہیں نہیں۔ مگر تم آنا ضرور۔ دو گھڑی دل بہلے گا۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ برے برے خیال آتے رہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا انہیں مجھ سے اتنا حجاب کیوں تھا۔ شاید یہ بھی میری ہی خطا ہے۔ مجھ میں ضرور انہوں نے کوئی ایسی برائی دیکھی ہو گی، جس کے باعث وہ مجھ پر اعتبار نہ کر سکتے تھے۔ مجھے اگر رنج ہے تو یہی کہ وہ مجھے غیر سمجھتے رہے، جس سے ہمیں محبت ہوتی ہے اس سے پردہ نہیں رکھتے۔''

رتن اٹھ کر چلی تو جالپا نے دیکھا کنگن کا بکس میز پر پڑا ہے۔ بولی:

''اسے لیتی جاؤ بہن کیوں چھوڑے جاتی ہو۔''

رتن: ''لے جاؤں گی ابھی کیا جلدی پڑی ہے۔ ابھی پورے روپے تو نہیں دیئے۔''

جالپا: ''نہیں نہیں لیتی جاؤ، میں نہ مانوں گی۔''

مگر رتن سیڑھی سے نیچے اتر گئی اور جالپا ہاتھ میں کنگن لیے کھڑی رہ گئی۔

تھوڑی دیر بعد جالپا نے صندوق سے پانچ سو روپے نکالے اور دیا ناتھ کے پاس جا کر بولی:

"یہ روپے چرن داس کے پاس بھجوا دیجیے۔ باقی روپے بھی دو چار دن میں دے دوں گی۔"

دیاناتھ نے خفیف ہو کر کہا: "روپے کہاں سے مل گئے؟"

جالپا بے باکانہ لہجے میں بولی: "رتن کے ہاتھ اپنا کنگن بیچ دیا۔"

(24)

ایک مہینہ گزر گیا۔ الہ آباد کے سب سے کثیر الاشاعت روزنامہ اخبار میں ایک نوٹس نکل رہا ہے، جس میں رماناتھ کو واپس آنے کی تحریک کی گئی ہے اور اس کا سراغ لگانے والے کو پانچ سو روپے انعام دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مگر ابھی کہیں سے کوئی خبر نہیں آئی۔ جالپا فکر اور غم سے گھلتی جاتی ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر دیاناتھ کو بھی اس پر رحم آنے لگا ہے۔ آخر انہوں نے ایک دن اپنے سمدھی دین دیال کو لکھا۔ آپ آ کر کچھ دنوں کے لیے بہو کو رخصت کرا لے جائیے۔ دین دیال خط پاتے ہی گھبرائے ہوئے آئے، مگر جالپا نے میکے جانے سے انکار کر دیا۔

دین دیال نے کچھ ترش ہو کر کہا: "کیا یہاں پڑے پڑے جان دے دینے کا ارادہ کر لیا ہے؟"

جالپا نے خوددارانہ انداز سے کہا: "اگر جان کو اس طرح جانا ہے تو کون روک سکتا ہے، لیکن میں ابھی مرنے کی نہیں۔ سچ جانیے، غم نصیبوں کو موت بھی نہیں پوچھتی۔"

دین دیال: "آخر چلنے میں ہرج ہی کیا ہے۔ شہزادی اور بسنتی دونوں آئی ہوئی ہیں۔ ان کے ساتھ ہنسنے بولنے سے جی بہلتا رہے گا۔"

جالپا: ''یہاں اماں جی اور لالہ کو چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ جب رونا ہی لکھا تو روؤں گی۔''

دین دیال: ''یہ کیا بہت ہو گئی۔ سنتے ہیں کچھ قرض ہو گیا تھا۔ کوئی کہتا ہے سرکاری رقم کھا گئے تھے۔''

جالپا: ''جس نے آپ سے یہ کہا، اس نے سراسر جھوٹ کہا۔''

دین دیال: ''تو پھر چلے کیوں گئے؟''

جالپا: ''یہ میں بالکل نہیں جانتی۔ مجھے خود تعجب ہوتا ہے۔''

دین دیال: ''منشی دیا ناتھ سے تو کھٹ پٹ نہیں ہو گئی؟''

جالپا: ''لالہ جی کے سامنے تو وہ سر تک نہیں اٹھاتے تھے۔ پان تک نہیں کھاتے تھے۔ کھٹ پٹ کیا ہو گی۔ انہیں گھومنے کا شوق تھا۔ سوچا ہو گا یوں تو کوئی جانے نہ دے گا، چلو بھاگ چلیں۔''

دین دیال: ''شاید ایسا ہی ہو۔ کچھ لوگوں کو دیش بدیش پھرنے ہی کی سنک ہوتی ہے۔ تمہیں یہاں جو تکلیف ہو، صاف صاف کہہ دو۔ خرچ کے لیے کچھ بھیج دیا کروں؟''

جالپا نے تمکنت سے کہا: ''مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے، دادا جی آپ کی دعا سے کسی چیز کی کمی نہیں۔''

دیا ناتھ اور جاگیشری نے جالپا کو سمجھایا، مگر وہ جانے پر راضی نہ ہوئی۔ تب دیا ناتھ جھنجلا کر بولے:

''یہاں پڑے پڑے رونے سے تو اچھا ہے۔''

جالپا: ''کیا وہ کوئی دوسری دنیا ہے یا وہاں جا کر میں کچھ اور ہو جاؤں گی۔ جب ہنسنا تھا تب ہنستی تھی، جب رونا ہے تو روؤں گی۔ رما کالے کوسوں چلے گئے ہوں، لیکن مجھے ہر دم بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ان کا جسم نہیں ہے، لیکن گھر کی ایک ایک چیز میں وہ بسے ہوئے ہیں۔ وہاں یہ تسکین بھی نہ رہے گی۔''

دین دیال سمجھ گئے۔ یہ غرور کی پتلی اپنی ضد نہ چھوڑے گی۔ اٹھ کر باہر چلے آئے۔ شام کو چلتے وقت انہوں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ جالپا کی طرف بڑھا کر کہا:

''اسے رکھ لو، شاید کوئی ضرورت پڑے۔''

جالپا نے سر ہلا کر کہا: ''مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ دادا ہاں آپ کی دعا چاہتی ہوں۔ ممکن ہے آپ کی دعا سے میری مراد بر آئے۔''

دین دیال کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ نوٹ چارپائی پر رکھ کر باہر چلے آئے۔

کنوار کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ ابر کے خشک ٹکڑے کبھی کبھی آسمان پر دوڑتے نظر آ جاتے تھے۔ جالپا چھت پر لیٹی ہوئی ان آسمانی وجودوں کی خوش فعلیاں دیکھا کرتی تھی، وہ طرح طرح کے رنگ بدلتے، بھانت بھانت کے روپ بھرتے، کبھی محبت سے باہم بغلگیر ہو جاتے، کبھی روٹھ کر منہ پھیر لیتے۔ ان بادلوں کے ٹکڑوں میں بھی اسے رما تھ ہی کی تصویر پھرتی نظر آتی۔

مصیبت میں ہماری نگاہیں خودشناسی کی جانب مائل ہو جاتی ہیں۔ جالپا کو اب تک گمان ہوتا تھا کہ ایشور نے اسے اس کی خطاؤں کی سزا دی ہے۔ آخر رما تھ

دوسرے کا گلا دبا کر ہی تو روپے لاتے تھے۔ وہ روپے دیکھ کر کتنی خوش ہوتی تھی۔ انہیں کے لیے تو رماناتھ کو گھر سے بھاگنا پڑا۔ یہ چیزیں اب اس کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح چبھتی تھیں۔

آخر اس نے ایک دن ان سب چیزوں کو جمع کیا۔ مخملی سلیپر، ریشمی موزے، طرح طرح کی بیلیں، فیتے، پن، کنگھیاں، آئینہ، کوئی کہاں تک گنائے۔ اچھا خاصا ایک انبار ہو گیا۔ اس نے ان چیزوں کو گنگا میں ڈبو دینے کا ارادہ کیا۔ اب سے اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوگا۔ انہی تکلفات کے پیچھے آج اس کی یہ درگت ہو رہی ہے۔ آج وہ اس طلسم کو توڑ ڈالے گی۔ ان میں کتنی ہی چیزیں تو اتنی خوبصورت تھیں کہ ان کو پھینکتے ہوئے قلق ہوتا تھا۔ آدھی رات تک وہ ان چیزوں کو اٹھا اٹھا کر رکھتی تھی۔ گویا کسی سفر کی تیاری کر رہی ہو۔ ہاں یہ فی الواقع سفر ہی تھا۔ نمائش سے حقیقت کا، باطل سے حق کا۔ دل میں سوچ رہی تھی، اب اگر ایشور کے فضل و کرم سے وہ پھر لوٹ کر گھر آئے تو وہ نہایت سادہ، بے تکلف زندگی بسر کرے گی۔ حرام کی ایک کوڑی بھی گھر نہ آنے دے گی۔

جوں ہی رات کے چار بجے سڑک پر لوگوں کے آنے جانے کی آہٹ ملنے لگی۔ جالپا نے بقچہ اٹھایا اور اشنان کرنے چلی۔ بقچہ بہت وزنی تھا۔ اسے ہاتھ میں لے کر دس قدم چلنا بھی مشکل ہو گیا۔ بار بار ہاتھ بدلتی تھی۔ یہ خوف ہو رہا تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ بوجھ لے کر چلنے کی اسے کبھی نوبت نہ آئی تھی۔ آخر جب ہاتھ شل ہو گئے تو اپنے بقچے کو پیٹھ پر رکھ لیا اور قدم بڑھا کر چلنے لگی۔ لمبا گھونگھٹ نکال لیا تھا کہ کوئی پہچان نہ سکے۔

وہ گھاٹ کے قریب پہنچی تو روشنی پھیل چکی تھی۔ یکا یک اس نے رتن کو اپنی موٹر پر آتے دیکھا۔ اس نے چاہا کہ سر جھکا کر کترا کر نکل جائے، لیکن رتن نے دور ہی سے پہچان لیا اور موٹر روک کر بولی ''کہاں جا رہی ہو بہن۔ یہ پیٹھ پر بقچہ کیسا ہے؟''

رتن: ''میں تو اشنان کر کے لوٹ آئی۔ لیکن چلو تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ تمہیں گھر پر پہنچا دوں گی۔ لاؤ یہ بقچہ رکھ دو۔''

جالپا: ''یہ کچھ بھاری نہیں ہے، تم جاؤ تمہیں دیر ہو گی۔ میں چلی جاؤں گی۔''

مگر رتن نہ مانی۔ کار سے اتر کر اس کے ہاتھ سے بقچی لے ہی لی اور گاڑی میں رکھتے ہوئے بولی:

''یہ تو بڑا بھاری ہے، کیا بھرا ہے تم نے اس میں؟ کھول کر دیکھوں؟''

جالپا: ''اس میں تمہارے دیکھنے کے لائق کوئی چیز نہیں ہے۔''

رتن نے بقچی کو کھول کر دیکھا تو حیرت میں آ کر بولی:

''ان چیزوں کو کہاں لے جاتی ہو؟''

جالپا نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا:

''انہیں گنگا میں ڈوبا دوں گی۔''

رتن نے اور بھی متعجب ہو کر کہا: گنگا میں؟ کچھ پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔ چلو گھر چلیں۔ ان چیزوں کو رکھ کر پھر لوٹ آنا۔''

جالپا نے قطعی طور پر کہا۔ ''نہیں رتن میں ان چیزوں کو ڈبو کر ہی جاؤں گی۔''

رتن: ''آخر کیوں؟''

جالپا: ''پہلے کار کو بڑھاؤ تو پھر بتاؤں۔''

رتن: ''نہیں پہلے بتا دو۔''

جالپا: ''نہیں یہ غیر ممکن ہے۔ پہلے کار کو بڑھاؤ۔''

جالپا نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا: ''اتنی بات تو تمہیں پہلے ہی سمجھ لینی چاہیے تھی۔ اب یہ چیزیں میرے کس کام کی ہیں۔ انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ جلن ہوتی ہے۔ جب دیکھنے والا ہی نہ رہا تو انہیں رکھ کر کیا کروں گی۔''

رتن نے ایک لمبی سانس کھینچی اور بولی:

''تم بابو جی کے ساتھ بڑی بے انصافی کر رہی ہو بہن! ان چیزوں کو وہ کتنی امنگوں سے لائے ہوں گے۔ تمہارے جسم پر ان کی زیبائش دیکھ کر کتنے خوش ہوں گے۔ ایک ایک چیز ان کی محبت کی یادگار ہے۔ انہیں گنگا میں ڈبا دو گی؟''

جالپا اب فکر میں ڈوب گئی۔ دل سے پس و پیش ہونے لگا، مگر ایک لمحہ میں اس نے فیصلہ کر لیا۔ بولی:

''جب تک یہ چیزیں میری آنکھوں سے دور نہ ہو جائیں گی، میری طبیعت کو سکون نہ ہوگا۔ انہی تکلفات نے میری یہ درگت بنائی ہے۔ یہ محبت کی نشانیاں نہیں۔ میری مصیبت کی گٹھڑی ہے، محبت کا نقش تو میرے دل پر ہے۔''

رتن: ''تمہارا دل بڑا سخت ہے جالپا۔ میں تو شاید ایسا نہ کر سکتی۔''

جالپا: ''ایشور نہ کرے کہ تمہیں ایسا موقع آئے۔ سچ پوچھو تو انہوں نے مجھے کہیں کا نہ رکھا، جو آدمی اپنی بیوی سے پردہ رکھتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں وہ اس سے محبت نہیں کرتا۔ میں بابو جی کی جگہ ہوتی تو یوں ناتا توڑ کر کبھی نہ بھاگتی۔ اپنے دل کا

سارا درد دکھ سناتی اور جو کچھ کرتی ان کے مشورے سے کرتی۔ عورت اور مرد میں پردہ کیسا؟"

رتن نے مسکرا کر کہا: "ایسے مرد تو بہت کم ہوں گے، جو عورت سے اپنا دل کھولتے ہوں۔ جب تم خود دل میں چور رکھتی ہو تو ان سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔"

جالپا نے جھجکتے ہوئے کہا: "میں نے تو اپنے دل میں کبھی چور نہیں رکھا۔"

رتن نے زور دے کر کہا: "جھوٹ بولتی ہو۔ بالکل جھوٹ، اگر تم نے ان پر اعتبار کیا ہوتا تو وہ بھی ضرور کھلتے۔"

جالپا اس الزام کو اپنے سر سے نہ ٹال سکی۔ اسے آج معلوم ہوا کہ پردہ داری کا آغاز پہلے اسی کی جانب سے ہوا تھا۔

گنگا کا کنارہ آ پہنچا۔ موٹر کار رک گئی۔ جالپا اتری اور بقچی کو اٹھانے لگی، مگر رتن نے اس کا ہاتھ ہٹا کر کہا:

"نہیں میں اسے نہ لے جانے دوں گی۔ سمجھ لو ڈوب گئے۔ مجھ پر اتنا رحم کرو، بہن سمجھ کر۔"

جالپا: "بہن کے ناتے تمہارے پیر دھو سکتی ہوں۔ مگر ان کانٹوں کو دل میں نہیں رکھ سکتی۔"

رتن نے بھنویں سکوڑ کر کہا: "کسی طرح نہ مانو گی؟"

جالپا: "نہ۔"

رتن نے بے اعتنائی سے منہ پھیر لیا۔ جالپا نے بقچی اٹھائی اور تیزی سے نیچے

اتر کر اسے پانی میں پھینک دیا۔ اپنے نفس پر فتح پا کر اس کا چہرہ منور ہو گیا۔ آج اسے جتنا غرور اور جتنی مسرت ہوئی، اتنی ان چیزوں کو پا کر بھی نہ ہوئی تھی۔ ان صدہا آدمیوں میں، جو اس وقت اشنان دھیان کر رہے ہیں، شاید کسی کو بھی اپنے باطن میں نورانیت کا ایسا احساس نہ ہوا ہو گا۔ گویا صبح کو سنہری شعاعیں اس کے جسم کے ایک ایک ذرہ میں ناچ رہی ہوں۔

جب وہ اشنان کر کے اوپر آئی تو رتن نے پوچھا: ''ڈبو دیا؟''

جالپا: ''ہاں اور کیا کرتی۔''

رتن: ''بڑی سنگدل ہو۔''

جالپا: ''یہی سنگدلی دل پر فتح پاتی ہے۔ اگر کچھ دن پہلے سنگدل ہو جاتی تو آج یہ دن کیوں آتا۔''

موٹر کار چل پڑی۔

(25)

رما ناتھ کو کلکتے آئے ہوئے دو ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ ابھی تک دیبی دین کے گھر پڑا ہوا ہے۔ اسے ہمیشہ یہی دھن سوار رہتی ہے کہ روپوؤں کا خزانہ کیسے ہاتھ آ جائے۔ طرح طرح کے منصوبے باندھتا ہے۔ طرح طرح کی تدبیریں سوچتا ہے، لیکن گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ ہاں جب خوب اندھیرا ہو جاتا ہے تو وہ ایک بار محلّہ کے کتب خانہ میں ضرور جاتا ہے۔ اپنے شہر اور صوبے کی خبروں کے لیے اس کی طبیعت بے قرار رہتی ہے۔ اس نے وہ نوٹس دیکھا، جو دیانا تھ نے اخباروں میں چھپوایا تھا، لیکن اسے اس پر اعتبار نہ آیا۔ کون جانے پولیس نے اسے

گرفتار کرنے کے لیے یہ جال پھیلایا ہو۔ روپے بھلا کس نے چکائے ہوں گے، غیر ممکن۔

ایک دن اسی اخبار میں رمانا تھ کو جالپا کا ایک خط چھپا ہوا ملا۔ جالپا نے دردناک اور عاجزانہ الفاظ میں اس سے گھر لوٹ آنے کی استدعا کی تھی۔ اس نے لکھا تھا، تمہارے ذمے کسی کی رقم نہیں آتی۔ تم کسی طرح کا اندیشہ مت کرو۔ میں نے پائی پائی بیباق کر دی ہے۔ رما کا دل للچایا، لیکن معاً خیال آیا یہ بھی پولیس کی شرارت ہوگی۔ اس کا کیا ثبوت ہے کہ جالپا ہی نے یہ خط لکھا۔ اگر یہ بھی سچ ہے کہ روپے گھر والوں نے ادا ہی کر دیئے ہوں گے، تو کیا اس حالت میں بھی وہ گھر جا سکتا ہے۔ سارے شہر میں اس کی بدنامی ہو رہی ہوگی۔ پولیس میں اطلاع ہو چکی ہوگی۔ اسے منہ دکھانا مشکل ہو جائے گا۔ اس نے طے کیا، میں نہیں جس سکتا۔ جب تک کم سے کم پانچ ہزار روپے ہاتھ نہ آ جائیں، وہ گھر جانے کا نام نہ لے گا اور اب تک روپے نہیں ادا ہوئے اور پولیس اس کی تلاش میں ہے تو وہ کبھی نہیں گھر جا سکتا۔

دیبی دین کے گھر میں دو کوٹھڑیاں تھیں اور سامنے ایک برآمدہ تھا۔ برآمدے میں دکان تھی۔ ایک کوٹھڑی میں کھانا پکتا تھا، دوسری کوٹھڑی میں برتن بھانڈے رکھے ہوئے تھے۔ اوپر ایک کوٹھڑی تھی اور چھوٹی سی کھلی ہوئی چھت۔ رما اسی بالا خانہ پر رہتا تھا۔ دیبی دین اور اس کی بڑھیا کے رہنے، بیٹھنے اور سونے کا خاص مقام نہ تھا۔ رات کو دکان بڑھ جانے کے بعد وہی برآمدہ خواب گاہ کا کام دیتا تھا۔ دونوں وہیں پڑے رہتے تھے۔ دیبی دین کا کام چلم پینا اور سارا دن گپیں مارنا تھا۔

دکان کا سارا کام بڑھیا کرتی تھی۔ منڈی جا کر مال سٹیشن سے بھیجنا یا لانا، یہ بار بھی اسی کے سر تھا۔ دیہی دین گاہکوں کو پہچانتا تک نہ تھا۔ بیٹھا بیٹھا رامائن، طوطا مینا، رام لیلا یا ماتا مریم کی کہانی پڑھا کرتا تھا۔ جب سے رما آ گیا ہے، بڈھے کو انگریزی پڑھنے کا شوق چرایا ہے۔ سویرے ہی گرامر لے کر آ بیٹھتا ہے اور نو دس بجے تک حروف پڑھتا رہتا ہے۔ بیچ بیچ میں لطیفے بھی سناتا جاتا ہے۔ جن کا ان کے پاس بہت بڑا ذخیرہ ہے، مگر جگو بڑھیا کو رما کا آسن جمانا اچھا نہیں لگتا۔ وہ اسے اپنا منیم تو بنائے ہوئے ہیں۔ حساب کتاب اسی سے لکھواتی ہے، لیکن اتنے ذرا سے کام کے لیے وہ اتنا بڑا بھار نہ اٹھانا چاہتی۔ یہ کام تو وہ گاہکوں سے یونہی کرا لیا کرتی تھی۔ اس لیے رما کا رہنا اسے کھلتا تھا، لیکن رما اتنا منکسر المزاج، اتنا خلیق اور اتنا فرمانبردار ہے کہ وہ اعلانیہ کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ہاں دوسروں پر رکھ کر اشارہ و کنایہ سے اسے سنا سنا کر دل کا بخار نکالتی رہتی تھی۔ رما نے اپنے کو برہمن کہہ رکھا ہے اور مذہبیت کا سوانگ رچائے ہوئے ہے۔ برہمن اور دھرماتما بن کر وہ ان دونوں کو مخدوم بنا سکتا ہے، بڑھیا کے مزاج سے واقف ہے، لیکن کرے کیا۔ بے حیائی کرنے پر مجبور ہے۔ حالات نے اس کی خودداری کا خاتمہ کر دیا ہے۔

ایک دن رما ناتھ کتب خانہ میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اسے رتن نظر آ پڑی۔ رتن کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کی تلاش کر رہی ہے۔ رما کا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رتن کی نگاہ اس پر پڑ جائے۔ یہاں یہ نہ جانے کہاں سے آ پہنچی۔ وہ رتن کی آنکھ بچا کر سر کو جھکائے ہوئے کمرے سے نکل گیا اور پیچھے کے اندھیرے برآمدے میں جہاں ٹوٹے پھوٹے صندوق اور

کرسیاں پڑی تھیں، چھپا کھڑا رہا۔ رتن سے ملنے اور گھر کے حالات پوچھنے کے لیے اس کا دل تڑپ رہا تھا، لیکن مارے شرم کے سامنے نہ آ سکتا تھا۔ اس سے پوچھنے کی کتنی ہی باتیں تھیں۔ خاص کر وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کی نسبت جالپا کے کیا خیالات ہیں۔ اس سے ناراض تو نہیں ہے۔ اسے مکار اور دغا باز تو نہیں سمجھتی۔ روتی تو نہیں ہے۔ دبلی تو نہیں ہو گئی ہے۔ محلّہ کے اور لوگوں کے کیا خیالات ہیں۔ کیا گھر کی تلاشی ہوئی ہے۔ مقدمہ چلا۔ ایسی ہی ہزاروں باتیں اس کے ذہن میں تھیں، مگر منہ کیسے دکھائے۔ وہ جھانک جھانک کر دیکھتا رہا۔ جب موٹر چلی گئی تب اس کے دل سے ایک ہفتہ تک وہ کتب خانہ نہیں گیا، گھر سے نکلا تک نہیں۔

کبھی پڑے پڑے رماناتھ کا جی ایسا گھبراتا کہ تھانہ میں جا کر ساری روئیداد کہہ سنائے۔ جو کچھ ہوتا ہے ہو جائے۔ دو چار سال کی قید اس دائمی حبس سے تو اچھی ہے۔ پھر وہ از سر نو زندگی شروع کرے گا۔ اس کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہو گا، لیکن ایک ہی لمحے میں ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔

اس طرح دو مہینے اور گزر گئے۔ پوس کا مہینہ آ پہنچا۔ رما کے پاس جاڑوں کا کوئی کپڑا نہ تھا۔ گھر سے تو کوئی چیز لایا ہی نہ تھا۔ یہاں بھی کوئی چیز نہ بنوا سکا۔ اب تک تو اس نے دھوتی اوڑھ کر کسی طرح راتیں کاٹیں۔ مگر پوس کے کڑکڑاتے جاڑے لحاف یا کمبل کے بغیر کیسے کٹتے۔ بیچارہ رات بھر گٹھڑی بنا رہتا۔ جب بہت سردی لگتی تو بچھاون اوڑھ لیتا۔ دیبی دین نے اسے ایک پرانی دری بچھانے کو دی تھی۔ اس کے گھر میں شاید یہی سب سے اچھا بستر تھا۔ اس طبقہ کے آدمی چاہے

دس ہزار کے گہنے پہن لیں، شادی بیاہ میں دس ہزار خرچ کر دیں، لیکن بچھاون گودڑ ہی رکھیں گے۔ اس سڑی ہوئی دری سے جاڑا بھلا کیا جاتا، مگر کچھ نہ ہونے سے تو اچھا ہی تھا۔ رما مارے شرم کے دیبی دین سے کچھ کہہ نہ سکتا تھا اور دیبی دین بھی شاید اتنا کثیر نہ برداشت کرنا چاہتا تھا یا ممکن ہے اس کے ذہن میں یہ ضرورت آئی ہی نہ ہو۔ جب دن ڈھلنے لگا تو رما، رات کی تکلیف کا خیال کر کے نیم جان ہو جاتا تھا۔ گویا کالی بلا دوڑی چلی آتی ہو۔ رات کو بار بار کھڑکی کھول کر دیکھتا کہ سویرا ہونے میں کتنی دیر ہے۔

ایک دن شام کو وہ کتب خانہ جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک بڑی کوٹھی کے سامنے ہزاروں کنگلے جمع ہیں۔ مجمع کے اندر گھس کر دیکھا تو معلوم ہوا کوئی سیٹھ جی کمبلوں کا دان کر رہے ہیں۔ کمبل بہت گھٹیا تھے۔ پتلے اور ہلکے مگر خلقت ایک پر ایک ٹوٹی پڑتی تھی۔ رما کے جی میں آیا ایک کمبل لے لوں۔ یہاں مجھے کون جانتا ہے۔ اگر کوئی پہچان بھی لے تو کیا ہرج ہے۔ اگر غریب برہمن خیرات کا مستحق نہیں تو اور کون ہو سکتا ہے، لیکن ایک ہی لمحہ میں اس کی غیرت بیدار ہو اٹھی۔ کچھ دیر وہاں کھڑا تاکتا رہا۔ پھر آگے بڑھ گیا۔ اس کے ماتھے پر تلک دیکھ کر منیم نے سمجھ لیا، یہ برہمن ہے۔ اتنے سارے کنگلوں میں خال خال ہی برہمن تھے۔ برہمنوں کو خیرات دینے کا ثواب کچھ اور ہی ہے۔ منیم دل میں خوش تھا کہ ایک برہمن دیوتا دکھائی تو دیئے، اس لیے جب اس نے رما کو جاتے دیکھا تو بولا:

"پنڈت جی کہاں چلے گئے، کمبل تو لیتے جائیے۔"

رما پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ مجھے ضرورت نہیں۔

یہ کہہ کر پھر وہ بڑھا۔منیم نے سمجھا شاید کمبل گھٹیا دیکھ کر دیوتا جی روٹھے جا رہے ہیں۔ایسے غیرت مند دیوتا اسے اپنی زندگی میں شاید کبھی ملے ہی نہ تھے۔کوئی دوسرا برہمن ہوتا تو دو چار چکنی چپڑی باتیں کرتا اور کوئی اچھا سا کمبل مانگتا۔یہ پنڈت جی بغیر کچھ کہے استغنا کی شان سے چلے جا رہے ہیں تو ضرور کوئی مہاتما ہوں گے۔اس نے لپک کر رما کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا:

''آئیے تو مہاراج! آپ کے لیے چوکھا کمبل رکھا ہے۔یہ تو کنگلوں کے لیے ہے۔''

رما نے دیکھا کہ بغیر مانگے ایک چیز مل رہی ہے بلکہ زبردستی گلے لگائی جا رہی ہے،تو وہ دو چار بار نہیں نہیں،کر کے منیم کے ساتھ اندر چلا گیا۔منیم نے اسے کوٹھی میں لے جا کر تخت پر بٹھا دیا اور ایک بھاری دبیز کمبل ان کی نذر کیا۔رما کی بے نیازی کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے پانچ روپے دکھشنا کے دینا چاہے،مگر رما نے اسے لینے سے صاف انکار کر دیا۔کمبل لے کر ہی اس کا خاندانی غرور مجروح ہو چکا تھا۔دکھشنا کے لیے ہاتھ پھیلانا اس کے لیے غیر ممکن ہو گیا۔

منیم نے حیرت سے کہا:''آپ دکھشنا نہ لیں گے تو سیٹھ جی کو بڑا رنج ہوگا۔''

رما نے خود دارانہ انداز سے کہا۔''آپ کی ضد سے میں نے کمبل لے لیا،لیکن دکھشنا نہیں لے سکتا۔مجھے روپے کی ضرورت نہیں۔جن بابو جی کے گھر ٹھہرا ہوا ہوں وہ مجھے بھوجن دیتے ہیں اور مجھے لے کر کیا کرنا ہے۔''

منیم:''سیٹھ جی مانیں گے نہیں۔''

رما:''آپ میری طرف سے کہہ دیجیے گا۔''

منیم: ''آپ کے تیاگ کا دھنیہ ہے۔ایسے ہی برہمنوں سے دھرم کی مریادا بنی ہوئی ہے۔ کچھ دیر اور بیٹھیے، سیٹھ جی آتے ہی ہوں گے۔آپ کے درشنوں سے بہت پرسن ہوں گے۔ برہمنوں کے پرم بھگت ہیں۔ترکال سندھیا کرتے ہیں، مہاراج تین بجے رات کو گنگا تٹ پر پہنچ جاتے ہیں اور وہاں سے آکر پوجن پر بیٹھ جاتے ہیں۔دس بجے بھگوان کا بھوگ لگاتے ہیں۔دوپہر کو بھوجن پاتے ہیں۔ تین چار بجے سندھیا کرنے چلے جاتے ہیں۔آپ کا استھان کہاں ہے؟''

رمانے پریاگ نہ بتلا کر کاشی بتلایا۔اس پر منیم جی کا اصرار اور بڑھا،لیکن رما کو یہ خوف ہو رہا تھا کہ کہیں سیٹھ جی نے کوئی مذہبی بحث چھیڑ دی تو ساری قلعی کھل جائے گی۔کسی دوسرے دن آنے کا وعدہ کرکے گلا چھڑایا۔

نو بجے وہ کتب خانے سے لوٹا،تو ڈر رہا تھا کہ کہیں دیبی دین نے پوچھا کہ کمبل کہاں سے ملا تو کیا جواب دوں گا۔کوئی بہانہ ضروری تھا۔اس نے سوچا، کہہ دوں گا ایک پہچان والے کی دکان سے ادھار لایا ہوں۔

دیبی دین نے کمبل دیکھتے ہی پوچھا''سیٹھ کروڑی مل کے یہاں پہنچ گئے۔کیا مہاراج؟''

رمانے پوچھا:''کون سیٹھ کروڑی مل؟''

رما کوئی بہانہ نہ کر سکا۔بولا''ہاں منیم جی نے گلے لگا دیا۔سیٹھ جی بڑے دھرماتما آدمی ہیں۔''

دیبی دین نے مسکرا کر کہا۔''بڑے دھرماتما ہیں۔انہی کے تھامے تو تھمی ہے۔ نہیں اب تک مٹ گئی ہوتی۔''

رما: ''کام تو دھرماتماؤں کا کرتے ہیں۔ من کا حال ایشور جانے، جو سارے دن پوجاپاٹ میں لگا رہے، اسے دھرماتما نہیں تو اور کیا کہا جائے۔''

دیبی: ''اسے پاپی کہنا چاہیے۔ مہا پاپی۔ دیا تو کسی کے پیچھے پھٹکنے بھی نہیں پاتی۔ مظلوموں کے ساتھ جتنی کڑائی اس کے مل میں ہوتی ہے اور کہیں نہیں ہوتی۔ آدمیوں کو ہنٹروں سے چربی ملا گھی بیچ کر اس نے لاکھوں کمائے۔ کوئی نوکر ایک منٹ کی بھی دیر کرے تو اس کی مجوری کاٹ لیتا ہے، مگر سال میں دو چار ہزار دان نہ کر دے تو پاپ کا دھن بچے کیسے۔ میں نے تو جتنے پجاری دیکھے، سب کو پتھر ہی پایا۔ پتھر پوجتے پوجتے ان کے دل بھی پتھر ہو جاتے ہیں۔ آدمی کچھ نہ کرے، من میں دیا بنائے رکھے۔ یہی سو دھرم کا ایک دھرم ہے۔''

دن کی رکھی ہوئی روٹیاں کھا کر جب رما کمبل اوڑھ کر لیٹا تو اس کا ضمیر اس پر ملامت کرنے لگا۔ رشوت میں اس نے ہزاروں روپے مارے تھے، مگر کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی اسے باطنی خلش نہ ہوئی تھی۔ رشوت عقل سے، عیاری سے، رعب سے ملتی ہے۔ دان نکمے، پست ہمت اور رنگے سیاروں کا سہارا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا میں اتنا ذلیل ہو گیا ہوں کہ کھانے اور کپڑے کے لیے مجھے خیرات لینا پڑتا ہے۔ وہ دیبی دین کے گھر میں دو مہینے سے پڑا تھا، مگر دیبی دین اسے محتاج نہیں، مہمان سمجھتا تھا۔ رما کے دل میں ایسا ہیجان ہوا کہ اسی وقت تھانہ میں جا کر اپنی سرگزشت کہہ سنائے۔ یہی تو ہوگا کہ دو تین سال کی سزا ہو جائے گی۔ پھر تو دل میں یہ خلش نہ ہوگی۔ کہیں ڈوب ہی کیوں نہ مروں؟ اس طرح زندہ رہنے سے فائدہ ہی کیا۔ نہ گھر کا ہوں، نہ گھاٹ کا، دوسروں کی پرورش تو کیا کروں گا، اپنے ہی لیے

دوسروں کا محتاج ہوں۔ رمانے فیصلہ کیا۔ کل وہ کام کی تلاش میں نکلے گا، جو کچھ ہونا ہے ہو۔

------------اختتام----حصہ اول------

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

☆

(26)

ابھی رما منہ ہاتھ دھو رہا تھا کہ دیبی دین پرائمر لے کر آ پہنچا اور بولا:

''بھیا! یہ تمہاری انگریزی بڑی بکٹ ہے۔ ایس۔ آئی۔ آ ر سر ہوتا ہے۔ تو پی۔ آئی۔ ٹی پٹ کیوں ہو جاتا ہے۔ بی۔ یو۔ ٹی بٹ ہوتا ہے تو پی یو ٹی پٹ کیوں ہوتا ہے۔ تمہیں بھی بڑی کٹھن لگتی ہو گی۔''

رما نے مسکرا کر کہا۔ ''پہلے تو کٹھن لگتی تھی، مگر اب تو آسان معلوم ہوتی ہے۔''

دیبی دین: ''جس دن پرائمر ختم ہو گی، مہابیر جی کو سوا سیر لڈو چڑھاؤں گا۔ پرائمر کا مطلب ہے پرائی استری مر جائے میں کہتا ہوں۔ ہماری مرے۔ پرائی کے مرنے سے ہمیں کیا سکھ۔ تمہارے بال بچے تو ہیں بھیا۔''

رما نے اس انداز سے کہا گویا ہیں لیکن نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ''ہاں ہیں تو۔''

دیبی: ''کوئی چٹھی چپاتی آئی تھی؟''

رما: ''نہ''

دیبی: ''اور تم نے لکھی، ارے تین مہینہ سے کوئی چٹھی ہی نہیں بھیجی۔ گھبراتے نہ ہوں گے لوگ؟''

رما: ''جب تک یہاں کوئی صورت نہ پیدا ہو جائے کیا خط لکھوں؟''

دیبی: ''ارے بھلے آدمی لکھ دو۔ میں یہاں خیریت سے ہوں۔ گھر سے بھاگ آئے ہو۔ ان لوگوں کو کتنی چنتا ہو رہی ہوگی۔ ماں باپ تو ہیں نا؟''

رما: ''ہاں ہیں تو۔''

دیبی دین: ''تو بھیا! آج ہی چٹھی ڈال دو۔ میری بات مانو۔''

رما نے اب تک اپنی اصلیت کو چھپایا تھا۔ اسے کئی بار خواہش ہوئی کہ دیبی دین سے سارا حال کہہ دے، مگر بات ہونٹوں تک آ کر رک جاتی تھی۔ وہ دیبی دین کے منہ سے اس کا فیصلہ سننا چاہتا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا صلاح دیتا ہے۔ اس وقت دیبی دین کی ہمدردی نے اسے مغلوب کر دیا۔ بولا:

''میں گھر سے بھاگ آیا ہوں۔''

دیبی دین نے مونچھوں میں مسکرا کر کہا:

''میں جانتا ہوں۔ گھر والی سے ٹھن گئی ہوگی۔ وہ کہتی ہوگی میں الگ رہوں گی۔ تم کہتے ہوگے میں ماں باپ سے الگ نہ رہوں گا یا گہنوں کے لیے ضد کرتی ہوگی، کیوں؟''

رما نے شرماتے ہوئے کہا:

''کچھ ایسی ہی بات تھی، دادا۔ وہ تو گہنوں کے لیے ضد نہ کرتی تھیں، لیکن پا جاتی تھیں تو خوش ہو جاتی تھیں اور میں محبت کے نشہ میں آ گا پیچھا کچھ نہ سوچتا تھا۔''

دیبی دین کے منہ سے گویا آپ ہی آپ نکل گیا۔

”سرکاری رقم تو نہیں اڑا دی؟“

رما کا سینہ دھک سے ہو گیا۔ وہ سرکاری رقم کا معاملہ اس سے چھپانا چاہتا تھا۔ دیبی دین کے اس سوال نے گویا اس کی سوئی ہوئی فوج پر چھاپہ مار دیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ یکا یک کچھ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کا جواب کیا دوں؟

دیبی دین تاڑ گیا کہ اس نے کوئی دل آزار بات کہہ دی۔ زخم پر مرہم رکھتے ہوئے بولا:

”دل کی لگن بڑی بے ڈھب ہوتی ہے۔ بھیا تم تو ابھی لڑکے ہو۔ غبن کے ہجاروں مقدمے ہر سال ہوتے ہیں۔ تحقیقات کی جائے تو ایک ہی بات نکلے گی۔ گہنا۔ دس بیس وارداتیں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ یہ روگ ہی ایسا ہے۔ عورت منہ سے تو یہی کہتی جاتی ہے کہ یہ کیوں لائے؟ یہ کیوں لائے؟ روپے کہاں سے آئیں گے؟ دل میں پھولی نہیں ساتی۔ یہیں ایک ڈاک بابو رہتے تھے۔ بیچارے نے چھری سے گلا کاٹ لیا۔ ایک دوسرے میاں صاحب کو جانتا ہوں، جن کو پانچ سال کی سزا ہو گئی۔ جیل میں مر گئے۔ ایک تیسرے پنڈت جی کو جانتا ہوں، جنہوں نے افیم کھا کر جان دے دی۔ برا روگ ہے۔ دوسروں کو کیا کہوں۔ میں ہی تین سال کی سزا کاٹ چکا ہوں۔ جوانی کی بات ہے۔ جب اس بڑھیا پر جوبن تھا۔ تاکتی تھی، جو جیسے کلیجہ پر تیر چلا دیتی تھی۔ میں ڈاکیہ تھا۔ منی آرڈر تقسیم کیا کرتا تھا۔ یہ کانوں کے جھومک کے لیے جان کھا رہی تھی۔ کہتی تھی سونے ہی کے لوں گی۔ مجھ پر تو نشہ چھایا ہوا تھا۔ منی آرڈر بہت آتے تھے۔ ایک دن ایک منی آرڈر پر میں نے جھوٹے دسکھت کر کے روپے اڑا لیے۔ کل تیس

روپے تھے، جھونک لا کر دے دیئے۔ اتنی کھس ہوئی کہ کچھ نہ پوچھو، لیکن ایک ہی مہینہ میں چوری پکڑ لی گئی۔ تین سال کی سجا ہو گئی۔ سجا کاٹ کر نکلا تو یہاں بھاگ آیا۔ پھر کبھی گھر نہیں گیا۔ ہاں گھر چٹھی بھیج دی۔ بڑھیا کھت پاتے ہی چلی آئی۔ یہ سب کچھ ہوا مگر گہنوں سے اس کا پیٹ نہیں بھرا۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ بنتا ہی رہتا ہے۔ ایک چٹھی بھیج دو لیکن نہیں پولیس تمہاری ٹوہ میں ہو گی۔ کہیں سراغ مل گیا تو کام بگڑ جائے گا۔ کہو تو میں کسی سے ایک چٹھی لکھا کر بھیج دوں۔''

رما نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں دادا غضب ہو جائے گا۔ پولیس سے زیادہ تو مجھے گھر والوں کا خوف ہے۔''

دیبی: ''ڈر پولیس کا ہے کہ گھر والوں کا۔ گھر والے تو سن کر کھس ہوں گے، پولیس والے سجا کر دیں گے۔''

رما: ''میں سزا سے بالکل نہیں ڈرتا۔ تم سے کہا نہیں۔ ایک دن مجھے کتب خانہ میں جان پہچان کی ایک عورت نظر پڑی۔ ہمارے گھر بہت آتی جاتی تھی۔ ایک بڑے وکیل کی بیوی ہے۔ اسے دیکھتے ہی میری نانی مر گئی۔ ایسا سٹ پٹایا کہ اس کی طرف تاکنے کی بھی ہمت نہ پڑی۔ اگر اس وقت اس سے دو چار باتیں کر لیتا تو گھر کی ساری حالت معلوم ہو جاتی اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہ کرتی۔ میرے گھر میں بھی کسی سے نہ کہتی، لیکن میری ہمت نہ پڑی۔''

دیبی: ''تو پھر اسی کو کیوں نہیں ایک چٹھی لکھتے؟''

رما: ''چٹھی تو مجھ سے نہ لکھی جائے گی۔''

دیبی: ''کب تک چھپے بیٹھے رہو گے؟''

رما: ''دیکھا چاہیے۔''

دیبی: ''پولیس تمہاری ٹوہ میں ہو گی۔''

رما: ''یہی تو خوف ہے۔''

دیبی دین کو تشویش پیدا ہو گئی۔ رما نے سمجھا، شاید پولیس کے خوف نے اسے فکر مند کر رکھا ہے بولا:

''ہاں تم دیکھتے ہو، دن کو میں بہت کم گھر سے نکلتا ہوں، لیکن میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں گھسیٹنا چاہتا۔ میں تو جاؤں گا ہی، تمہیں کیوں الجھن میں ڈالوں۔ سوچتا ہوں کسی ایسے گاؤں میں جا کر رہوں، جہاں پولیس کی ہوا تک نہ ہو۔''

دیبی دین نے غرور سے سر اٹھا کر کہا: ''میرے بارے میں تم کچھ چنتا نہ کرو بھیا! یہاں پولیس سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ کسی پردیسی کو اپنے گھر ٹھہرانا کوئی جرم نہیں ہے۔ ہمیں کیا معلوم کہ اس کے پیچھے پولیس ہے۔ یہ پولیس کا کام ہے۔ پولیس جانے۔ میں پولیس کا مخبر نہیں۔ گوپند انہیں۔ جاسوس نہیں۔ ہاں کہیں بڑھیا سے نہ کہہ دینا۔ نہیں اس کے پیٹ میں پانی نہ پچے گا۔''

دونوں ایک لمحہ تک خاموش رہے۔ تب دیبی دین بولا:

''کہو تو میں تمہارے گھر چلا جاؤں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ میں ادھر ادھر سے سارا حال پوچھ لوں گا۔ تمہارے باپ سے ملوں گا۔ تمہاری ماں کو سمجھاؤں گا۔ تمہاری گھر والی سے بات چیت کروں گا۔ پھر جیسا مناسب سمجھنا کرنا۔''

رما نے اندر سے خوش ہو کر کہا:

''لیکن کیسے پوچھو گے دادا۔ لوگ کہیں گے تمہیں ان باتوں سے مطلب؟''

دیبی دین نے قہقہہ مار کر کہا:

''بھیا اس سے سہل تو اور کوئی کام ہی نہیں۔ ایک جنیو گلے میں ڈالا اور برہمن بن گئے۔ پھر چاہے ہاتھ دیکھو۔ چاہے کنڈلی بانچو۔ چاہے شگون بچارو۔ سب کچھ کر سکتے ہو۔ تمہاری ماں بھیک لے کر آئے گی۔ اسے دیکھتے ہی کہوں گا، ماتا تیرے پتر کو بڑا کشٹ ہے، اتنا سنتے ہی گھر بھر کے لوگ آ جائیں گے۔ تمہاری گھر والی بھی آئے گی۔ اس کا ہاتھ دیکھوں گا۔ میں ان باتوں میں پکا ہوں۔ کچھ کما لاؤں گا۔ دیکھ لینا۔''

رما اس خیال کے مزے لینے لگا۔ جالپا اس وقت رتن کے پاس دوڑی جائے گی۔ دونوں طرح طرح کے سوالات کریں گی۔ کیوں بابا وہ کہاں گئے ہیں۔ اچھی طرح ہیں نا؟ کب تک آئیں گے؟ کبھی بال بچوں کی بھی سدھ آتی ہے کہ نہیں، وہاں کسی حسینہ کے جال میں تو نہیں پھنس گئے؟''

دیبی دین بولا: ''تو صلاح ہے؟''

رما نے اس کا دل ٹٹولنے کے ارادے سے کہا: ''کہاں جاؤ گے دادا! تکلیف ہو گی۔''

دیبی: ''ماگھ اشنان بھی تو کروں گا۔ میں تو کہتا ہوں تم بھی چلو۔ کسی دھرم شالہ میں ٹھہر جائیں گے۔ میں رنگ ڈھنگ دیکھ کر تم سے کہہ دوں گا۔ اگر دیکھنا کہ کوئی کھٹکا نہیں ہے تو گھر چلے جانا۔ کوئی کھٹکا ہو تو میرے ساتھ ہی لوٹ آنا۔''

رمانے ہنس کر کہا: ''کہاں کی بات کرتے ہو دادا، سٹیشن پر اترتے ہی کہیں گرفتار ہو جاؤں تو بس۔''

دیبی نے ذمہ داری کی شان سے کہا: ''گرفتار ہو جانا کیا دل لگی ہے؟ مجھ سے کہو میں تمہیں پراگ راج کے تھانے میں لے جا کر کھڑا کر دوں۔ اگر کوئی ترچھی آنکھوں سے بھی دیکھ لے تو مونچھیں منڈوا لوں۔ ایسی بات ہے بھلا۔ سینکڑوں خونیوں کو جانتا ہوں جو اسی شہر میں رہتے ہیں۔ پولیس کے افسروں کے ساتھ دعوتیں کھاتے ہیں۔ پولیس انہیں جانتی ہے، پھر بھی کچھ نہیں کر سکتی۔ روپیہ بڑی چیز ہے۔''

رمانے کچھ جواب نہ دیا، اس کے سامنے ایک نیا مسئلہ آ کھڑا ہوا۔ جن باتوں کو وہ ناتجربہ کاری کے باعث محال سمجھتا تھا، انہیں دیبی دین نے بچوں کا کھیل بنا دیا۔ اور بوڑھا شیخی بازوں میں نہیں ہے۔ وہ منہ سے جو کچھ کہتا ہے پورا کر دکھاتا ہے، اس نے سوچا کہ میں سچ مچ دیبی دین کے ساتھ گھر چلا جاؤں۔ یہاں کچھ روپے مل جاتے تو سوٹ بنوا لیتا۔ پھر شان سے جاتا۔ وہ اس وقت کا تصور کرنے لگا جب وہ نیا سوٹ پہنے ہوئے گھر پہنچے گا، اسے دیکھتے ہی گوپی اور بشمبر دوڑیں گے۔ بھیا آئے بھیا آئے۔ دادا نکل آئیں گے۔ اماں کو تو پہلے یقین ہی نہ آئے گا، مگر جب دادا جا کر کہیں گے، ہاں آ گیا، تب وہ آنسو بہاتی ہوئی دروازے کی طرف چلیں گی۔ اسی وقت میں پہنچ کر اماں کے پیروں پر گر پڑوں گا۔

جالپا وہاں نہ آئے گی۔ روٹھی ہوئی بیٹھی رہے گی۔ رمانے دل میں وہ باتیں بھی سوچ لیں جو وہ جالپا کو منانے کے لیے کہے گا۔ اس وقت شاید روپے کا ذکر ہی

نہ آئے۔ روپوؤں کا ذکر کرنے میں بھی کو تکلف ہوگا۔ اپنے عزیزوں سے جب کوئی خطا ہو جاتی ہے تو ہم اس کے روبرو اس کا ذکر کر کے اسے شرمندہ کرنا نہیں چاہتے اور..... چاہتے ہیں اس بات کا اسے دھیان ہی نہ آئے۔ اس کے ساتھ اس طرح پیش آتے ہیں کہ اسے ہماری طرف سے ذرا بھی شک نہ ہو۔ وہ بھول کر بھی یہ نہ سمجھے کہ ان کے دل میں میری طرف سے کدورت ہے۔

دیبی دین نے پوچھا ''کیا سوچ رہے ہو، چلو گے؟''

رما نے دبی زبان سے کہا۔ ''تمہارا اتنا اصرار ہے تو چلوں گا، مگر پہلے تمہیں میرے گھر جا کر پوری پوری خبر لانی پڑے گی۔ اگر میرا من نہ بھرا تو میں لوٹ آؤں گا۔''

دیبی دین نے کہا ''منظور۔''

رما نے شرم سے آنکھیں نیچی کر کے کہا۔ ''ایک بات اور ہے مجھے کچھ کپڑوں کی ضرورت پڑے گی۔''

دیبی دین۔ ''بن جائیں گے۔''

رما: ''گھر پہنچ کر تمہارے روپے دے دوں گا۔''

دیبی: ''اور میں تمہاری گورو دکھشنا بھی وہیں دے دوں گا۔''

رما: ''گورو دکھشنا بھی مجھی کو دینی پڑے گی۔ میں نے تمہیں چار حرف انگریزی پڑھا دی۔ اس سے تمہارا کیا بھلا ہوا۔ تم نے مجھے جو تجربے سکھائے، وہ عمر بھر میرے کام آئیں گے۔ منہ پر بڑائی کرنا خوشامد ہے، لیکن دادا، ماں باپ کے بعد جتنی محبت مجھے تم سے ہے، اتنی اور کسی سے نہیں۔ تم نے ایسے گاڑھے وقت

میں میری بانہہ پکڑی، جب میں منجدھار میں جا رہا تھا۔ ایشور ہی جانے اب تک میری کیا حالت ہوئی ہوتی۔ کس گھاٹ لگتا۔"

دیبی دین نے تمسخر سے کہا۔ "اور جو کہیں تمہارے دادا مجھے گھر میں گھسنے ہی نہ دیں تو؟"

رما: "دادا تمہاری اتنی خاطر کریں گے کہ تم اوب جاؤ گے۔ جالپا تمہاری اتنی خدمت کرے گی کہ جوان ہو جاؤ گے۔"

دیبی دین نے ہنس کر کہا۔ "تب تو بڑھیا مارے ڈاہ کے جل مرے گی۔ مانے گی نہیں، نہیں میرا جی تو چاہتا ہے کہ ہم دونوں یہاں سے اپنا ڈیرا ڈنڈا لے کر چلتے اور وہیں سرکی تانتے۔ تم لوگوں کے ساتھ جندگانی آرام سے کٹ جاتی، لیکن اس چڑیل سے کلکتہ نہ چھوڑا جائے گا۔ تو بات پکی ہو گئی۔"

رما: "ہاں پکی ہی ہے۔"

دیبی: "دکان کھلے تو چلیں کپڑے لا دیں۔ آج ہی سلنے کو دے دیں۔"

دیبی دین کے چلے جانے کے بعد رما بڑی دیر تک سنہرے تصورات میں بیٹھا رہا۔ جن جذبات کو اس نے کبھی اپنے دل میں قدم نہ رکھنے دیا تھا۔ جن کی گہرائی، وسعت اور شدت سے وہ اتنا ہراساں تھا کہ اس میں پھسل کر ڈوب جانے کے خوف سے وہ اپنے دل بے قرار کو ادھر بھٹکنے بھی نہ دیتا تھا۔ اسی اتھاہ اور ناپیدا کنار سمندر میں وہ آج پورے لاابالی پن کے ساتھ تیرنے لگا۔ تصور نے اسے کشش عطا کر دی تھی۔ وہ تربنی کی سیر، وہ الفریڈ کی ہوا خوری، وہ خسرو باغ کے مزے، وہ احباب کی مجلسیں، سب یاد آ آ کر اس کے دل کو گدگدانے لگے۔ رمیش اسے دیکھتے

ہی دوڑ کر گلے سے لپٹ جائیں گے۔ احباب پوچھیں گے کہاں گئے تھے۔ یار خوب سیر کی۔ رتن اس کی خبر پاتے ہی دوڑی آئے گی اور پوچھے گی، تم کہاں ٹھہرے تھے بابو جی۔ میں نے تو سارا کلکتہ چھان مارا۔ پھر جالپا کی غمگین صورت سامنے آ کھڑی ہوئی۔

یکا یک دیبی نے آ کر کہا: ''دس بج گئے، چلو بازار ہو آئیں۔''

رما چلنے کو تیار ہوا، لیکن دروازہ تک آ کر رک گیا۔

دیبی دین نے پوچھا ''کیوں رک گئے؟''

رما: ''تمہی چلے جاؤ۔ میں جا کر کیا کروں گا؟''

دیبی: ''کیا ڈر رہے ہو؟''

رما: ''ڈر نہیں رہا ہوں، مگر کیا فائدہ؟''

دیبی: ''میں اکیلا جا کر کیا کروں گا۔ مجھے کیا معلوم تمہیں کون سا کپڑا پسند ہے۔ چل کر اپنی پسند سے لے لو۔''

رما: ''جو کپڑا اچھا ہے لے لینا، مجھے سب پسند ہے۔''

دیبی: ''تمہیں ڈر کس بات کا ہے۔ میں کہتا ہوں پولیس تمہاری طرف تاکے گی بھی نہیں۔''

دیبی دین نے بہت سمجھایا۔ تشفی دی، مگر رما جانے پر راضی نہ ہوا، وہ سوچتا تھا اگر کسی سپاہی نے پکڑ لیا تو دیبی دین کیا کرے گا۔ مانا کہ سپاہی سے اس کی جان پہچان بھی ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ سرکاری معاملے میں بھی دوستی کا حق نبھائے، دیبی دین منت خوشامد کر کے رہ جائے گا، جائے گی میرے سر۔ کہیں پکڑا جاؤں تو

پریاگ کے بدلے جیل جانا پڑے۔ آخر دینی دین لاچار ہوکر اکیلا ہی گیا۔

دینی دین گھنٹے بھر میں لوٹا۔ دیکھا رما چھت پر ٹہل رہا ہے۔ بولا ''کچھ جانتے ہو کے بج گئے، بارہ کا عمل ہے۔ آج روٹی نہ بنے گی کیا؟ گھر جانے کی خوشی میں کھانا پینا چھوڑ دو گے۔ یہ دیکھو کپڑوں کا نمونہ لایا ہوں۔ ان میں سے جونسا پسند کرو گے، لے لوں گا؟''

رمانے نمونوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور بولا:

''اتنے مہنگے کپڑے کیوں لائے؟''

دینی: ''سستے تھے، مگر ولایتی تھے۔''

رما: ''تم ولایتی کپڑے نہیں پہنتے؟''

دینی: ''ادھر بیس سال سے تو نہیں پہنتے۔ ادھر کی بات نہیں کہتا۔ کچھ بیسی دام لگ جاتا ہے مگر روپیہ تو دیس میں رہ جاتا ہے؟''

رمانے شرماتے ہوئے کہا: ''تم اپنے اصول کے بڑے پکے ہو دادا۔''

دینی دین کے چہرے پر عجیب سی رونق آ گئی۔ اس کی بجھی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اکڑ کر بولا:

''جس دیس میں رہتے ہیں۔ جس کا ان جل کھاتے پیتے ہیں۔ اس کے لیے اتنا بھی نہ کریں تو جیسے پر لعنت ہے۔ دو جوان بیٹے اسی سودیشی کی بھینٹ کر چکا ہوں۔ بھیا ایسے ایسے پٹھے تھے کہ تم سے کیا کہوں۔ دونوں بدیشی کپڑوں کی دکان پر تعینات تھے۔ مجال تھی کہ کوئی گاہک دکان پر آ جائے۔ ہاتھ جوڑ کر، گھگیا کر، دھمکا کر، شرمواکر، سب کو پھیر لیتے تھے۔''

بجاجوں نے جا کر کمشنر سے فریاد کی۔ سن کر آگ ہو گیا۔ بیس فوجی گورے بھیجے کہ ابھی جا کر بجار سے پہرے اٹھا دو، گوروں نے دونوں بھائیوں سے آ کر کہا۔ یہاں سے چلے جاؤ، مگر وہ اپنی جگہ سے جو بھر بھی نہ ہلے۔ بھیڑ لگ گئی۔ گورے ان پر گھوڑے چڑھا لائے تھے، مگر دونوں جوان کی طرح ڈٹے کھڑے تھے۔ جب اس طرح کچھ بس نہ چلا تو سبھوں نے ڈنڈے سے پیٹنا شروع کیا۔ دونوں بہادر ڈنڈے کھاتے تھے، پر جگہ سے نہ ملتے تھے۔

جب بڑا بھائی گر پڑا تو چھوٹا اس کی جگہ آ کر کھڑا ہو گیا۔ اگر دونوں اپنے ڈنڈے سنبھال لیتے تو ان بیسیوں کو مار بھگاتے، لیکن ہاتھ اٹھانا تو بڑی بات ہے سر تک نہ اٹھایا۔ آخر چھوٹا بھی وہیں گر پڑا۔ دونوں کو لوگوں نے ہسپتال اٹھا کر بھیجا۔ اسی رات کو دونوں سدھار گئے۔ تمہارے چرن چھو کر کہتا ہوں بھیا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری چھاتی گج بھر کی ہو گئی ہے... یہی امنگ آتی تھی کہ بھگوان نے اوروں کو پہلے نہ اٹھا لیا ہوتا۔ اس بکھت انہیں بھیج دیتا۔ جب جنا جا چلا ہے تو ایک لاکھ آدمی ساتھ تھا۔ بیٹوں کو گنگا کی بھینٹ کر کے میں سیدھا بجاجے میں پہنچا اور اسی دکان پر کھڑا ہوا جہاں دونوں بیروں کی لہاس گری تھی۔ گاہک کے نام چڑیئے کا پوت تک نہ دکھائی دیا۔ آٹھ دن وہاں سے ہلا تک نہیں۔ نہ بھوک تھی، نہ پیاس۔ نویں دن دکانداروں نے قسم کھائی کہ بلایتی کپڑے نہ منگائیں گے۔ تب بجار سے ہٹا۔ تب سے بدیسی دیا سلائی تک گھر میں نہیں لایا۔

رما نے متاثر ہو کر کہا: ''دادا! تم سچے ویر ہو اور وہ دونوں لڑکے بھی سچے جودھا تھے۔''

دینی دین نے اس انداز سے دیکھا، گویا اپنے کو اس تعریف کا مستحق سمجھتا ہے۔ شہیدوں کی شان سے بولا:

''ان بڑے بڑے آدمیوں کے لیے کچھ نہ ہوگا۔ یہ تو رونا جانتے ہیں۔ بڑے بڑے دیش بھگتوں کو بلایتی شراب کے بغیر چین نہیں آتا۔ ان کے گھر میں جا کر دیکھو تو ایک بھی دیسی چیز نہ ملے گی۔ دکھانے کو دس بیس کرتے گاڑھے کے بنوا لیے۔ سب کے سب بھوگ بلاس میں اوندھے ہو رہے ہیں۔ چھوٹے بھی اور بڑے بھی۔ اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم دیس کے لیے مرتے ہیں۔ ارے تم کیا دیس کا ادھار کرو گے۔ پہلے اپنا ادھار تو کرلو۔ غریبوں کو لوٹ کر بلایت کا گھر بھرنا تمہارا کام ہے۔ اسی لیے تمہارا اس دیس میں جنم ہوا ہے۔ ہاں روتے جاؤ۔ بلایتی سرابیں اڑاؤ۔ بلایتی موٹریں دوڑاؤ۔ بلایتی مربے اور اچار چکھو۔ بلایتی برتنوں میں کھاؤ۔ بلایتی دوائیاں پیو۔ بلایتی بھاسا بولو۔ بلایتی ٹھاٹ بناؤ، مگر دیس کے نام کو روتے جاؤ اور اس رونے سے کچھ ہوگا۔ رونے سے ماں دودھ پلاتی ہے۔ شیر اپنا شکار نہیں چھوڑتا۔ روؤ اس کے سامنے جس میں دیا دھرم ہو۔ ایک بار یہاں بڑا بھاری جلسہ ہوا۔ ایک صاحب بہادر کھڑے ہو کر خوب اچھلے کودے۔ جب وہ نیچے آئے تو میں نے پوچھا۔ صاحب! تم دیس کا کیا سوراج دو گے۔ تم بھی بنگلوں میں رہو گے۔ پہاڑوں کی ہوا کھاؤ گے۔ انگریزی ٹھاٹ بنائے گھومو گے۔ اس سوراج سے دیس کا کیا کلیان ہوگا۔ تب بغلیں جھانکنے لگے۔ تمہیں ہجاروں کی طلب چاہیے۔ گریب کسان کو ایک جون سوکھا چینا بھی نہیں ملتا۔ اس کا لہو چوس کر تو سرکار تمہیں ہی دے دیتی ہے۔ کبھی ان غریبوں کا بھی دھیان آتا ہے۔ ابھی

تمہارا راج نہیں ہے۔ تب تم اتنا اینٹھتے ہو۔ جب تمہارا راج ہوگا تب تو تم غریبوں کو پیس کر پی جاؤ گے۔''

رما مہذب جماعت کی یہ فضیحت نہ سن سکا۔ آخر وہ بھی تو اس جماعت کا ایک فرد تھا۔ بولا:

''یہ بات تو نہیں ہے دادا کہ پڑھے لکھے آدمی کسانوں کا دھیان نہیں کرتے۔ ان میں سے کتنے ہی کسان تھے یا ہیں۔ انہیں اگر یقین ہو جائے کہ ہمارے تکلیف اٹھانے سے کسانوں کا کوئی فائدہ ہوگا اور جو بچت ہوگی وہ کسانوں کے لیے خرچ کی جائے گی۔ تو وہ خوشی سے تھوڑے مشاہرے پر کام کریں، لیکن وہ دیکھتے ہیں کہ بچت دوسرے ہی ہڑپ کر جاتے ہیں کہ جب دوسروں ہی کو کھانا ہے تو ہم کیوں نہ کھائیں۔''

دیبی: ''تو سوراج ملنے پر ہجار ہجار دو ہجار پانے والے پھر نہیں رہیں گے۔ وکیلوں کی لوٹ نہیں رہے گی۔ پولیس کی لوٹ بند ہو جائے گی۔''

رما: ''تب سب کام کثرت رائے سے ہوگا۔ اگر کثرت کہے گی کہ سرکاری ملازموں کی تنخواہ گھٹا دی جائے تو گھٹ جائے گی۔ کسانوں کے فائدے کے لیے کثرت جتنے روپے مانگے گی، مل جائیں گے۔ کنجی کثرت رائے کے ہاتھ میں رہے گی اور ابھی دس پانچ برس چاہے نہ ہو، لیکن اس کے بعد کثرت رائے کسانوں اور مزدوروں ہی کی ہوگی۔''

دیبی دین نے مسکرا کر کہا:

''بھیا! تم بھی ان باتوں کو سمجھتے ہو۔ میں نے بھی سوچا تھا بھگوان کرے کچھ

دن ہورجیوں۔اچھا اب کھانا پکاؤ۔شام کو چل کر کپڑے درجی کو دے دیں گے۔"

جب اندھیرا ہو گیا تو دینی دین نے آ کر کہا:"چلو کپڑے سلوا لیں۔"

رما سر پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔چہرہ غمگین تھا۔بولا:"دادا میں گھر نہ جاؤں گا۔"

دینی دین نے تعجب سے پوچھا۔"کیوں کیا بات ہوئی۔"

رما کی آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔بولا:

"کون سامنہ لے کر جاؤں۔مجھے تو ڈوب مرنا چاہیے تھا۔"

یہ کہتے کہتے یہ کھل کر رو پڑا۔وہ دردِ دل جواب تک بے ہوش پڑا تھا،ٹھنڈے پانی کے یہ چھینٹے پا کر ہوش میں آ گیا تھا اور اس کی آہیں تیر کی طرح اس کے سارے وجود کو چھیدے ڈالتی تھیں۔اسی نالہ و زاری کے خوف سے وہ اسے چھیڑتا نہ تھا۔گویا کوئی غم نصیب ماں اپنے بچے کو اس لیے جگاتی ڈرتی ہو کہ وہ فوراً کچھ کھانے کو مانگنے لگے گا۔

(27)

کئی دنوں کے بعد کوئی نو بجے رما کتب خانے سے لوٹ رہا تھا کہ راستے میں اسے کئی آدمی کسی شطرنج کے نقشے کا ذکر کرتے ہوئے ملے۔یہ نقشہ وہاں کے ایک ہندی روزنامہ اخبار میں چھپتا تھا۔اسے حل کرنے کے لیے پچاس روپے انعام کا وعدہ تھا۔ان آدمیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ نقشہ بہت مشکل ہے۔یہ بھی معلوم ہوا کہ وہاں کے کتنے ہی مشاق شطرنج بازوں نے اسے حل کرنے کی بھرپور کوشش کی

مگر کچھ پیش نہ گئی۔ یکایک رما کو یاد آیا کہ کتب خانہ میں ایک اخبار پر بہت سے آدمی جھکے ہوئے تھے اور نقشہ کو نقل کر رہے تھے۔ اب معلوم ہوا یہ بات تھی۔

رما کی ان میں سے کسی سے بھی جان پہچان نہ تھی، مگر وہ نقشہ دیکھنے کے لیے اتنا بے قرار ہوا کہ اس سے بغیر پوچھے نہ رہا گیا۔ بولا:

''آپ لوگوں میں سے کسی کے پاس یہ نقشہ ہے؟''

ان جوانوں نے ایک کمبل پوش دہقان کو یہ سوال کرتے سنا تو سمجھے کوئی عطائی ہوگا۔ ایک نے بے اعتنائی سے کہا:

''ہاں ہے تو، مگر تم دیکھ کر کیا کرو گے؟ یہاں اچھے اچھے غوطے کھا رہے ہیں۔ ایک صاحب نے، جو شطرنج میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، اسے حل کرنے کے لیے اپنے پاس سے سو روپے دینے کا وعدہ کیا ہے۔''

دوسرا نوجوان بولا: ''دکھا کیوں نہیں دیتے بھائی، کون جانے یہی بے چارے حل کر لیں۔ شاید انہی کی طبیعت لڑ جائے۔''

اس تحریک میں ہمدردی نہیں، طنز تھا۔ اس میں یہ خیال چھپا ہوا تھا کہ ہمیں دکھانے میں تو کوئی عذر نہیں ہے۔ دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لو، مگر تم جیسے الو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ حل کیا کریں گے؟ ایک دکان میں جا کر انہوں نے رما کو نقشہ دکھایا۔

رما کو فوراً یاد آیا۔ یہ نقشہ کہیں دیکھا ہے، سوچنے لگا کہاں؟''

ایک نے چٹکی لی: ''آپ نے تو حل کر لیا ہوگا؟''

دوسرا بولا: ''اب کیا ہی چاہتے ہیں۔''

تیسرا: ''ذرا دو ایک چال ہمیں بتایئے!''

رما نے برانگیختہ ہو کر کہا۔ ’’میں یہ نہیں کہتا کہ میں اسے حل ہی کرلوں گا، مگر ایسا نقشہ میں نے ایک بار حل کیا ہے اور بہت ممکن ہے، اسے بھی حل کرلوں۔ ذرا کاغذ پنسل دیجیے، نقل کرلوں۔‘‘

اس برجستہ جواب نے رما کا وقار قائم کر دیا۔ اسے کاغذ پنسل مل گیا، اس نے نقشہ نقل کیا، شکریہ ادا کیا اور گھر چلا گیا...... گھر پہنچ کر رما نے اس نقشہ پر دماغ لڑانا شروع کیا، لیکن مہروں کی چالیں سوچنے کے عوض وہ یہی سوچ رہا تھا کہ یہ نقشہ کہاں دیکھا۔ شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ یاد آتے ہی اسے نقشہ کا حل سوجھ جائے گا۔ دیگر جانداروں کی طرح دماغ بھی بہانہ تلاش کیا کرتا ہے۔ رما آدھی رات تک نقشہ کھولے بیٹھا رہا۔ شطرنج کی جو بڑی بڑی معرکے کی بازیاں کھیلی تھیں، وہ سارے نقشے اسے یاد تھے، مگر یہ نقشہ کہاں دیکھا؟

دفعتاً اس کی آنکھوں کے سامنے بجلی کوندگئی۔ اہا، راجہ صاحب نے یہ نقشہ دیا تھا۔ لگاتار تین دن دماغ لڑانے کے بعد اس نے اسے حل کیا تھا، پھر تو اسے ایک ایک چال یاد آ گئی۔ ایک ہی لمحہ میں نقشہ حل ہو گیا۔ اس نے مسرت کے نشہ میں زمین پر دو تین قلابازیاں کھائیں، مونچھوں کو تاؤ دیا۔ آئینہ میں منہ دیکھا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

دیبی دین ابھی آگ سلگا رہا تھا کہ رما خوش خوش آ کر بولا: ’’دادا جانتے ہو صداقت اخبار کا دفتر کہاں ہے؟‘‘

دیبی: ’’جانتا کیوں نہیں ہوں۔ یہاں کون اخبار ہے، جس کا پتا مجھے معلوم نہ ہو۔ صداقت کا ایڈیٹر ایک رنگیلا آدمی ہے، جو ہر دم منہ میں پان بھرے رہتا ہے،

مگر ہے ہمت کا دھنی۔ دو بار جیل ہو آیا ہے۔"

رما: "آج ذرا وہاں تک جاؤ گے؟"

دیبی دین نے عذر کیا: "مجھے بھیج کر کیا کرو گے؟"

رما: "کیا بہت دور ہے؟"

دیبی: "نہیں دور تو نہیں ہے۔"

رما: "پھر بات کیا ہے؟"

دیبی دین نے خطاوارانہ انداز سے کہا:

"بات کچھ نہیں ہے۔ بڑھیا بگڑتی ہے۔ اسے بچن دے چکا ہوں کہ سودیشی بدیشی کے جھگڑے میں نہ پڑوں گا۔ نہ کسی اخبار کے دفتر میں جاؤں گا۔ اس کا دیا کھاتا ہوں تو اس کا حکم بھی بجانا پڑے گا۔"

رما نے مسکرا کر کہا: "واداتم دل لگی کرتے ہو۔ میرا ایک بڑا ضروری کام ہے۔ اس اخبار میں شطرنج کا ایک نقشہ چھپا ہے، جس پر پچاس روپے انعام ہے، جواب چھپ جائے تو مجھے وہ انعام مل جائے۔ اخباروں کے دفتر میں اکثر خفیہ پولیس کے آدمی آتے جاتے ہیں۔ یہی ڈر ہے، نہیں تو میں خود چلا جاتا۔"

دیبی دین: "تمہارا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے۔"

رما: "تو پھر کیا ڈاک سے بھیج دوں؟"

دیبی: "نہیں ڈاک سے کیا بھیجو گے۔ سادہ لفافہ ادھر ادھر ہو جائے تو تمہاری محنت اکارت جائے۔ رجسٹری کراؤ تو کہیں پرسوں پہنچے گا۔ کل اتوار ہے کسی اور نے جواب بھیج دیا تو انعام وہ مار لے جائے گا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اخبار والے

دھاندلی کر بیٹھیں اور تمہارا جواب اپنے نام سے چھاپ کر روپے ہجم کر لیں۔"

رمانے شش و پنج میں پڑ کر کہا: "تو میں ہی چلا جاؤں گا۔"

دیبی: "تمہیں میں نہ جانے دوں گا۔ کہیں پھنس جاؤ گے، بس۔"

رما: "پھنسنا تو ایک دن ہے ہی، کب تک چھپا رہوں گا؟"

دیبی: "تو جب پھنسو گے، تب دیکھی جائے گی۔ لاؤ میں چلا جاؤں۔ بڑھیا سے کوئی بہانہ کروں گا۔"

یہ کہتے ہوئے دیبی دین نے اپنا کالا کمبل اوڑھا، رما سے لفافہ لیا اور چل دیا۔

بڑھیا ساگ بھاجی لینے منڈی گئی تھی۔ آدھ گھنٹے میں سر پر ٹوکری رکھے اور ایک بڑا سا ٹوکرا مزدور کے سر پر رکھوائے آئی۔ پسینہ سے تر تھی۔ آتے ہی بولی، کہاں گئے؟

رمانے بہانہ کیا: "مجھے تو نہیں معلوم۔ ابھی اسی طرف گئے ہیں۔"

بڑھیا نے مزدور کے سر سے ٹوکرا اتروایا اور زمین پر بیٹھ کر ایک ٹوٹی ہوئی پنکھیا جھلتی ہوئی بولی:

"چرس کی چاٹ لگی ہوئی ہوگی اور کیا؟ میں مر مر کر کماؤں اور یہ بیٹھے بیٹھے موج اڑائیں، چرس پئیں۔"

رما جانتا تھا، دیبی دین چرس پیتا ہے، لیکن بڑھیا کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بولا:

"کیا؟ چرس پیتے ہیں، میں نے تو نہیں دیکھا۔"

بڑھیا نے پیٹھ کی ساڑھی ہٹا کر اسے پنکھے کی ڈنڈی سے کھجاتے ہوئے کہا:

"ان سے کوئی نشہ چھوٹا ہے؟ چرس یہ پئیں، گانجہ یہ پئیں، سراب انہیں چاہیے،

بھنگ انہیں چاہیے۔ ہاں ابھی تک اپھیم نہیں کھائی۔ یا رام جانے کھاتے ہوں، میں کون ہر دم دیکھتی رہتی ہوں۔ میں تو سوچتی ہوں...... آگے کیا ہو۔ ہاتھ میں چار پیسے رہیں گے تو پرائے بھی اپنے ہو جائیں گے، مگر اس بھلے آدمی کو رتی بھر پھکر نا ہیں ہوتی۔ کبھی تیرتھ ہے، کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ میرا تو ناک میں دم آ گیا۔ بھگوان اٹھا لیتے تو گلا چھوٹ جاتا۔ تب یاد کریں گے لالہ۔ تب جگّو کہاں ملے گی، جو کما کما کے کھڑے اڑانے کو دیا کرے گی۔ تب سر پر ہاتھ رکھ کر نہ روئیں تو کہہ دینا۔ کوئی کہتا تھا (مزدور سے) کے پیسے ہوئے تیرے؟''

مزدور نے بیڑی جلاتے ہوئے کہا: ''بوجھا دیکھ لو دائی، گردن ٹوٹ گئی۔''

جگّو نے بے رحمانہ انداز سے کہا: ''ہاں ہاں گردن ٹوٹ گئی۔ بڑے ناجک ہو نا؟ یہ لے، کل پھر چلے آنا۔''

مزدور چلا گیا تو بڑھیا کو حساب کی یاد آئی۔ رما سے بولی: ''بھیا! جرا آج کا کھرچا تو ٹانک لو، بجار میں تو جیسے آگ لگ گئی ہے۔''

بڑھیا چھابڑیوں میں چیزیں لگا لگا کر رکھتی جاتی تھی اور حساب بھی لکھاتی جاتی تھی۔ آلو، ٹماٹر، کدو، کریلے، پالک، سیم، سب چیزوں کا تول اور دام سے یاد تھا۔ رما سے دوبارہ پڑھوا کر سنا تب اسے اطمینان ہوا۔ ان کاموں سے فرصت پا کر اس نے اپنی چلم بھری اور مونڈھے پر بیٹھ کر پینے لگی، لیکن اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ تمباکو کا مزا لینے کے لیے نہیں، دل جلانے کے لیے پی رہی ہے۔ ایک لمحہ کے بعد پھر بولی:

''دوسری عورت ہوتی تو گھڑی بھر ان کے ساتھ نباہ نہ ہوتا۔ گھڑی بھر۔ پہر

رات سے چکی میں جت جاتی ہوں اور دس بجے رات تک دکان پر بیٹھی ستی ہوتی رہتی ہوں۔ کھاتے پیتے بارہ بجتے ہیں۔تب جا کر چار پیسے دکھائی دیتے ہیں اور میں جو کچھ کماتی ہوں، اسے یہ نشے میں اڑا دیتا ہے۔رات کوٹھڑی میں چھپا کر رکھوں، مگر اس کی نگاہ پہنچ جاتی ہے۔کبھی ایک آدھ چیز بنوا لیتی ہوں تو وہ آنکھوں میں گڑنے لگتی ہے۔بھگوان نے لڑکوں کا سکھ بھوگنا نہیں لکھا تھا تو کیا کروں۔ چھاتی پھاڑ کر مر جاؤں؟ مانگنے سے موت بھی تو نہیں ملتی۔سکھ بھوگنا لکھا ہوتا تو نوجوان بیٹے کیوں چل دیتے اور اس پیکڑ کے ہاتھوں میری یہ سانت ہوتی۔اسی نے سودیشی کے جھگڑے میں پڑ کر میرے لالوں کی جان لی۔آؤ اس کوٹھڑی میں بھیا۔تمہیں مگدر کی جوڑی دکھاؤں۔دونوں اس جوڑی کے پانچ سو ہاتھ پھیرتے تھے۔

اندھیری کوٹھڑی میں جا کر رما نے مگدر کی جوڑی دیکھی۔ان پر وارنش تھی۔ صاف ستھری گویا کسی نے ابھی پھیر کر رکھ دیا۔بڑھیا نے غرور آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا:

''لوگ کہتے تھے یہ جوڑی مہابامن کو دے دے، تجھے دیکھ دیکھ کر قلق ہوگا۔ میں نے کہا یہ جوڑی میرے لالوں کی جوڑی ہے۔یہی میرے دونوں بیٹے ہیں۔''

آج رما کے دل میں بڑھیا کی جانب سے بے اندازہ عقیدت پیدا ہوئی۔کتنا زاہدانہ توکل ہے۔کتنی پاکیزہ محبت ہے۔جس نے لکڑی کے دو ٹکڑوں کو زندگی عطا کر رکھی ہے۔رما نے جگو کو حرص اور طمع میں ڈوبی ہوئی پیسے پر جان دینے والی نازک جذبات سے عاری سمجھ رکھا تھا، آج اسے معلوم ہوا کہ ضعیفہ کا کتنا نازک، کتنا

دلیر اور کتنا مہر پرور دل ہے۔

بڑھیا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ آج دونوں کے دل رشتۂ محبت میں مربوط تھے۔ ایک طرف مادرانہ شفقت تھی، دوسری طرف فرزندانہ سعادت مندی، وہ کدورت جو اب تک نادانستہ طور پر دونوں کو الگ کیے ہوئے تھی۔ آج یکایک مٹ گئی۔

بڑھیا نے کہا: ''منہ ہاتھ دھولیا ہے بیٹا، بڑے میٹھے سنترے لائی ہوں۔ ایک لے کر چکھو تو۔''

رما نے سنترہ کھاتے ہوئے کہا: ''آج سے میں تمہیں اماں کہا کروں گا۔''

بڑھیا کی ٹھنڈی، خشک، بے نور اور بخیل آنکھوں سے موتی کے سے دو قطرے نکل پڑے۔ اتنے میں دیبی دین دبے پاؤں آکر کھڑا ہو گیا۔ بڑھیا نے تڑپ کر پوچھا: ''اتنے سویرے کدھر سواری گئی تھی سرکار کی؟''

دیبی دین نے سادگی سے مسکرا کر کہا: ''کہیں نہیں۔ جرا ایک کام سے چلا گیا۔''

''کیا کام تھا جرا میں بھی سنوں یا میرے سننے کے لائق نہیں ہے؟''

''پیٹ میں درد تھا۔ بید جی کے پاس چورن لینے چلا گیا تھا۔''

''جھوٹے ہو تم۔ اڑوس اسے جو تمہیں جانتا نہ ہو۔ تم چرس کی ٹوہ میں گئے تھے۔''

''نہیں، تیرے سر کی قسم تو جھونٹ مونٹ مجھے بدنام کرتی ہے۔''

''تو پھر کہاں گئے تھے تم؟''

''بتا تو دیا رات کو کھانا دو کور جیادہ کھا گیا تھا۔ سو پیٹ پھول گیا اور کھٹی کھٹی

ڈکاریں آنے لگیں۔"

"جھوٹ ہے سراسر جھوٹ۔تمہارا منہ صاپھ کہے دیتا ہے کہ یہ بہانہ ہے۔تم چرس یا گانجے کی ٹوہ میں گئے تھے۔میں ایک نہ مانوں گی۔تمہیں اس بڑھاپے میں نسے کی سوجھتی ہے۔یہاں میری مرن ہوئی جاتی ہے۔سویرے کے گئے گئے نو بجے لوٹے ہیں۔جیسے کوئی ان کی یہاں رنڈی ہے۔"

دینی دین نے ایک جھاڑو لے کر دکان میں جھاڑو لگانا شروع کیا۔بڑھیا نے اس کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور پوچھا:"تم اب تک تھے کہاں؟جب تک یہ نہ بتاؤ گے،گھر میں گھسنے نہ دوں گی۔"

دینی دین نے سٹپٹا کر کہا:"کیا کرے گی پوچھ کر ایک اخبار کے دفتر میں گیا تھا،جو چاہے سزا دے۔"

بڑھیا نے ماتھا ٹھونک کر کہا:"تم نے پھر وہی لت پکڑی،تم نے کان نہ پکڑا تھا کہ اب پھر کبھی ادھر نہ جاؤں گا۔بولو یہی منہ نہ تھا کہ کوئی اور؟"

"تو بات تو سمجھتی نہیں،بگڑنے لگتی ہے۔"

"کھوب سمجھتی ہوں۔اکھبار والے دنگا مچاتے ہیں اور گریبوں کو جیل لے جاتے ہیں۔آج بیس سال سے دیکھ رہی ہوں۔کیا بڑھاپے میں جیل کی روٹیاں توڑو گے؟"

دینی دین نے ایک لفافہ رماناتھ کو دے کر کہا:"یہ روپے ہیں۔بھیا گن لو۔یہ روپے وصول کرنے گیا تھا۔جی نہ مانتا ہو تو آدھے لے لے۔"

بڑھیا نے آنکھیں پھاڑ کر کہا:"اچھا تو تم اپنے ساتھ بھیا کو بھی ڈبونا چاہتے

ہو؟ تمہارے روپے میں آگ لگا دوں گی۔ تم روپے مت لینا بھیا، مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ اب سیت میں آدھی نہیں ملتے تو سب لالچ دے کر لوگوں کو پھانستے ہیں۔ باجار میں پہرا دلا دیں گے۔ عدالت میں گواہی کرا دیں گے۔ پھینک دو اس کے روپے، جتنے روپے چاہو مجھ سے لے جاؤ۔''

جب رماناتھ نے سارا قصہ کہا تو بڑھیا کی تشفی ہوئی۔ چہرے کی وہ تندی غائب ہوگئی۔ خوش ہو کر بولی: ''اس میں سے میرے لیے کیا لاؤ گے بیٹا؟''

رمانے لفافہ اس کے سامنے رکھ کر کہا: ''تمہارے ہی روپے تو ہیں اماں، میں روپے لے کر کیا کروں گا؟''

''پھر کیوں نہیں گھر بھیج دیتے؟''

''میرا گھر یہی ہے اماں، کوئی دوسرا گھر نہیں ہے۔''

بڑھیا کا حسرت نصیب دل شگفتہ ہو گیا۔ اس فرزندانہ محبت کے لیے کتنے دنوں سے اس کی روح بے قرار تھی۔ اس حسین دل میں محبت کا جو خزانہ جمع ہو گیا، وہ سب ماں کے سینے میں جمع ہونے والے دودھ کی طرح بیٹے پر نثار ہونے کے لیے للچا اٹھا۔

بڑھیا نے نوٹوں کو گن کر کہا: ''پچاس ہیں بیٹا، پچاس مجھ سے اور لے لو، چائے کا پتیلا رکھا ہوا ہے، چائے کی دکان کھول لو۔ یہیں ایک طرف چار پانچ موڑھے اور ایک میج رکھ لینا۔ دو دو گھنٹہ سانجھ سویرے بیٹھ جایا کرو گے تو گجر بھر کو مل جائے گا۔''

دیبی دین بولا: ''تب چرس کے پیسے میں اس دکان سے لے لیا کروں گا؟''

بڑھیا نے مسرور اور مخمور آنکھوں سے دیکھ کر کہا:

''کوڑی کوڑی کا حساب لے لوں گی۔ اس پھیر میں نہ رہنا۔''

رما اپنے کمرے میں گیا تو اس کا دل بہت خوش تھا۔ آج اسے وہی مسرت ہو رہی تھی جو گھر کی یاد دلاتی تھی۔ گھر پر جو پیار ملتا تھا، وہ اس کا حق تھا۔ یہاں جو پیار ملا، گویا آسمان سے ٹپکا تھا۔

وہ نہا دھو کر پوجا کا سوانگ بھرنے بیٹھا تو بڑھیا آ کر بولی: ''بیٹا! تمہیں روٹی بنانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے ایک مسرانی ٹھیک کر دی ہے۔ وہ تمہارا کھانا پکا دیا کرے گی۔ دھرم کرم سے رہتی ہے۔ بھیا ایسی بات نہیں ہے۔''

ان ضعیف آنکھوں میں گہری لازوال مادریت جھلک رہی تھی۔ اونچ نیچ اور اعلیٰ وادنیٰ کی تمیز خود مٹ گئی۔ بولا۔ ''جب تم میری ماں ہو گئیں تو پھر کیا فرق، میں تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاؤں گا۔''

بڑھیا نے زبان دانتوں سے دبا کر کہا: ''ارے نہیں بیٹا! میں تمہارا دھرم نہ لوں گی۔ کہاں تم برہمن کہاں ہم کھٹک۔ ایسا بھی کہیں ہوا ہے۔''

''میں تمہاری رسوئی میں کھاؤں گا۔ جب ماں باپ کھٹک ہیں تو بیٹا بھی کھٹک ہی ہے۔''

''اور جو تمہارے گھر والے سنیں تو کیا کہیں۔''

''مجھے کسی کے کہنے سننے کی پروا نہیں ہے، آدمی گناہ سے نیچا ہوتا ہے، کھانے پینے سے نیچا نہیں ہوتا۔ پریم سے جو کھانا ملتا ہے، وہی پاک ہوتا ہے، اس سے تو دیوتا بھی انکار نہیں کر سکتے۔''

بڑھیا کے دل میں اپنے ذات کی امتیاز کا جذبہ بیدار ہوا، بولی: ''بیٹا کھٹک کی کوئی نیچی ذات نہیں ہے۔ ہم لوگ برہمن کے ہاتھ کا بھی بھوجن نہیں کھاتے، کہار کے ہاتھ کا پانی تک نہیں پیتے، ماس مچھلی ہاتھ سے نہیں چھوتے۔ کوئی کوئی سراب پیتے ہیں، لیکن چھپ کر۔ اس نے کسی کو نہیں چھوڑا بیٹا۔ بڑے بڑے تلک دھاری گٹا گٹ پیتے ہیں، لیکن میری روٹیاں تمہیں اچھی لگیں گی؟''

رما نے مسکرا کر کہا: ''پریم کی روٹیوں میں امرت رہتا ہے۔ چاہے گیہوں کی ہوں یا باجرے کی۔''

بڑھیا یہاں سے چلی تو گویا آنچل میں مسرت کا خزانہ بھرے ہوئے ہو۔

(28)

جب سے رما چلا گیا تھا، رتن کو جالپا کے بارے میں بہت تشویش ہوگئی۔ وہ کسی بہانہ سے اس کی مدد کرتے رہنا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ یہ بھی چاہتی تھی کہ جالپا کسی طرح تاڑ نہ جائے، اگر کچھ روپے خرچ کر کے بھی وہ رما کا پتا لگا سکتی تو خوشی سے خرچ کر دیتی۔

جالپا کی وہ روتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اس کا دل مسوس اٹھتا تھا، وہ اسے بشاش دیکھنا چاہتی تھی۔ اپنے اندھیرے رونے گھر سے اوب کر وہ جالپا کے گھر چلی جایا کرتی تھی۔ وہاں گھڑی بھر ہنس بول لینے سے اس کا دل خوش ہو جاتا تھا۔ اب بھی وہاں ہی نحوست چھا گئی۔ یہاں آ کر اسے محسوس ہوتا تھا کہ میں بھی دنیا میں

ہوں۔ اس دنیا میں جہاں زندگی ہے، تمنا ہے، محبت ہے اور مسرت ہے۔ اس کی اپنی زندگی تو قرض کی قربان گاہ کی نذر ہو چکی تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ شہر کے معزز اور خوشحال گھروں سے رتن کے مراسم تھے، لیکن جہاں اعزاز تھا، وہاں تکلف تھا۔ نمائش تھی، حسد تھا، غیبت تھی، کلب کی صحبت سے بھی اسے نفرت ہو گئی تھی۔ وہاں تفریح ضرور تھی لیکن مردوں کی عاشقانہ نگاہیں بھی تھیں۔ بے قرار دل بھی، رندانہ بذلہ سنجیاں بھی۔

جالپا کے گھر اگر وہ شان نہ تھی، وہ دولت نہ تھی تو وہ نمائش بھی نہ تھی۔ وہ تنگ دل بھی نہ تھی۔ رما جوان تھا، خوش رو تھا۔ ممکن ہے شوقین بھی ہو، مگر رتن کو ابھی تک اس کے متعلق کسی قسم کا شبہ کرنے کا موقع نہ ملا تھا اور جالپا جیسی نازنین کی موجودگی میں اس کا امکان بھی نہ تھا۔

زندگی کے بازار میں اور سبھی دکانداروں کی دغابازیوں سے تنگ آ کر اس نے چھوٹی سی دکان میں آ کر پناہ لی تھی، مگر یہ دکان ٹوٹ گئی۔ اب وہ کس بازار میں زندگی کی جنس خریدے گی۔ سچا مال پائے گی۔

ایک دن وہ گراموفون لائی اور شام تک بجاتی رہی۔ دوسرے دن تازہ میوؤں کی ایک ٹوکری لا کر رکھ گئی۔ جب وہ آتی تو کوئی نہ کوئی سوغات لے آتی۔ اب تک وہ جاگیشری سے بہت کم ملتی تھی، مگر اب اکثر اس کے پاس آ بیٹھتی اور ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتی۔ کبھی کبھی اس کے سر میں تیل ڈالتی اور اس کے بال گوندھتی۔ گوپی اور وشمبر سے بھی اب اسے محبت ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی دونوں کو موٹر پر سیر کرانے لے جاتی۔ سکول سے آتے ہی دونوں اس کے بنگلے پر پہنچ جاتے اور

دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے۔ ان کے شوروغل میں رتن کو دلی مسرت حاصل ہوتی تھی۔

ایک دن رتن آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ جالپا نے پوچھا:

''کیا آج طبیعت اچھی نہیں ہے؟''

رتن نے غمناک لہجہ میں کہا: ''طبیعت تو اچھی ہے مگر آج رات بھر جاگنا پڑا۔ رات سے وکیل صاحب کو بہت تکلیف ہے۔ جاڑوں میں انہیں دمہ کا دورہ ہو جاتا ہے، بے چارے جاڑوں بھر دوائیں کھاتے رہتے ہیں، مگر یہ مرض گلا نہیں چھوڑتا۔ کلکتہ میں ایک نامی بید ہیں، اب کے انہی سے علاج کرانے کا ارادہ ہے۔ کل چلی جاؤں گی۔ مجھے ساتھ لے جانے کا ارادہ تو نہیں ہے۔ کہتے ہیں وہاں بڑی تکلیف ہوگی، لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ کسی کو ساتھ تو رہنا ہی چاہیے۔ وہاں دو بار ہو آئی ہوں اور جب گئی ہوں بیمار ہو گئی ہوں۔ مجھے وہاں ذرا بھی اچھا نہیں لگتا، لیکن اپنے آرام کو دیکھوں یا ان کی بیماری کو دیکھوں۔ اگر کوئی میرا سب کچھ لے کر بھی انہیں اچھا کر دے تو میں خوشی سے دے دوں۔''

جالپا نے پوچھا: ''یہاں کسی بید کو نہیں بلایا؟''

''یہاں کے بیدوں کو دیکھ چکی۔ بید، ڈاکٹر اور حکیم کوئی تو نہیں بچا۔''

''تو پھر کب تک آؤ گی؟''

''کچھ ٹھیک نہیں۔ ان کی بیماری پر ہے۔ ایک ہفتہ میں آ جاؤں یا مہینہ دو مہینہ لگ جائیں، مگر جب تک بیماری کی جڑ نہ ٹوٹ جائے، نہ آؤں گی۔''

تقدیر غیب میں بیٹھی ہوئی ہنس رہی تھی۔ جالپا دل میں مسکرائی۔ جس بیماری کی جڑ جوانی میں نہ ٹوٹی، بڑھاپے میں کیا ٹوٹے گی۔

ایک لمحہ کے بعد رتن نے کہا: ''تم بھی چلتیں تو بڑا مزہ آتا؟''

جالپا نے دردناک انداز سے کہا: ''کیسے چلوں بہن! جانے بھی پاؤں۔ یہاں دن بھر آس لگی رہتی ہے۔ کوئی خبر آتی ہوگی۔ وہاں میرا جی اور بھی گھبرائے گا۔''

''میرا دل تو کہتا ہے، بابو جی کلکتے ہی میں ہیں۔''

''تو ذرا ادھر ادھر تلاش کرنا۔ اگر کوئی خبر ملے تو مجھے اطلاع دینا؟''

''اس کے لیے تمھیں کہنے کی ضرورت نہیں ہے جالپا۔''

''یہ مجھے معلوم ہے، خط برابر بھیجتی رہوں گی۔''

''ہاں ضرور۔ روز نہیں تو ایک روز ناغہ دے کر ضرور لکھوں گی۔''

جالپا پان بنانے لگی۔ رتن اس کے چہرے کی طرف منتظر آنکھوں سے تاکتی رہی۔ گویا کچھ کہنا چاہتی ہے، مگر حجاب کے باعث کچھ نہیں کہہ سکتی۔ جالپا نے پان دیتے وقت اس کے دل کی بات بھانپ کر کہا:

''کیا ہے بہن، کیا کہہ رہی ہو؟''

''میرے پاس کچھ روپے ہیں تم رکھ لو۔ میرے پاس رہیں گے تو خرچ ہو جائیں گے۔''

جالپا نے مسکرا کر کہا: ''اور جو مجھ سے ہی خرچ ہو جائیں؟''

رتن خوش ہو کر بولی: ''تمہارے ہی تو ہیں۔''

جالپا خیال میں ڈوبی ہوئی زمین کی طرف تاکتی رہی۔ کچھ جواب نہ دیا۔ رتن

نے سمجھا اسے اعتراض ہے۔ شکوے کے انداز سے بولی:

''تم نے کچھ جواب نہ دیا بہن! میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تم مجھ سے کھچی کیوں رہتی ہو۔ میں چاہتی ہوں مجھ میں اور تم میں مغائرت نہ رہے، لیکن تم مجھ سے دور بھاگتی ہو..... مان لو، میرے سو پچاس روپے تمہیں سے خرچ ہو گئے تو کیا ہوا؟ بہنوں میں تو ایسا کوڑی کوڑی کا حساب نہیں ہوتا۔''

جالپا نے متین لہجہ میں کہا ''کچھ کہوں، برا تو نہ مانوں گی؟''

''برا ماننے کی بات ہو گی تو ضرور برا مانوں گی۔''

''ممکن ہے تمہیں بری لگے، لیکن میں تمہارا دل دکھانے کے لیے نہیں کہتی۔ تم اپنے دل میں سوچو۔ تمہارے اس بہناپے میں رحم یا امداد کا خیال شامل ہے یا تم میری غریبی پر ترس کھا کر.......''

رتن نے لپک کر دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ بند کر دیا اور بولی: ''بس اب رہنے دو۔ تم چاہے جو سمجھو، مگر یہ خیال کبھی میرے دل میں نہ تھا، نہ ہو سکتا ہے۔ مجھے تو اگر بھوک لگتی ہو تو بے تکلف کہہ بیٹھوں۔''

جالپا نے اسی بیگانہ پن سے کہا: ''تم ایسا کہہ سکتی ہو، تم جانتی ہو کہ کسی دوسرے موقع پر تم روٹیوں کے عوض میوے کھلا سکتی ہو، لیکن ایشور نہ کرے کوئی ایسا موقع آئے۔ جب تمہارے گھر میں روٹی کا ٹکڑا نہ ہو تو شاید تم اتنی بے تکلف نہ ہو سکو۔''

رتن نے بے ساختہ پن سے کہا: ''مجھے اس حالت میں بھی تم سے مانگنے میں حجاب نہ ہو گا۔ دوستی حالات کی پروا نہیں کرتی۔ ایسی باتیں کر کے تم میرا دروازہ بند کر رہی ہو۔ میں نے سمجھا تھا، تمہارے ساتھ زندگی کے دن کاٹ دوں گی، لیکن تم

ابھی سے دامن چھڑائے لیتی ہو۔ بدنصیبوں کو پریم کی بھیک بھی نہیں ملتی۔''

یہ کہتے کہتے رتن کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ جالپا اپنے کو غم نصیب سمجھتی تھی اور غم نصیبوں کو تلخ حق کے اظہار کی آزادی ہوتی ہے، لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ رتن کی مصیبت اس کی مصیبت سے کہیں زیادہ دل شکن ہے۔ جالپا کو شوہر کے لوٹ آنے کی اب تک امید تھی۔ اس کے آتے ہی اس کے ایام غم بھول جائیں گے۔ اس کی امیدوں کا آفتاب پھر روشن ہوگا۔ اس کی آرزوؤں اور ترغیبوں کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔ روشن، دلفریب اور وسیع۔ رتن کا مستقبل کیا تھا۔ کچھ نہیں، گہری تاریکی۔

رتن آنکھیں پونچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''خطوں کا جواب دیتی رہنا۔''

جالپا نے کہا: ''روپے دیتی جاؤ۔''

رتن نے تھیلی سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

لیکن اس کے چہرے پر خوشی نہ تھی۔ جالپا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''کیا برا مان گئیں؟''

رتن نے روٹھ کر کہا: ''برا مان کر تمہارا کیا کرلوں گی؟''

جالپا نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ فرط الفت سے اس کا دل لہلہا اٹھا۔ رتن سے اسے اتنی محبت کبھی نہ ہوئی تھی۔ وہ اب تک اس سے کھنچتی تھی۔ جلتی تھی۔ آج اسے رتن کی اصلی صورت نظر آئی۔ اس نے سوچا یہ سچ مچ بدنصیب ہے اور مجھ سے زیادہ۔ ایک لمحہ میں رتن آنکھوں میں آنسو اور ہنسی ایک ساتھ بھرے ہوئے رخصت ہوگئی۔

کلکتہ میں وکیل صاحب کے ٹھہرنے کے لیے پہلے ہی انتظام کرلیا تھا۔کوئی تکلیف نہ ہوئی۔رتن نے مہراج اور ٹیمل کو ساتھ لے لیا تھا۔دونوں وکیل صاحب کے پرانے ملازم تھے اور گھر کے آدمی ہو گئے تھے۔شہر کے باہر ایک بنگلہ میں تین کمرے لے لیے گئے تھے۔احاطہ میں طرح طرح کے پھول پودے لگے ہوئے تھے۔بڑی فرحت کی جگہ تھی۔قرب وجوار میں اور کتنے ہی بنگلے تھے۔شہر کے لوگ ادھر ہوا خوری کو جایا کرتے تھے اور ہرے ہو کر لوٹتے تھے،مگر رتن کو جگہ پھاڑے کھاتی تھی۔بیمار کے تیماردار بھی بیمار ہو جاتے ہیں۔افسردہ دلوں کے لیے جنت بھی ویران ہے۔

سفر نے وکیل صاحب کو اور بھی مضمحل کر دیا۔دو تین دن تو ان کی حالت پہلے سے ابتر ہو گئی،لیکن معالجہ شروع ہونے کے بعد وہ کچھ سنبھلنے لگے۔رتن صبح سے آدھی رات تک ان کی چارپائی کے پاس کرسی ڈالے بیٹھی رہتی۔وکیل صاحب چاہتے تھے کہ وہ یہاں سے ہٹ جائے تو دل کھول کر کراہیں،اسے تشفی دینے کے لیے وہ اپنی حالت چھپانے کے لیے کوشش کرتے رہتے تھے۔

وہ پوچھتی آج کیسی طبیعت ہے،تو وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہتے۔''آج تو جی بہت ہلکا معلوم ہوتا ہے۔''بیچارے ساری رات کروٹیں بدل کر کاٹتے تھے،مگر رتن پوچھتی رات نیند آئی تھی،تو کہتے ہاں خوب سویا۔رتن جب کھانا لے کر جاتی تو رغبت نہ ہونے پر بھی کھا لیتے۔رتن سمجھتی تھی،اب یہ اچھے ہو رہے ہیں۔کبیر راج

سے بھی وہ یہی کیفیت بیان کرتی تھی۔ کبیر راج بھی اپنے معالجہ کی کامیابی پر خوش تھے۔

ایک دن وکیل صاحب نے رتن سے کہا: ''مجھے خوف ہے کہ اچھا ہونے کے بعد کہیں مجھے تمہاری دوا نہ کرنی پڑے؟''

رتن نے خوش ہو کر کہا: ''اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ میں تو ایشور سے مناتی ہوں کہ وہ تمہاری بیماری مجھے دے دیں۔''

''شام کو گھوم آیا کرو۔ اگر بیمار پڑنے کی خواہش ہو تو میرے اچھے ہونے پر پڑنا۔''

''کہاں جاؤں۔ میرا تو کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مجھے یہیں سب سے اچھا لگتا ہے۔''

وکیل صاحب کو یکا یک رمانا تھ کا خیال آ گیا۔ بولے: ''ذرا شہر کے پارکوں میں گھوم گھام کر دیکھو۔ شاید رمانا تھ کا پتا چل جائے؟''

رتن کو اپنا وعدہ یاد آ گیا۔ اسے ملاقات ہو جانے کی امید نے ایک لمحہ کے لیے بے تاب کر دیا۔ کہیں وہ پارک میں بیٹھے مل جائیں تو پوچھوں۔ کہیے بابو جی! اب بھاگ کر کہاں جایئے گا۔ اس خیال سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ بولی جالپا سے میں نے وعدہ تو کیا تھا، لیکن یہاں آ کر بھول گئی۔

رتن نے تشویش کے ساتھ کہا: ''لیکن فکر تو نہیں لگی رہے گی۔''

وکیل صاحب نے مسکرا کر کہا: ''میں تو اچھا ہو رہا ہوں۔''

رتن بے دلی کے ساتھ بولی: ''اچھا چلی جاؤں گی۔''

مگر رتن کو کل سے وکیل صاحب کی تشفی انگیز باتوں پر کچھ شبہ ہونے لگا تھا۔ ان کی صورت سے اچھے ہونے کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی۔ اگر وہ اچھے ہو رہے ہیں تو ان کا چہرہ روز بروز کیوں زرد ہوتا جاتا ہے۔ آنکھیں کیوں ہر وقت بند رہتیں ہیں۔ جسم کیوں گھلتا جاتا ہے۔ مہراج اور خدمت گار سے وہ اپنا شبہ نہ ظاہر کر سکتی تھی۔ کبیراج سے پوچھتے بھی شرم آتی تھی۔

اگر کہیں رما مل جائے تو ان سے پوچھتی۔ ممکن ہے کسی ڈاکٹر سے ان کی ملاقات ہو۔ ان کبیراج سے وہ کچھ کچھ مایوس ہو چلی تھی۔

جب رتن چلی گئی تو وکیل صاحب نے ٹیمل سے کہا: ''مجھے ذرا اٹھا کر بٹھا دو۔ ٹیمل! پڑے پڑے کمر سیدھی ہو گئی۔ ایک پیالی چائے پلا دو۔ کئی دن ہو گئے چائے کی صورت نہیں دیکھی۔ مجھے مارے ڈالتا ہے۔ دودھ کی صورت دیکھ کر بخار چڑھ آتا ہے، مگر ان کی خاطر سے پی لیتا ہوں۔ مجھے تو ان کبیراج کی دوا سے کچھ فائدہ نہیں معلوم ہوتا۔ تمہیں کیا خیال ہے؟''

ٹیمل نے وکیل صاحب کو تکیہ کے سہارے بٹھا کر کہا۔ ''بابو جی! یہ تو میں پہلے ہی کہنے والا تھا۔ بہو جی کے ڈر کے مارے نہیں کہتا تھا۔''

وکیل صاحب ایک منٹ تک خاموش رہ کر بولے: ''میں موت سے نہیں ڈرتا ٹیمل! بالکل نہیں، مجھے دوزخ اور بہشت پر بالکل یقین نہیں ہے۔ اگر آدمی کو اپنے اعمال کے مطابق جنم لینا پڑتا ہے تو مجھے یقین ہے کہ میرا جنم کسی اچھے گھر میں ہوگا۔ تاہم مرنے کو جی نہیں چاہتا۔ سوچتا ہوں مر گیا تو کیا ہوگا؟''

ٹیمل بولا: ''بابو جی! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ بھگوان چاہیں گے تو آپ

اچھے ہو جائیں گے۔ کہیے تو کل کسی دوسرے ڈاکٹر کو بلا لاؤں۔ آپ لوگ تو انگریجی پڑھے ہیں۔ کچھ مانتے ہی نہیں۔ مجھے تو کوئی دوسرا ہی پھیر معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کبھی گنواروں کی بھی سن لیا کیجیے۔ آپ مانو یا نہ مانو، میں تو کل ایک سیانے کو لاؤں گا۔''

وکیل صاحب نے منہ پھیر لیا۔ جن و آسیب کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ کئی سیانوں کو پیٹ چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شعبدہ بازی ہے بالکل ریاکاری، لیکن اس وقت انہیں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ ٹیمل کی اس تجویز سے اختلاف کرتے۔

مہراج نے چائے لا کر کہا۔ ''سرکار چائے پی لیجیے۔''

وکیل صاحب نے چائے کے پیالے کو گرسنہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا: ''لے جاؤ اب نہ پیوؤں گا۔ بہو جی کو معلوم ہو گیا تو ناراض ہوں گی۔'' ایک منٹ کے بعد پھر وہ بولے ''کیوں مہراج! جب سے میں آیا ہوں۔ میرا چہرہ کچھ ہرا ہوا ہے؟''

مہراج نے ٹیمل کی طرف دیکھا۔ وہ ہمیشہ رخ دیکھ کر رائے دیا کرتے تھے۔ خود اپنی رائے قائم کرنے کی صلاحیت ان میں نہ تھی۔ اگر ٹیمل نے کہا ہے، آپ اچھے ہو رہے ہیں تو وہ اس کی تائید کریں گے۔ ٹیمل نے اس کے خلاف کہا ہے تو انہیں بھی خلاف کہنا چاہیے۔ ٹیمل نے ان کی پریشانی کو بھانپ کر کہا: ''ہرا کیوں نہیں ہوا ہے۔ ہاں مگر جتنا چاہیے اتنا نہیں ہوا ہے۔''

مہراج بولے: ''ہاں کچھ ہرا جرور ہوا ہے مگر بہت کم۔''

وکیل صاحب نے کچھ جواب نہ دیا۔ دو چار باتیں کرنے کے بعد انہیں ضعف

ہو جاتا تھا اور دس پانچ منٹ خاموش پڑے رہتے تھے۔ شاید انہیں اپنی حالت کا واقعی علم ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر عقل و دماغ پر موت کا سایہ پڑنے لگا تھا۔ اگر کچھ امید تھی تو اتنی کہ شاید دل کی کمزوری سے انہیں اپنی حالت سے مایوسی ہو رہی ہو۔ ان کا دم پہلے سے زیادہ پھولنے لگا تھا۔ کبھی کبھی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہ جاتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب جان نکل جائے گی۔ نزع کی حالت طاری ہو جاتی تھی۔ کون جانے یہی حبس ذرا اور بڑھ کر زندگی کا خاتمہ کر دے۔

سامنے باغ میں چاندنی کہرے کی چادر اوڑھے زمین پر پڑی سسک رہی تھی۔ پھول اور پودے سر جھکائے امید اور خوف سے بے قرار ہو کر گویا اس کی چھاتی پر ہاتھ رکھتے تھے۔ اس کے ٹھنڈے جسم پر ہاتھ پھیرتے تھے اور آنسوؤں کی بوندیں گرا کر پھر المناک آنکھوں سے تاکنے لگتے تھے۔

دفعتاً وکیل صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ آنکھوں کے دونوں گوشوں میں آنسوؤں کی دو بوندیں مچل رہی تھیں۔ پھر آہستہ سے بولے:

''ٹیمل! کیا سدھو آئے تھے۔'' پھر اس سوال پر آپ ہی آپ شرمندہ ہو کر مسکراتے ہوئے بولے:

''مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے سدھو آئے ہوں۔'' پھر گہری سانس لے کر خاموش ہو گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔

''سدھو'' اس کے بیٹے کا نام تھا جو جوان موت مر چکا تھا۔ اس وقت وکیل صاحب کو بار بار اسی کی یاد آ رہی تھی۔ کبھی اس کا بچپن سامنے آ جاتا۔ کبھی اس کی موت آنکھوں میں پھر جاتی۔ ان کا حافظہ کبھی اتنا روشن، کبھی اتنا صحیح نہ تھا۔

کئی منٹ کے بعد انہوں نے پھر آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر کھوئی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ میری ماں آ کر پوچھ رہی ہے۔ بیٹا تمہاری طبیعت کیسی ہے۔

دفعتاً انہوں نے ٹیمل سے کہا: ''یہاں آ جاؤ، جا کر کسی وکیل کو بلا لاؤ۔ جلد آنا، ورنہ بہو جی آتی ہوں گی۔''

اتنے میں موٹر کا ہارن سنائی دیا اور ایک لمحہ میں رتن آ پہنچی۔ وکیل کو بلانے کی بات ٹل گئی۔

وکیل صاحب نے چہرے کو بشاش بنا کر پوچھا:

''کہاں کہاں ہو آئیں۔ کچھ رمانا تھ کا پتا چلا؟''

رتن نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''کئی جگہ گئی، وہ کہیں نہیں دکھائی دیئے۔ اتنے بڑے شہر میں سڑکوں کا پتا تو جلدی چلتا نہیں۔ وہ بھلا کہیں ملیں گے، دوا کھانے کا وقت تو آ گیا ہوگا؟''

وکیل صاحب نے دبی زبان سے کہا: ''لاؤ کھا لوں۔''

رتن نے دوا نکالی اور انہیں اٹھا کر پلائی۔ اس وقت وہ نہ معلوم کچھ خائف سی ہو رہی تھی۔ ایک نامعلوم دہشت اس کے دل پر غالب تھی۔

یکا یک اس نے کہا: ''ان لوگوں میں سے کسی کو تار دے دوں؟''

وکیل صاحب نے پرسوال نظروں سے دیکھا، پھر آپ ہی آپ اس کا مطلب سمجھ کر بولے: ''نہیں نہیں، کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' پھر ایک لمحہ کے بعد اپنے حواس کو مجتمع کرنے کی کوشش کر کے بولے۔ ''میں چاہتا ہوں کہ اپنی

وصیت لکھادوں۔'' جیسے ایک ٹھنڈی تیز نکیلی چیز رتن کے تلووں سے گھس کر سر سے نکل گئی۔ گویا اس کے جسم کی ساری بندشیں کھل گئیں۔ سارے اعضا بکھر گئے۔ جیسے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ اوپر سے آسمان اڑ گیا اور اب وہ بے حس، بے جان معلق کھڑی ہے۔

رندھے ہوئے گلے سے بولی: ''گھر سے کسی کو بلاؤں۔ یہاں کوئی اپنا نہیں ہے۔''

اپنوں کے لیے رتن اس وقت بے قرار ہو اٹھی۔ کوئی بھی تو اپنا ہوتا جس پر وہ تکیہ کر سکتی۔ گھر کے لوگ آ جاتے تو دوڑ دھوپ کر کے کسی دوسرے ڈاکٹر کو لاتے۔ وہ اکیلی کیا کرے۔ آخر بھائی بند اور کس دن کام آئیں گے۔ مصیبت میں ہی تو اپنے کام آتے ہیں۔ پھر یہ کیوں کہتے ہیں، کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں۔

وصیت کی بات اسے پھر یاد آ گئی۔ یہ خیال کیوں ان کے دل میں پیدا ہوا؟ وید جی نے تو کچھ نہیں کہا۔ کیا ہونے والا ہے؟ ایشور! یہ خیال اس کے دل کو بے چین کرنے لگا۔ اس کی طبیعت آواز بلند سے رونے کے لیے مائل ہو گئی۔ اپنی ماں یاد آئی۔ اپنی ماں کے آنچل میں منہ چھپا کر رونے کی تمنا دل میں پیدا ہوئی۔

مہراج نے آ کر کہا۔ ''سرکار کھانا تیار ہے۔ تھالی پروسوں۔''

رتن نے اس کی طرف سخت نگاہوں سے دیکھا، وہ بغیر انتظار کیے چلا گیا۔

مگر ایک ہی لمحہ میں مہراج پر رتن کو رحم آ گیا۔ اس نے کیا خطا کی۔ جو کھانے کے لیے پوچھنے آیا۔ کھانا بھی ایسی چیز ہے جسے کوئی چھوڑ سکے۔ وہ رسوئی میں جا کر بولی۔ ''تم لوگ کھالو۔ مہراج مجھے آج بھوک نہیں ہے۔''

مہراج نے اصرار کیا۔ ''دو ہی لقمے کھالو سرکار۔''

رتن ٹھٹک گئی۔ مہراج کے اصرار میں اتنا خلوص، اتنی ہمدردی بھری ہوئی تھی کہ رتن کو ایک طرح کی تشفی کا احساس ہوا۔ یہاں کوئی اپنا نہیں ہے۔ یہ کتنا غلط خیال تھا۔ مہراج نے اب تک رتن کو ایک تندمزاج مالکن کی صورت میں دیکھا تھا۔ وہی مالکن آج اس کے سامنے کھڑی گویا ہمدردی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

رتن نے پوچھا۔ ''کیوں مہراج تمہارا کیا خیال ہے۔ بابو جی کو اس کبیراج کی دوا سے کچھ فائدہ ہو رہا ہے۔''

مہراج نے ڈرتے ڈرتے وہی الفاظ دہرائے جو آج وکیل صاحب سے کہے تھے ''کچھ کچھ تو ہو رہا ہے مگر جتنا چاہیے اتنا نہیں۔''

رتن نے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی مجھے دھوکا دیتے ہو مہراج!''

مہراج کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور بولے۔ ''بھگوان سب اچھا ہی کریں گے، بہو جی گھبرانے سے کیا ہوگا۔ اپنا تو کوئی اختیار نہیں۔''

رتن نے پوچھا۔ ''یہاں کوئی جیوتشی تو نہ ملے گا۔''

مہراج نے سرگرمی کے ساتھ کہا۔ ''یہ تو میں پہلے ہی کہنے والا تھا بہو جی! لیکن بابو جی کا مزاج تو جانتی ہو۔ ان باتوں سے کتنا بگڑتے ہیں۔''

رتن نے تاکید کر کے کہا۔ ''سویرے کسی کو ضرور بلا لانا۔''

یہ کہتی ہوئی وہ کمرے میں آئی اور جالپا کو یہ خط لکھنے لگی۔

''بہن..........! نہیں کہہ سکتی کہ کیا ہونے والا ہے۔ آج مجھے معلوم ہوا ہے

کہ میں کتنے بڑے مغالطہ میں پڑی ہوئی تھی۔ وکیل صاحب اب تک مجھ سے اپنی حالت چھپاتے تھے، مگر آج یہ بات ان کے قابو سے باہر ہو گئی۔ تم سے کیا کہوں۔ آج وہ وصیت لکھوانے جا رہے تھے۔ دل بہت گھبرا رہا ہے، جی چاہتا ہے کہ تھوڑی سی سنکھیا کھا کر سو رہوں۔ ایشور کو دنیا رحیم اور کریم اور جانے کیا کیا کہتی ہے۔ میں کہتی ہوں اس سے زیادہ بے رحم اور سنگدل کوئی دشمن بھی نہیں ہو سکتا۔ پچھلی زندگی کا قصہ محض دل سمجھانے کے لیے ہے۔ جس سزا کا سبب ہی ہمیں معلوم نہ ہو اس سزا کی وقعت ہی کیا۔ وہ تو زبردست کی لاٹھی ہے، جو اپنے لیے کوئی حیلہ گھڑ لیتی ہے۔ اس اندھیری ہولناک، پرخار شاہراہ زندگی میں صرف ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی مجھ سے چھنا جا رہا ہے۔ اس اندھیرے میں میں کہاں جاؤں گی۔ کون میرا رونا سنے گا۔ کون میری بانہہ پکڑے گا۔

بہن! مجھے معاف کرنا۔ مجھے بابو جی کی تلاش کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی، آج شہر کی سڑکوں کا چکر لگا آئی ہوں۔ کچھ موقع ملا تو پھر جاؤں گی۔''

یہ خط لکھ کر رتن برآمدے میں آئی۔ دیکھا، وکیل صاحب کی سانس زوروں پر چل رہی تھی۔

(30)

رات کے تین بج چکے تھے۔ رتن آدھی رات کے بعد آرام کرسی پر لیٹے ہی لیٹے جھپکیاں لے رہی تھی کہ یکایک وکیل صاحب کے گلے کی گڑگڑاہٹ سن کر

چونک پڑی۔ الٹی سانس چل رہی تھی۔ وہ ان کے سرہانے چارپائی پر بیٹھی تھی اور ان کا سر اٹھا کر اپنی جانگھ پر رکھ لیا۔ ابھی نہ جانے کتنی رات باقی تھی۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا ابھی تین بجے تھے۔ سویرا ہونے میں چار گھنٹے کی دیر تھی۔ بیراج کہیں نو بجے آئیں گے، گھر میں چاروں طرف سوتا پڑا تھا۔ رتن کے دل پر خوف طاری ہو گیا۔ یہ منحوس رات کبھی ختم بھی ہو گی یا نہیں؟

کئی منٹ کے بعد وکیل صاحب کی سانس رکی۔ سارا جسم پسینے میں تر تھا۔ ہاتھ سے رتن کو ہٹ جانے کے لیے کہا اور تکیہ پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ایک لمحہ میں انہوں نے نحیف آواز میں کہا: ''رتن اب جدائی کا وقت آ گیا۔ میری خطائیں..'' انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے اور رتن کی طرف بیکسانہ نظروں سے دیکھا، کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر منہ سے آواز نہ نکلی۔ رتن نے چیخ کر پکارا، کیا ٹیمل مہراج دونوں مر گئے۔

مہراج نے آ کر کہا۔ ''میں سو یا تھوڑے۔ بہو جی، بابو جی کی حالت........''

رتن نے ڈانٹ کر کہا۔ ''بکو مت۔ جا کر بیراج کو بلا لاؤ، کہنا ابھی چلیے۔''

مہراج نے فوراً اپنا پرانا اوورکوٹ ڈالا، سوٹا اٹھایا اور چل دیئے۔ رتن اٹھ کر آگ جلانے لگی کہ شاید سینک سے کچھ فائدہ ہو۔ خطرے کو سامنے دیکھ کر اس میں یاس کی ہمت پیدا ہوئی۔ ساری گھبراہٹ، سارا ضعف دور ہو گیا۔ اس کی جگہ اعتماد کی قوت پیدا ہوئی۔ فرض کے احساس نے اس کے سارے ادراک کو بیدار کر دیا۔ اسٹوو جلا کر اس نے روئی کے گالوں سے وکیل صاحب کی چھاتی کو سینکنا شروع کیا۔ کوئی پندرہ منٹ تک متواتر سینکنے کے بعد وکیل صاحب کی سانس کچھ

رکی۔ رتن کے دونوں ہاتھ اپنے رخساروں پر رکھ کر بولے:

"تمہیں بڑی تکلیف ہو رہی ہے رتن! کیا جانتا تھا کہ یہ وقت اتنی جلد آ جائے گا۔ میں نے تمہارے اوپر بڑا ظلم کیا ہے۔ کتنا وحشیانہ ظلم۔ میں نے تمہاری زندگی غارت کر دی۔ میری خطاؤں کو معاف کرنا۔"

یہی آخری الفاظ تھے جو ان کے منہ سے نکلے۔ یہی زندگی کا آخری رشتہ تھا۔

یہی بزم حیات کا آخری دور۔

رتن نے مایوس نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ ابھی تک مہراج کا پتا نہ تھا۔ ہاں ٹیمل کھڑا تھا۔

رتن نے کہا: "ٹیمل ذرا پانی گرم کرو گے؟"

ٹیمل نے وہیں کھڑے کھڑے کہا: "پانی گرم کیا کرو گی بہو جی۔ گئو دان کرا دو۔ دو بوند گنگا جل منہ میں ڈال دو۔"

رتن نے مرنے والے کی چھاتی پر ہاتھ رکھا۔ گویا ٹیمل کی باتیں اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔ وکیل صاحب کا سینہ گرم تھا۔ اس نے پھر منتظر آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ مہراج نہ نظر آئے، وہ اب بھی سوچ رہی تھی۔ کبیراج آ جاتے تو شاید ان کی حالت سنبھل جاتی۔ پچھتا رہی تھی کہ ان کو یہاں کیوں لائی۔ شاید راستے کی تھکان اور آب و ہوا کی تبدیلی نے مرض کو لاعلاج کر دیا۔ یہ پچھتاوا ابھی ہو رہا تھا کہ میں شام کو سیر کرنے چلی گئی۔ شاید اتنی ہی دیر میں انہیں سردی لگ گئی ہو۔

لیکن پچھتاوے کی یہی باتیں نہ تھیں۔ اس آٹھ سال کی زندگی میں میں نے

انہیں کیا آرام پہنچایا۔ وہ بارہ بجے تک قانونی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ میں پڑی سویا کرتی تھی ۔وہ مؤکلوں سے معاملۂ مقدمہ کی باتیں کرتے تھے، میں باغیچہ اور بازاروں کی سیر کرتی تھی۔ میں نے انہیں کسب دولت کا محض ایک آلہ سمجھ لیا۔وہ کتنا چاہتے تھے کہ میں ان کے ساتھ بیٹھوں اور باتیں کروں، لیکن میں بھاگتی پھرتی تھی۔ میں نے کبھی ان کے دل کے قریب جانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اپنے گھر میں چراغ نہ جلا کر دوسروں کے اجالے گھر کا لطف اٹھاتی رہی۔تفریح کے سوا مجھے اور کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ اپنے جلے ہوئے دل کو یوں تسکین دے کر میں خوش تھی۔کھیر اور ملائی کی تھالی مجھے کیوں نہ ملی۔ اس غم میں میں نے اپنی روٹیوں کو لات ماردی۔

آج رتن کو اس محبت کا کامل ثبوت ملا۔جو مرنے والے کے دل میں تڑپتی رہتی تھی۔رتن کے لیے تو زندگی میں پھر بھی کچھ دلچسپی تھی، ان کے لیے زندگی میں کون سا آرام تھا۔زندگی کیا ایک مستقل ریاضت تھی، جس کا خاص مقصد تکمیل فرض تھا۔ کیا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی ان فکروں سے انہیں آزاد نہ کرسکتی تھی۔کون کہہ سکتا ہے کہ دلجوئی اور مزاج شناسی سے یہ بجھنے والا چراغ کچھ دن اور روشن رہتا، لیکن اس نے شوہر کے ساتھ اپنے فرض کا کبھی خیال ہی نہ کیا۔ اس کا دل ہمیشہ بغاوت پر کمر بستہ رہا۔محض اس لیے کہ ان سے میرا تعلق کیوں ہوا۔رتن کا ضمیر اس وقت اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کے احساس سے پامال ہو رہا تھا۔اس نے شوہر کے بے جان قدموں پر اپنا سر جھکایا اور بلک بلک کر رونے لگی۔وہ سارے باغیانہ جذبات، جو اس کے دل میں اٹھتے رہتے تھے، وہ سارے ناہمدردانہ خیالات، جنہیں وہ بار بار

دبانے کی کوشش کرتی رہتی تھی، اس وقت سینکڑوں بچھوؤں کی طرح ڈنک مار رہے تھے۔ ہائے میرا یہ برتاؤ، اس آدمی کے ساتھ تھا، جس نے اپنے تئیں مجھ پر قربان کر دیا۔ ان باتوں کو یاد کر کے اس کا دل پھٹا جاتا تھا۔ ان قدموں پر سر رکھے ہوئے اسے یہی آرزو ہوتی تھی کہ اسی وقت میری جان نکل جائے، ان قدموں کو اپنی پیشانی سے سہلاتے ہوئے۔ آج اس کے دل میں کتنا ایثار دوڑا آتا تھا کہ گویا مدتوں کی اندوختہ دولت کو وہ آج ہی اسی وقت لٹا دے گی۔ موت کی نورانی ضیا کے سامنے اس کے باطن کی ساری کدورتیں مٹ گئیں۔

وکیل صاحب کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، لیکن چہرے پر کسی جذبہ کے آثار نہ تھے۔ رتن کی بے خودی بھی ان کے بجھتے ہوئے ادراک کو روشن نہ کر سکتی تھی۔ شادی اور غم کی بندشوں سے وہ آزاد ہو گئے تھے اور کوئی روئے تو غم نہیں۔ ہنسے تو خوشی نہیں۔ ٹیمل نے اچمنی میں گنگا جل لے کر ان کے منہ میں ڈال دیا۔ آج انہوں نے کچھ مزاحمت نہ کی وہ جو رسوم اور معتقدات کا دشمن تھا، اس وقت خاموش ہو گیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ اس میں مذہبی اعتقاد رونما ہو گیا تھا، بلکہ اس میں اب کوئی حس نہ تھی، اتنے ہی توکل سے وہ زہر کا گھونٹ بھی پی جاتا۔

انسانی حیات کا اہم ترین واقعہ کتنی خاموشی کے ساتھ ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ وہ کائنات کا ایک رکن اعظم، وہ تمناؤں کا طوفانی سمندر، وہ سعی و عمل کا لافانی مخرج، وہ محبت اور حسد، خوشی اور رنج کا جولان گاہ، وہ عقل و شعور کی رنگ بھوم، نہ جانے کب اور کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ کسی کو خبر نہیں ہوتی۔

ایک ہچکی بھی نہیں، ایک سانس بھی نہیں، ایک آہ بھی نہیں نکلتی۔ سمندر کی

موجوں کا کہاں خاتمہ ہوتا ہے، کون بتا سکتا ہے۔ آواز فضا میں کہاں مدغم ہو جاتی ہے، کون جانتا ہے۔ حیات انسانی کا کہاں خاتمہ ہوتا ہے کون جانتا ہے، حیات انسانی اس موج کے سوا، اس آواز کے سوا اور کیا ہے، اس کی تحلیل بھی اتنی پر سکون، اتنی ہی غیر محسوس ہو۔ کیا تعجب ہے، عناصر کے معتقد پوچھتے ہیں کیا چیز نکل گئی؟ طبیعات کا معتقد کہتا ہے، ایک خفیف سی چمک نکل جاتی ہے، کوئی کہتا ہے آنکھوں سے جان نکلی۔ کوئی منہ سے، کوئی ان سے پوچھے موجیں فنا ہوتے وقت چمک کیا اٹھتی ہیں، آواز غائب ہوتے وقت کیا مجسم ہو جاتی ہے۔ وہ فنا اس ابدی سفر کی محض ایک منزل ہے، جہاں سفر کا خاتمہ نہیں بلکہ اس کی توسیع ہوتی ہے۔

کتنا حیرت انگیز انقلاب ہے، وہ جو مچھر کے ڈنک کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اب اسے چاہے مٹی میں دبا دو، خواہ آگ کی چتا پر رکھ دو، اس کی پیشانی پر شکن نہ آئے گی۔

ٹیمل نے وکیل صاحب کے منہ کی طرف دیکھ کر کہا:

''بہو جی آیئے! مالک کو کھاٹ سے اتار دیں۔ وہ چلے گئے۔''

یہ کہہ کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔ آج اس کی تیس سال کی رفاقت ختم ہو گئی۔ جس نے کبھی آدھی بات نہیں کہی، کبھی تو کر کے نہیں پکارا، وہ مالک اب اسے چھوڑے جا رہا ہے۔

رتن ابھی تک کبیراج کا انتظار کر رہی تھی۔ ٹیمل کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اسے دھچکا سا لگا۔ اس نے اٹھ کر وکیل صاحب کی چھاتی پر ہاتھ رکھا۔ ساٹھ سال کی مسلسل حرکت کے بعد وہ اس وقت خاموش تھی۔ رتن کو پھر پیشانی پر ہاتھ رکھنے

کی ہمت نہ پڑی۔ اس جسم کو چھوتے ہوئے، اس بے جان چہرے کی طرف تاکتے ہوئے اسے کچھ احتراز ہو رہا تھا، جو استکراہ سے مشابہ تھا۔ ابھی جن قدموں پر سر رکھ کر وہ روتی تھی، اسے چھوتے ہوئے انگلیاں کٹی سی جاتی تھیں، رشتۂ حیات اتنا نازک ہے، اس نے ایسا کبھی نہ سمجھا تھا۔

ایک لمحہ کے بعد ٹیمل نے کہا:

''بہو جی! اب کیا دیکھتی ہو، کھاٹ سے نیچے اتار دو۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔''

اس نے پیر پکڑا۔ رتن نے سر پکڑا اور لاش کو نیچے لٹا دیا۔ تب وہیں زمین پر بیٹھ کر رتن رونے لگی۔ اس لیے نہیں کہ دنیا میں اب کوئی اس کا دستگیر نہ تھا، بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ اپنا فرض پورا نہ کر سکی۔

اسی وقت موٹر کی آواز آئی اور کبیراج نے کمرے میں قدم رکھا۔

شاید اب بھی رتن کے دل میں امید کی کوئی بجھتی ہوئی چنگاری چھپی پڑی تھی۔ اس نے فوراً آنکھیں پونچھ ڈالیں۔ سر کا آنچل سنبھال لیا۔ الجھے ہوئے بال سمیٹ لیے اور کھڑی ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی، مگر کبیراج سے کچھ پوچھتے ہوئے اس کی روح کانپ رہی تھی۔

نور سحر نے آسمان کو اپنی سنہری کرنوں سے رنگین کر دیا تھا۔ کیا اس وجود کے خیر مقدم کی تیاریاں ہو رہی تھیں؟

اسی دن لاش کاشی لائی گئی۔وکیل صاحب کے ایک بھتیجے مالوہ میں رہتے تھے، انہیں تار دے کر بلایا گیا۔آخری مراسم انہی نے ادا کیے۔

جالپا آج کل سارے دن رتن ہی کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔بدنصیب رتن کو نہ گھر بار کی سدھ تھی، نہ کھانے پینے کی۔روز ہی کوئی نہ کوئی ایسی بات یاد آ جاتی، جس سے رونے کا ایک بہانہ مل جاتا۔شوہر کے ساتھ اس کے جو فرائض تھے، اس کے ایک حصے کی بھی اس نے تعمیل کی ہوتی تو اسے تسکین ہوتی۔اپنی بے دردی، اپنی نافرض شناسی، اپنی آرائش پسندی کے چرچے کر کے ہی وہ اپنے ضمیر کو تشفی دیتی تھی۔جب تک اس کی زندگی کے دروازے پر ایک محافظ بیٹھا ہوا تھا، اسے کسی کتے بلی یا چور چکار کا اندیشہ نہ تھا، لیکن اب دروازہ پر کوئی محافظ نہ تھا۔اس لیے وہ ہوشیار رہتی تھی۔شوہر کا ذکر خیر کرتی رہتی تھی۔گزر بسر کیسے ہوگی، نوکروں چاکروں میں کس کس کو جواب دینا ہوگا۔گھر کے کون کون سے خرچ کم کرنے کی ضرورت ہے۔ان مسئلوں کے متعلق کوئی گفتگو ہی نہ ہوتی۔گویا یہ فکر مرنے والے کی روح کے ساتھ بے وفائی ہوگی۔کھانا، صاف کپڑے پہننا اور کچھ پڑھ کر دل بہلانا بھی اسے غیر مناسب سا معلوم ہوتا تھا۔شرادھ کے دن اس نے اپنے سارے کپڑے اور زیور مہابرہمن کو دے ڈالے۔ان چیزوں کی اب اسے کیا ضرورت ہے۔اس کے برعکس شوہر کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ان کی نشانی سمجھ کر وہ دیکھتی بھالتی رہتی تھی۔اس کا مزاج اتنا متحمل ہو گیا تھا کہ کتنا ہی بڑا نقصان ہو جائے، اسے غصہ نہ آتا تھا۔ٹیمل کے ہاتھ سے چائے کا سیٹ چھوٹ کر گر پڑا، لیکن رتن چیں بہ جبیں بھی نہیں ہوئیں۔پہلے ایک دوات ٹوٹ جانے پر اس ٹیمل کو اس نے بری طرح

ڈانٹ پلائی تھی، مگر آج اس سے کئی گنے بڑے نقصان پر اس نے زبان تک نہ کھولی۔

وکیل صاحب کے بھتیجے کا نام تھا منی بھوشن۔ بڑا ہی ملنسار، خوش مزاج اور کارگزار۔ اسی ایک مہینے میں اس نے صدہا دوست بنا لیے۔ شہر میں جن جن وکیلوں اور رئیسوں سے وکیل صاحب کا یارانہ تھا، ان سبھی سے ایسا میل جول بڑھایا، ایسی بے تکلفی پیدا کی کہ رتن کو خبر تک نہ ہوئی اور اس نے بینک کا لین دین اپنے نام سے شروع کر دیا۔ الٰہ آباد بینک میں وکیل صاحب کے پچیس ہزار روپے جمع تھے، ان پر تو اس نے قبضہ کر ہی لیا۔ مکانوں کے کرائے بھی خود ہی وصول کرنے لگا۔ مواضعات کی تحصیل بھی شروع کر دی۔ گویا رتن سے کوئی مطلب ہی نہیں۔

ایک دن ٹیمل نے رتن سے آ کر کہا۔ "بہو جی جانے والا تو چلا گیا۔ اب گھر بار کی بھی کچھ خبر لیجیے۔ میں نے سنا ہے، بھیا نے بینک کا سب حساب اپنے نام کر لیا۔"

رتن نے اس کی طرف ایسی غضب ناک آنکھوں سے دیکھا کہ پھر اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہوئی۔ اسی دن شام کو منی بھوشن نے ٹیمل کو نکال دیا۔ چوری کا الزام لگا کر نکالا، جس میں رتن کچھ کہہ بھی نہ سکی۔

اب صرف مہراج رہ گئے۔ انہیں منی بھوشن نے بھنگ پلا پلا کر ایسا ملایا کہ وہ انہی کا دم بھرنے لگے۔ مہری سے کہتے، بابو جی نے بڑا رئیسانہ مزاج پایا ہے۔ کوئی چیز لاؤ، کبھی نہیں پوچھتے کتنے کو لائے۔ بڑوں کے گھروں میں بڑے ہی پیدا ہو

تے ہیں۔ بہو جی تو بال کی کھال نکالتی رہتی تھیں۔ مہری کا منہ پہلے ہی سی دیا گیا تھا۔ اس کے ڈھلتے ہوئے حسن پر نئے مالک غیر معمولی طور پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ وہ کسی نہ کسی بہانے سے باہر کے دیوان خانے میں ہی منڈلایا کرتی۔ رتن کو ذرا بھی خبر نہ تھی کہ کس طرح اس کے خلاف قلعہ بندی ہو رہی ہے۔

ایک دن منی بھوشن نے رتن سے کہا:

''کاکی! اب تو مجھے یہاں رہنا فضول معلوم ہوتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ آپ کو لے کر گھر چلا جاؤں۔ وہاں آپ کی بہو آپ کی خدمت کرے گی۔ بال بچوں میں جی بہل جائے گا اور خرچ بھی کم ہو جائے گا۔ آپ کہیں تو یہ بنگلہ بیچ کر دوں۔ اچھے دام اٹھیں گے۔''

رتن اس طرح چونکی، گویا کسی نے اسے جھنجوڑ کر جگا دیا۔ بولی:

''کیا مجھ سے کچھ کہہ رہے ہو؟''

منی بھوشن:

''جی ہاں، کہہ رہا تھا کہ اب ہم لوگوں کو یہاں رہنا فضول ہے، اب تو یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔''

رتن نے بے دلی سے کہا: ''ہاں اچھا تو ہو گا۔''

منی بھوشن: ''کاکا جی نے کوئی وصیت لکھی ہو۔ لائیے دیکھوں۔ ان کی مرضی ہمارے لیے مقدم ہے۔''

رتن نے اسی طرح آسمان پر بیٹھے ہوئے گویا دنیا کی باتوں سے اسے کوئی علاقہ نہیں ہے، جواب دیا:

''وصیت تو نہیں لکھی اور اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟''

منی بھوشن نے پھر پوچھا: ''شاید کہیں لکھ کر رکھ گئے؟''

منی بھوشن نے دل میں خوش ہو کر کہا: ''میری خواہش ہے کہ ان کی کوئی یادگار بنوادی جائے۔''

رتن نے خوش ہو کر کہا: ''میں بھی یہی چاہتی ہوں۔''

منی: ''گاؤں کی آمدنی کوئی تین ہزار روپیہ سال کی ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہے، اتنا ہی وہ سال بھر میں خیرات کرتے تھے۔ دو ڈھائی سو سے کہیں مہینہ میں کم نہ ہوتا تھا۔ میری تجویز ہے کہ وہ ساری مدیں جیوں کی تیوں قائم رہیں۔''

رتن نے اسی لہجہ میں کہا: ''ہاں اور کیا؟''

منی: ''تو گاؤں کی آمدنی تو خیراتی کاموں کے لیے وقف کر دی جائے۔ مکانوں کا کرایہ کوئی دو سو روپے ماہوار ہے۔ اس سے ان کے نام ایک چھوٹی سی سنسکرت پاٹھ شالہ کھول دی جائے۔''

رتن: ''بہت اچھا ہوگا۔''

''اور یہ بنگلہ بیچ دیا جائے۔ اس روپے کو بینک میں رکھ دیا جائے۔''

رتن: ''بہت اچھا ہوگا، مجھے روپے پیسے کی اب کیا ضرورت ہے؟''

منی: ''آپ کی خدمت کے لیے تو ہم سب حاضر ہی ہیں۔ موٹر کار بھی نکال دی جائے۔ ابھی سے انتظام ہوگا تو جا کر کہیں دو تین مہینے میں فرصت ملے گی۔''

رتن نے لاپروائی سے کہا: ''ابھی جلدی کیا ہے، کچھ روپیہ بینک میں تو ہے۔''

منی: ''بینک میں روپے تھے، مگر مہینہ بھر سے خرچ بھی تو ہو رہے ہیں۔ ہزار

پانچ سو پڑے ہوں گے۔ یہاں تو روپے پیسے ہوا میں اڑ جاتے ہیں۔ مجھ سے تو یہاں ایک مہینہ بھی نہ رہا جائے۔ موٹر کو بھی جلدی سے نکال دینا چاہیے۔"

رتن نے اس کے جواب میں یہی کہا اچھا تو ہو گا، وہ اس دماغی تعطل کی حالت میں تھی، جب انسان کو چھوٹے چھوٹے کام بھی اسوجھ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ منی بھوشن کی کارپردازیوں نے اسے مغلوب کر دیا تھا۔ اس وقت اس کے ساتھ جو شخص تھوڑی سی ہمدردی ظاہر کر دیتا، اس پر کوئی نقش بھی آسانی سے جم سکتا تھا۔ اس وقت سبھی اسے اپنے نظر آتے تھے۔ اسے کسی پر شبہ نہ تھا۔ کسی سے ضرر کا خوف نہ تھا۔ شاید کوئی چور بھی اس کے سامنے اس کا مال و متاع اٹھا لے جاتا تو شور نہ مچاتی۔

(32)

تیرہویں کے بعد جالپا نے رتن کے گھر آنا جانا کم کر دیا تھا۔ صرف ایک بار گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے چلی جایا کرتی تھی۔ ادھر کئی دنوں سے منشی دیانا تھ کو بخار آنے لگا تھا۔ انہیں بخار میں چھوڑ کر کیسے جاتی؟ منشی جی کو ذرا بھی بخار آ جاتا تو بک جھک کرنے لگتے تھے۔ کبھی گاتے، کبھی روتے۔ کبھی موت کے فرشتوں کو اپنے سامنے ناچتے دیکھتے۔ ان کا جی چاہتا کہ سارا گھر میرے پاس بیٹھا رہے۔ بلکہ رشتہ داروں کو بھی بلا لیا جائے تاکہ وہ سب سے آخری ملاقات کر لیں، کیونکہ اس بیماری سے بچنے کی انہیں کوئی امید نہ تھی۔ جاگیشری اور سب کچھ کر سکتی تھی، مگر ہرزہ

سرائیاں نہ سن سکتی تھی۔ جیوں ہی وہ رونے لگتے، وہ کمرے سے نکل جاتی۔ اسے آسیب کا اندیشہ تھا۔

منشی جی کے کمرے میں کئی اخباروں کے فائل تھے۔ یہی انہیں ایک شوق تھا۔ جالپا کا جی وہاں بیٹھے بیٹھے گھبرانے لگتا تو ان فائلوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی۔ ایک دن اس نے ایک پرانے اخبار میں ایک شطرنج کا نقشہ دیکھا، جسے حل کر دینے کے لیے کسی رئیس نے انعام دے رکھا تھا۔ اسے خیال آیا کہ جس طاق پر رماناتھ کی بساط اور مہرے رکھے ہوئے ہیں، اسی پر ایک کتاب میں نقشے بھی دیئے ہوئے ہیں۔ وہ فوراً دوڑتی ہوئی اوپر گئی اور کتاب اٹھا لائی۔ یہ نقشہ اسی کاپی میں موجود تھا اور نقشہ ہی نہ تھا، اس کا حل بھی دیا ہوا تھا۔ معاً جالپا کو یہ خیال پیدا ہوا۔ اس نقشہ کو کسی اخبار میں چھپوا دوں تو کیسا ہو۔ شاید رماناتھ کی نگاہ اس پر پڑ جائے۔ یہ نقشہ اتنا آسان تو نہیں ہے کہ آسانی سے حل ہو جائے۔ اس نے سوچا، اس شہر میں جب ان کا ثانی کوئی نہیں ہے تو ایسے لوگوں کی تعداد بہت نہیں ہو سکتی، جو یہ نقشہ حل کر سکیں۔ کچھ بھی ہو، جب رماناتھ نے یہ نقشہ حل کیا ہے تو یقیناً وہ اسے پھر حل کر لیں گے۔ جو لوگ پہلی بار دیکھیں گے، انہیں سوچنے میں دو ایک دن ضرور لگ جائیں گے۔ جالپا نے اس نقشہ کو حل کرنے کے لیے کچھ انعام مقرر کر دینے کا فیصلہ کیا ہوا تو ہے ہی، انہیں روپے نہ ملیں تاہم اتنا تو ممکن ہے ہی کہ حل کرنے والوں میں ان کا نام ہو۔ اس طرح کچھ پتا لگا جائے گا۔ کچھ بھی نہ ہو، روپے ہی تو جائیں گے۔

اسی ادھیڑ بن میں وہ آج رتن سے نہ مل سکی۔ رتن دن بھر تو اس کی راہ دیکھتی

رہی۔ جب وہ شام کو بھی نہ گئی تو اس سے رہا نہ گیا۔ آج وہ شوہر کی وفات کے بعد پہلی بار گھر سے نکلی ہے۔ اسے تیز موٹر چلانے کی دھن تھی، لیکن آج موٹر کی رفتار تانگے سے بھی سست تھی۔ ایک بڑھیا کو سڑک کے کنارے بیٹھے دیکھ کر اپنی موٹر کو روک دیا اور اسے چار آنے کے پیسے دے دیئے اور آگے بڑھی تو دو کانسٹیبل ایک قیدی کو لے جا رہے تھے۔ اس نے موٹر روک کر ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اسے ایک روپیہ دے کر کہا۔ اس قیدی کو مٹھائی کھلا دینا۔ کانسٹیبل نے سلام کر کے روپیہ لے لیا۔ آج کسی خوش نصیب کا منہ دیکھ کر اٹھا تھا۔ جالپا نے اسے دیکھتے ہی کہا:

''معاف کرنا بہن! آج میں نہ آسکی۔ دادا کو کئی دن سے بخار آ رہا ہے۔''

رتن نے منشی جی کے کمرے کی طرف قدم اٹھایا اور پوچھا:

''وہیں ہیں نا، تم نے مجھ سے نہیں کہا؟''

منشی جی کا بخار اس وقت کچھ اترا ہوا تھا۔ رتن کو دیکھ کر بولے:

''بہت رنج ہوا دیوی جی، مگر یہ تو دنیا ہے۔ آج ایک کی باری ہے، کل دوسرے کی باری ہے۔ چل چلاؤ لگا ہوا ہے۔ اب میں بھی چلا۔ اب نہیں بچ سکتا۔ بڑی پیاس ہے، جیسے سینے میں کوئی بھٹی جل رہی ہو۔ پھنکا جاتا ہوں۔ کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ دیوی جی دنیا کے ناتے سب غرض کے ناتے ہیں۔ آدمی ہاتھ پسارتے اکیلا ایک دن چلا جاتا ہے۔ رما ہوتا تو آج ایک چلو پانی تو دیتا۔ دو لونڈے ہیں، انہیں کوئی فکر ہی نہیں۔ میں مروں یا جیوں۔ یہاں بیٹھتے دونوں کا دم گھٹتا ہے۔ آپ سے یہ آخری ملاقات ہے۔''

رتن نے تشفی دی: ''یہ ملیریا ہے لالہ جی! دو چار دن میں آپ اچھے ہو جائیں

گے۔گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

منشی جی نے بیکسانہ انداز سے کہا: ''بیٹھ جایئے دیوی جی، آپ کی دعا ہے تو شاید بچ جاؤں لیکن مجھے امید تو نہیں ہے۔میں بھی ٹال ٹھونک کریم راج سے لڑنے کو تیار بیٹھا ہوں۔اسی طرح وہاں بھی کچہریاں ہیں، حاکم ہیں، راجا ہیں، تقریریں ہوتی ہیں، اخبار نکلتے ہیں۔پھر کیا فکر ہے۔وہاں بھی اہلمد ہو جاؤں گا۔''

رتن کو ایسی ہنسی چھوٹی کہ وہاں کھڑی نہ رہ سکی۔منشی جی مذاق میں یہ باتیں نہیں کر رہے تھے۔ان کا لب و لہجہ نہایت درجہ متین تھا۔آج ڈیڑھ دو مہینہ کے بعد رتن کو ہنسی آئی اور اس بے موقع ہنسی کو چھپانے کے لیے وہ کمرے سے نکل گئی۔اس کے ساتھ جالپا بھی باہر آ گئی۔

رتن نے معذرت آمیز لہجہ میں کہا: ''دادا جی نے دل میں کیا سمجھا ہوگا۔سوچتے ہوں گے، میں تو جان سے مر رہا ہوں اور اسے ہنسی سوجھتی ہے۔اب وہاں نہ جاؤں گی۔نہیں ایسی بات پھر کہیں تو میری ہنسی نہ رکے گی۔دیکھو تو آج کتنی بے موقع ہنسی آئی ہے۔''

جالپا نے اس کے دلی جذبات کو تاڑ کر کہا: ''مجھے اکثر ان کی باتوں پر ہنسی آ جاتی ہے۔اس وقت ہنسی روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔آج سویرے کہنے لگے، میرا پیٹ بھک ہو گیا۔میرا پیٹ بھک ہو گیا۔اس کی رٹ لگا دی۔اس کا مطلب کیا تھا، نہ سمجھ سکی، نہ اماں سمجھ سکیں، مگر وہ برابر یہی رٹ لگائے جاتے تھے۔آؤ کمرے میں چلیں۔''

رتن: ''میرے ساتھ نہ چلو گی؟''

''آج تو نہ چل سکوں گی۔''

''کل آؤ گی؟''

''کہہ نہیں سکتی۔دادا کی طبیعت اچھی رہی تو آؤں گی۔''

''نہیں بھائی ضرور آنا۔تم سے ایک صلاح کرنا ہے۔''

''کیا صلاح ہے؟''

''منی کہتے ہیں، یہاں اب رہنا فضول ہے۔ان کی صلاح ہے بنگلہ بیچ دیا جائے اور ہم لوگ مالوہ چلے جائیں۔''

جالپا تعجب سے بولی: ''یہ تو تم نے بری خبر سنائی۔بہن مجھے اس حالت میں چھوڑ کر چلی جاؤ گی، میں نہ جانے دوں گی۔منی سے کہہ دوں گی تم کل ایک ہفتہ باہر رہیں۔مجھے ایک ایک پل پہاڑ ہو گیا۔اب تو شاید میں ہی جاؤں۔نہیں بہن تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ابھی جانے کا نام نہ لو۔''

رتن بھی آبدیدہ ہو کر بولی: ''مجھ سے بھی وہاں نہ رہا جائے گا۔سچ کہتی ہوں تو منی سے کہہ دوں گی مجھے نہیں جانا ہے۔''

جالپا اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے میں لے گئی اور اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر طفلانہ انداز سے بولی: ''قسم کھاؤ کہ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ گی؟''

رتن نے اسے آغوش میں لے کر کہا۔''لو قسم کھاتی ہوں، نہ جاؤں گی۔چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔میرے لیے وہاں کیا رکھا ہے۔بنگلہ بھی کیوں بیچوں۔دو ڈھائی سو مکانوں کا کرایہ ہے۔ہم دونوں کے گزارے کے لیے کافی ہے۔میں ابھی منی سے کہہ دوں گی، نہ جاؤں گی۔''

دفعتاً فرش پر مہرے اور شطرنج کو دیکھ کر پوچھا: ''یہ شطرنج کس کے ساتھ کھیل رہی تھیں؟''

جالپا نے شطرنج کے نقشہ پر اپنی تقدیر کا پانسہ پھینکنے کی جو تجویز سوچی تھی، وہ اسے کہہ سنائی۔ دل میں ڈر رہی تھی کہ رتن کہیں اس تجویز کو پاگل پن نہ خیال کرے، لیکن رتن سنتے ہی باغ باغ ہوگئی۔ بولی: ''دس روپے کا انعام تو بہت کم ہے، پچاس روپے کر دو۔ روپے میں دیتی ہوں۔''

جالپا نے اعتراض کیا: ''تب تو بڑے بڑے شطرنج باز میدان میں آ جائیں گے۔''

رتن: ''کوئی مضائقہ نہیں۔ بابو جی کی نگاہ پڑ گئی تو وہ اسے ضرور حل کرلیں گے اور مجھے امید ہے، سب سے پہلے انہی کا نام آوے گا۔ کچھ نہ ہوگا تو پتا لگ ہی جائے گا۔ تم نے بڑی اچھی تدبیر سوچ نکالی۔''

جالپا نے پوچھا: ''تو تمہیں امید ہے؟''

''پوری، میں کل سویرے روپے لے کر آؤں گی۔''

''تو میں آج خط لکھ رکھوں گی۔ کسی مشہور اخبار میں بھیجنا چاہیے۔''

''کلکتہ میں تو زیادہ تر لوگ ''وشومتر'' ہی پڑھتے نظر آتے ہیں۔''

اسی وقت منشی جی پکار اٹھے: ''بہو، بہو!''

جالپا تو لپکی ہوئی ان کے کمرے کی طرف چلی، رتن باہر جا رہی تھی کہ جاگیشری پنکھا جھلتی نظر آئیں۔

رتن نے پوچھا: ''تمہیں گرمی لگ رہی ہے اماں جی! میں تو مارے سردی کے

کانپ رہی ہوں، ارے تمہارے پاؤں میں کیا سفید سفید لگا ہوا ہے؟ کیا آٹا پیس رہی تھیں؟''

جاگیشری نے شرمندہ ہو کر کہا: ''ہاں وید جی نے انہیں ہاتھ کے آٹے کی روٹی کھانے کو کہا ہے۔ بازار میں ہاتھ کا آٹا کہاں میسر۔ محلّہ میں کوئی پسنہاری نہیں ملتی۔ مزدورنیں تک چکی میں آٹا پسوا لیتی ہیں، کوئی ملتی ہی نہیں۔''

رتن نے تعجب سے پوچھا: ''تم سے چکی چل جاتی ہے؟''

جاگیشری مسکرا کر بولی: ''کون بہت سا گیہوں تھا۔ پاؤ بھر تو دونوں وقت کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ ایک لقمہ بھی نہیں کھاتے۔ بہو پینے جا رہی تھی مگر پھر مجھے ان کے پاس بیٹھنا پڑتا۔ مجھے رات میں چکی پیسنا منظور ہے، ان کے پاس گھنٹے بھر بیٹھنا منظور نہیں۔

رتن جا کر جانت کے پاس ایک منٹ کھڑی رہی۔ پھر مسکرا کر مانجی پر بیٹھ گئی اور بولی: ''تم سے تو یہ جانت نہ چلتا ہو گا ماں، لاؤ تھوڑا سا گیہوں مجھے دو، دیکھوں تو۔''

جاگیشری نے کانوں پر ہاتھ رکھا اور کہا: ''ارے نہیں بہو، تم کیا پیسو گی، چلو یہاں سے۔''

رتن نے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا: ''میں نے بہت دنوں تک پیسا ہے، اماں۔ جب اپنے گھر تھی تو روز پیستی تھی۔ لاؤ تھوڑا سا گیہوں لاؤ۔''

''ہاتھ دکھنے لگے گا، چھالے پڑ جائیں گے۔''

''کچھ نہیں ہو گا ماجی۔ آپ گیہوں تو لائیے۔''

جاگیشری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کرکے کہا: ''گیہوں گھر میں نہیں ہے۔ اب اس وقت بازار سے کون لاوے۔''

رتن کو اعتبار نہ آیا، بولی: ''اچھا چلیے۔ میں آپ کے بھنڈارے میں دیکھوں، ہوگا کیسے نہیں؟''

رسوئی کی بغل والی کوٹھڑی میں کھانے کا سامان رہتا تھا۔ رتن اندر چلی گئی اور ہانڈیوں میں ٹٹول کر دیکھنے لگی۔ ایک ہانڈی میں گیہوں نکل آئے، خوش ہو کر بولی: ''دیکھو اماں! نکلے کہ نہیں، تم مجھ سے بہانہ کر رہی تھیں۔''

اس نے ایک ڈلیا میں تھوڑے سے گیہوں نکال لیے اور خوش خوش جانت پر جا کر پیسنے لگی۔

جاگیشری نے جا کر جالپا سے کہا: ''بہو وہ جانت پر بیٹھی گیہوں پیس رہی ہے۔ اٹھاتی ہوں، اٹھتی ہی نہیں۔ کوئی دیکھ لے تو کیا کہے؟''

جالپا نے منشی جی کے کمرے سے نکل کر ساس کی پریشانی کا مزہ اٹھانے کے لیے کہا: ''یہ تم نے کیا غضب کیا۔ اماں سچ مچ کوئی دیکھ لے تو ناک ہی کٹ جائے۔ چلیے دیکھوں۔''

جاگیشری نے مجبوری کے انداز سے کہا: ''میں تو سمجھا کے ہار گئی، مانتی ہی نہیں۔''

جالپا نے جا کر دیکھا تو رتن گیہوں پیسنے میں مگن تھی۔ تفریح کی فطری مسرت سے اس کا چہرہ شگفتہ ہو رہا تھا۔ اتنی ہی دیر میں اس کے ماتھے پر پسینہ کی بوندیں آ گئی تھیں۔ اس کے مضبوط ہاتھوں میں جانت لٹو کی طرح ناچ رہا تھا۔

جالپا نے ہنس کر کہا: ''اوری آٹا مہین ہو، ورنہ پیسے نہ ملیں گے۔''

رتن کو سنائی نہ دیا۔ بہروں کی طرح اس کے منہ کی طرف تاک کر مسکرائی۔

جالپا نے اور زور سے کہا: ''آٹا خوب مہین پیسنا، نہیں تو پیسے نہ ملیں گے۔''

رتن نے بھی ہنس کر کہا: ''جتنا مہین کہیے اتنا مہین پیس دوں۔ بہو جی، پسائی اچھی ملنی چاہیے۔''

جالپا: ''دھیلے سیر۔''

رتن: ''دھیلی سیر ہی سہی۔''

''منہ دھو آؤ، دھیلے سیر ملے گی۔''

''میں یہ سب پیس کر اٹھوں گی، تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔''

''آ جاؤں، میں بھی پِسوا دوں۔''

''جی چاہتا ہے، کوئی جانت کا گیت گاؤں۔''

جالپا نے جاگیشری کو منشی جی کے کمرے میں بھیج دیا اور جانت پر جا بیٹھی۔ دونوں سہیلیاں یہ گیت گانے لگیں:

''موہے جوگن بنا کے کہاں گئے رے جوگیا''

دونوں کے گلے میں لوچ تھا۔ جانت کا گھنگر، گھنگران کے گیت پر ساز کا کام دے رہا تھا۔ جب دونوں ایک کڑی گا کر خاموش ہو جاتیں تو جانت کی آواز گویا گیت کی آواز سے ہم آہنگ ہو کر اور بھی دلکش ہو جاتی تھی۔ دونوں کے دل اس وقت مسرت حیات کے فطری سرور سے پر تھے۔ نہ غم کا بوجھ تھا، نہ فراق کی خلش۔ گویا دو چڑیاں طلوع سحر کی کیفیتوں سے مست ہو کر چہک رہی تھیں۔

رماناتھ کی چائے کی دکان کھل تو گئی، مگر صرف رات کو کھلتی تھی۔ رات کو بھی زیادہ تر دیبی دین ہی دکان پر بیٹھتا، لیکن بکری اچھی ہو جاتی تھی، پہلے ہی دن تین روپے کے پیسے آئے۔ دوسرے دن چار پانچ روپے کا اوسط پڑنے لگا۔ چائے اتنی لذیذ ہوتی تھی کہ جو ایک بار یہاں چائے پی لیتا، پھر دوسری دکان پر نہ جاتا۔ رمانے کچھ تفریح کا سامان بھی جمع کر دیا۔ چراغ جلنے کے بعد سبزی کی بکری زیادہ نہ ہوتی تھی۔ وہ ان ٹوکروں کو اٹھا کر اندر رکھ دیتا اور برآمدے میں میز لگا دیتا۔ اس پر تاش کا سیٹ رکھ دیتا۔ دو روزنامہ اخبار بھی منگانے لگا۔ دکان چل نکلی۔

ان چار پانچ مہینوں کے افلاس نے رما کے ذوق تن پروری کو اور بھی تیز کر دیا تھا۔ جب تک روپے نہ تھے، وہ مجبور تھا۔ روپے ہاتھ میں آتے ہی سیر و تفریح کا جنون سر پر سوار ہو گیا۔ سینما کی بھی یاد آئی۔ روزمرہ کی جن ضروریات کو وہ اب تک ٹالتا آتا تھا، خریدی جانے لگیں۔ دیبی دین کے لیے ایک خوشنما ریشمی چادر لایا۔ جگو کے سر میں اکثر درد ہوتا رہتا تھا۔ ایک دن تیل کی خوشبودار دو شیشیاں لا کر دے دیں۔ دونوں نہال ہو گئے۔ اب بڑھیا کبھی اپنے سر پر بوجھ لاتی تو اسے ڈانٹتا۔ اب تو میں بھی چار پیسے کمانے لگا ہوں، اب تو کیوں جان دیتی ہے؟ اگر پھر کبھی تیرے سر پر ٹوکری دیکھی تو کہے دیتا ہوں، دکان اٹھا کر پھینک دوں گا۔ بڑھیا لڑکے کی یہ ڈانٹ سن کر باغ باغ ہو جاتی۔ منڈی سے بوجھ لاتی تو پہلے چپکے سے دیکھتی۔ رما دکان پر تو نہیں ہے۔ اگر وہ بیٹھا ہوتا تو کسی قلی کو ایک دو پیسے دے

کر اس کے سر پر رکھ دیتی۔ وہ نہ ہوتا تو لپکی ہوئی آتی اور جلدی سے بوجھ اتار کر اطمینان سے بیٹھ جاتی، تاکہ رما بھانپ نہ سکے۔

ایک دن منورما تھیٹر میں آغا حشر کا کوئی نیا ڈرامہ آنے والا تھا۔ اس ڈرامے کی بڑی دھوم تھی۔ ایک دن پہلے ہی سے لوگ اپنی اپنی جگہیں ریزرو کرا رہے تھے۔ رما کو بھی اپنی جگہ ریزرو کرانے کی دھن سوار ہوئی۔ سوچا کہیں رات کو ٹکٹ نہ ملا تو ناپتے ہی رہ جائیں گے۔ یہ اشتیاق پولیس کے خوف پر بھی غالب آ گیا۔ ایسی آفت نہیں آئی ہے کہ گھر سے نکلتے ہی پولیس گرفتار کر لے۔ دن کو نہ سہی رات کو نکلتا ہی ہوں۔ پولیس چاہتی تو کیا رات کو نہ گرفتار کر لیتی۔ پھر میرا وہ حلیہ بھی نہیں رہا۔ تبدیلِ ہیئت کے لیے پگڑی کافی ہے۔ یوں دل کو سمجھا کر وہ دس بجے گھر سے نکلا۔

دیبی دین کہیں گیا ہوا تھا۔ بڑھیا نے پوچھا:

''کہاں جاتے ہو بیٹا؟''

رما نے کہا: ''کہیں نہیں، ابھی آتا ہوں۔''

رما سڑک پر آیا تو اس کی ہمت برف کی طرح پگھلنے لگی۔ قدم قدم پر خوف ہوتا تھا۔ کوئی کانسٹیبل نہ آ رہا ہو۔ اسے یقین تھا کہ پولیس کا ایک ایک چوکیدار بھی اس کا حلیہ پہچانتا ہے۔ اس لیے وہ سر نیچے جھکائے چل رہا تھا۔ دفعتاً اسے خیال آیا خفیہ پولیس کے جاسوس سادہ لباس میں ادھر ادھر گھوما کرتے ہیں۔ کون جانے جو آدمی میری بغل میں آ رہا ہے، کوئی جاسوس ہی ہو۔ میری طرف کتنے غور سے دیکھ رہا ہے۔ یوں سر جھکا کر چلنے ہی سے شاید اسے شبہ ہو رہا ہے۔ یہاں اور بھی آدمی

سامنے دیکھ رہے ہیں۔کوئی سر جھکا کر نہیں چل رہا ہے۔موٹروں کی اس ریل پیل میں سر جھکا کر چلنا موت کو دعوت دینا ہے۔پارک میں کوئی اس طرح چہل قدمی کرے تو کر سکتا ہے۔یہاں تو نگاہ سامنے ہونا چاہیے،لیکن بغل وار آدمی ابھی تک میری ہی طرف تاک رہا ہے۔ہے کوئی خفیہ ہی۔رما اس کا ساتھ چھوڑنے کے لیے ایک تمبولی کی دکان پر پان کھانے لگا۔وہ آدمی آگے نکل گیا رما نے آرام کی لمبی سانس لی۔

اب اس نے سر اٹھالیا اور دل مضبوط کر کے چلنے لگا۔اس وقت ٹرام کا بھی کہیں پتا نہ تھا،نہیں تو اس پر بیٹھ جاتا۔تھوڑی ہی دور چلا ہو گا کہ اسے تین کانسٹیبل پیچھے سے آتے دکھائی دیئے۔اس نے سڑک چھوڑ دی اور پٹری پر چلنے لگا۔خواہ مخواہ سانپ کے بل میں انگلی ڈالنا کون سی بہادری ہے۔مگر وائے نصیب تینوں کانسٹیبلوں نے بھی سڑک چھوڑ کر وہی پٹری لے لی۔رما کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔دوسری پٹری پر جانا اس شبہ کو اور بھی طاقت پہنچائے گا۔کوئی ایسی گلی بھی نہیں، جس میں گھس جائے۔اب تو سب بہت قریب آ گئے۔کیا بات ہے کہ سب میری ہی طرف دیکھ رہے ہیں۔میں نے بڑی حماقت کی کہ یہ پگڑ باندھ لیا اور باندھا بھی کتنے بے تکے پن سے۔ایک ٹیلہ سا اوپر اٹھ گیا ہے۔یہ ڈگڑی آج مجھے پکڑوائے گی۔باندھی تھی اس سے صورت بدل جائے گی،یہ الٹے اور تماشا بن گئی۔تینوں میری طرف دیکھ دیکھ کر آپس میں کچھ باتیں کر رہے ہیں۔شاید میرا حلیہ ملا رہے ہیں۔اب نہیں بچ سکتا۔گھر والوں کو میری گرفتاری کی خبر ملے گی تو کتنے شرمندہ ہوں گے۔جالپا تو رو رو کر جان ہی دے دے گی۔پانچ سال سے کم سزا نہ ہو گی۔

بس زندگی کا خاتمہ ہی سمجھو۔

اس تخیل کا اس کے دل پر ایسا غلبہ ہوا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ جب کانسٹیبلوں کی جماعت قریب آ گئی تو اس کا چہرہ خوف سے کچھ ایسا تبدیل ہو گیا۔ آنکھوں میں کچھ ایسا خوف نمودار ہو گیا اور وہ کچھ اس طرح دوسرے آدمیوں کی آڑ تلاش کرنے لگا کہ عام آدمیوں کو اس پر شبہ ہونا قدرتی بات تھی۔ پھر پولیس والوں کی منجھی ہوئی آنکھیں کیوں چوکتیں؟

ایک نے رماناتھ کو للکارا: ''او جی، او پگڑی! ذرا ادھر آنا، تمہارا نام کیا ہے؟''

رماناتھ نے سینہ زوری کے انداز سے کہا: ''ہمارا نام پوچھ کر کیا کرو گے؟ کیا میں چور ہوں؟''

''چور نہیں۔ تم شاہ سہی۔ نام کیوں نہیں بتاتے؟''

رمانے ایک لمحہ کے بعد مسلسل رنج کے ساتھ کہا: ''ہیرالال۔''

''گھر کہاں ہے؟''

''ہاں گھر ہی پوچھتے ہیں!''

''شاہجہان پور۔''

''کون محلّہ؟''

رما شاہجہان پور نہ گیا تھا۔ نہ اتنی جرأت ہوئی کہ کوئی فرضی ہی نام بتا دے۔

دلیری سے بولا: ''تم تو گویا میرا حلیہ لکھ رہے ہو؟''

کانسٹیبل نے بھبکی دی۔ ''تمہارا حلیہ پہلے ہی لکھا ہوا ہے، نام جھوٹ بتایا، سکونت جھوٹ بتائی، محلّہ پوچھا تو بغلیں جھانکنے لگے۔ مہینوں سے تمہاری ہی تلاش

ہو رہی ہے۔ آج جا کر ملے ہو۔ چلو تھانے پر۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے رما کا ہاتھ پکڑ لیا۔ رما نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

''وارنٹ لاؤ تب میں چلوں گا۔ کیا مجھے کوئی دیہاتی سمجھ لیا ہے؟''

کانسٹیبل نے اپنے ساتھی سے کہا: ''پکڑ لو جی ان کا ہاتھ، وہیں تھانے پر وارنٹ دکھایا جائے گا۔''

شہروں میں وارداتیں مداری کے تماشے سے بھی دلچسپ ہوتی ہیں۔ سینکڑوں آدمی جمع ہو گئے۔ شامت کا مارا دیبی دین اسی وقت افیم لے کر لوٹ رہا تھا۔ یہ جماؤ دیکھ کر وہ بھی آ گیا۔ دیکھا کہ تین کانسٹیبل رمانا تھ کو گھسیٹے ہوئے لیے جا رہے ہیں۔

آگے بڑھ کر بولا: ''ہائیں ہائیں جمعدار یہ کیا کرتے ہو۔ پنڈت جی تو ہمارے مہمان ہیں۔ انہیں کہاں پکڑے لیے جاتے ہو؟''

کانسٹیبل دیبی دین کو پہچانتے تھے۔ ایک نے پوچھا: ''تمہارے مہمان ہیں یہ کب سے؟''

دیبی دین نے دل میں حساب لگا کر کہا: ''چار مہینے سے کچھ زیادہ ہی ہوئے ہوں گے۔ مجھے پراگ راج میں مل گئے تھے۔ رہنے والے بھی وہیں کے ہیں۔ میرے ساتھ ہی تو آئے تھے۔''

کانسٹیبل نے دل میں خوش ہو کر کہا ''ان کا نام کیا ہے؟''

دیبی دین نے سٹپٹا کر کہا: ''نام انہوں نے بتایا نہ ہوگا۔''

کانسٹیبلوں کا شبہ پختہ ہو گیا۔ ایک کانسٹیبل نے آنکھیں نکال کر کہا: ''معلوم ہوتا ہے تم بھی ملے ہوئے ہو۔ ان کا نام کیوں نہیں بتلاتے؟''

دیبی دین نے شبہ انگیز جسارت کے ساتھ کہا: ''مجھ سے رعب نہ جمانا جمعدار سمجھے! یہاں دھمکیوں میں نہیں آنے کے۔''

دوسرے کانسٹیبل نے گویا ثالث بن کر کہا:

''بوڑھے بابا، تم خواہ مخواہ بگڑ رہے ہو ان کا نام کیوں نہیں بتا دیتے؟''

دیبی دین نے خائف نظروں سے رما کی طرف دیکھ کر کہا: ''ہم لوگ تو رمانا تھ کہتے ہیں اصلی نام کچھ اور ہے یا یہی، ہم نہیں جانتے۔''

کانسٹیبل نے تماشائیوں کو مخاطب کر کے کہا: ''نام ہے رمانا تھ، بتاتے ہیں ہیرا لال ہے۔ گھر الہ آباد ہے بتاتے ہیں شاہجہان پور۔ جرم ثابت ہو گیا۔''

تماشائیوں میں کانا پھوسی ہونے لگی۔

''شبہ کی بات تو ہے؟''

''صاف ہے، نام اور پتا دونوں غلط بتائے۔''

ایک مارواڑی صاحب نے فرمایا: ''اچکو سو ہے۔''

ایک مولوی صاحب بولے: ''کوئی اشتہاری ملزم ہے۔''

خلقت کو اپنا ہم خیال دیکھ کر سپاہیوں کو اور بھی زور ہو گیا۔ رما کو بھی اب ان کے ساتھ چپ چاپ چلے جانے ہی میں اپنی خیریت نظر آئی۔ اس طرح سر جھکا لیا گویا اسے اس پر لاٹھی پڑتی ہے یا تلوار۔ اتنا ذلیل وہ کبھی نہ ہوا تھا۔ جیل کا عذاب بھی اتنا جاں شکن نہ ہوتا۔

تھوڑی دیر میں تھانہ آ گیا۔تماشائیوں کا ہجوم بہت کم ہو گیا تھا۔رما نے ایک بار پیچھے کی طرف شرم گیر توقع سے دیکھا۔ دیبی دین کا پتا نہ تھا۔ رما کے منہ سے ایک سانس نکل گئی۔

(34)

پولیس سٹیشن کے دفتر میں اس وقت بڑی میز کے سامنے چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ایک داروغہ تھے۔ گورے رنگ کے شوقین، جن کی بڑی بڑی آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک تھی۔ان کی بغل میں نائب داروغہ تھے۔ یہ سکھ تھے۔ بہت ہی ہنس مکھ، زندہ دلی کے پتلے۔ گیہواں رنگ، مضبوط اور متناسب اعضاء۔سر پر کیش تھے۔ہاتھوں میں کڑے لیکن سگار سے پرہیز نہ کرتے تھے۔میز کی دوسری طرف انسپکٹر اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بیٹھے تھے۔انسپکٹر ادھیڑ، سانولا، لمبا آدمی تھا۔کوڑی کی سی آنکھیں، پھولے رخسار اور ٹھگنا قد۔ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ لانبا چھریرہ جوان تھا۔ بہت ہی کم سخن اور ذی فہم۔

ڈپٹی نے سگار کا ایک کش لے کر کہا: ''باہری گواہوں سے کام نہیں چل سکے گا۔ان میں سے کسی کو اپرور بننا ہو گا اور کوئی آلٹرنیٹو نہیں ہے۔''

انسپکٹر نے داروغہ کی طرف دیکھ کر کہا: ''ہم لوگوں نے کوئی بات اٹھا تو نہیں رکھی۔ازروئے حلف کہتا ہوں، ہر قسم کا لالچ دے کر ہار گئے۔سبھوں نے ایسا گٹ کر رکھا ہے کہ کوئی ٹوٹتا ہی نہیں۔ہم نے باہر کے گواہوں کو بھی آزمایا، مگر وہ سب

کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔''

ڈپٹی: ''اس مارواڑی کو پھر آزمانا ہوگا۔ اس کو بلا کر خوب دھمکائیے۔ شاید اس کا کچھ دباؤ پڑے۔''

انسپکٹر: ''ازروئے حلف کہتا ہوں آج صبح ہی سے ہم لوگ یہی تدبیر کر رہے ہیں۔ بیچارہ باپ لڑکے کے پیروں میں گر پڑا، لیکن کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔''

کچھ دیر تک چاروں طرف خاموش بیٹھے رہے۔ آخر ڈپٹی نے مایوسانہ انداز سے کہا: ''مقدمہ نہیں چلنے سکتا۔ مفت کا بدنامی ہوا۔''

انسپکٹر ایک ہفتہ کی مہلت اور لیجیے۔ شاید کوئی گواہ نکل آئے۔

یہ فیصلہ کر کے دونوں آدمی وہاں سے روانہ ہوئے۔ نائب داروغہ بھی ان کے ساتھ ہی چلے گئے۔ داروغہ جی نے حقہ منگوایا کہ دفعتاً ایک مسلمان سپاہی نے آکر کہا:

''حضور لائیے۔ کچھ انعام دلوائیے۔ ایک ملزم کو شبہ پر گرفتار کیا ہے۔ الہ آباد کا رہنے والا ہے۔ رماناتھ نام ہے۔ پہلے نام اور سکونت غلط بتلائی تھی۔ دیبی دین کھٹک جو نکڑ پر رہتا نہیں ہے، اسی کے یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ ذرا ڈانٹ بتائیے گا تو سب کچھ اگل دے گا۔''

داروغہ: ''دیبی دین وہی ہے نا جن کے دونوں لڑکے ....؟''

سپاہی: ''جی ہاں وہی ہے، وہی ہے۔''

اتنے میں رماناتھ بھی داروغہ کے سامنے حاضر کیا گیا۔ داروغہ نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ گویا دل میں اس کا حلیہ ملا رہے ہوں۔ تب تیز نگاہوں سے

دیکھ کر بولا:

''اچھا یہ الہ آباد کا رماناتھ ہے۔ خوب ملے بھائی۔ خوب ملے۔ چھ مہینہ سے پریشان کر رہے ہو۔ کیسا صاف حلیہ ہے کہ اندھا بھی پہچان لے۔ یہاں کب سے آئے؟''

کانسٹیبل نے رما کو صلاح دی: ''سارا حال سچ سچ بتا دو تو تمہارے ساتھ کوئی سختی نہ کی جائے گی؟''

رما نے چہرے کو بشاش بنا کر کہا: ''جناب! اب تو آپ کے ہاتھ میں ہوں رعایت کیجیے یا سختی کیجیے۔ الہ آباد کی میونسپلٹی میں ملازم تھا۔ حماقت کہیے یا بدنصیبی، چنگی کے چار سو روپے مجھ سے خرچ ہو گئے۔ میں وقت پر روپے جمع نہ کر سکا، شرم کے مارے گھر والوں سے بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ نہیں تو اتنے روپے کا انتظام ہو جانا کچھ مشکل نہ تھا۔ جب کچھ بس نہ چلا تو وہاں سے بھاگ کر یہاں چلا آیا۔ اس میں ایک حرف بھی غلط نہیں ہے۔''

داروغہ نے چہرے کو متین بنا کر کہا: ''معاملہ کچھ سنگین ہے۔ کیا جوا کھیلتے تھے؟ یا بیوی کے زیور بنوائے تھے؟''

رما ابھی جواب نہ دینے پایا تھا کہ دیبی دین آ کر کھڑا ہو گیا۔

داروغہ نے تند لہجہ میں پوچھا: ''کیا کام ہے یہاں؟''

دیبی: ''حضور کو سلام کرنے چلا آیا۔ ان بیچارے پر رحم کی نگاہ رکھیے گا۔ بیچارے بڑے سیدھے آدمی ہیں۔''

داروغہ: ''بچا سرکاری ملزم کو گھر میں چھپاتے ہو، اس پر سفارش کرنے آئے

ہو؟''

دینی: ''میں کیا سفارش کروں گا، حضور کوڑی کا آدمی ہوں۔''

داروغہ: ''جانتا ہے ان پر وارنٹ ہے۔ سرکاری روپے غبن کر گئے ہیں۔''

دینی: ''حضور بھول چوک آدمی ہی سے تو ہوتی ہے۔ جوانی کی عمر ہے، خرچ ہو گئے ہوں گے۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے پانچ گنیاں نکال کر میز پر رکھ دیں۔

داروغہ نے تڑپ کر کہا: ''یہ کیا ہے؟''

دینی: ''کچھ نہیں، حضور کو پان کھانے کو۔''

داروغہ: ''رشوت دینا چاہتا ہے، کہو تو بچا اسی الزام میں بھیج دوں؟''

دینی: ''بھیج دیجیے، گھر والی نکڑی کفن کی پھکر سے چھوٹ جائے گی۔ وہیں بیٹھا دعائیں دیتا رہوں گا۔''

داروغہ: ''اگر انہیں چھڑانا ہے تو پچاس گنیاں لا کر سامنے رکھو۔ جانتے ہو ان کی گرفتاری پر پانچ سو روپے کا انعام ہے؟''

دینی: ''آپ کے لیے اتنا انعام کیا ہے۔ یہ بیچارے پردیسی آدمی ہیں۔ جب تک جئیں گے آپ کو یاد کریں گے۔''

داروغہ: ''بک بک مت کرو، یہاں دھرم کمانے نہیں آئے ہیں۔''

دینی: ''بہت تنگ ہوں حضور، دوری دکان تو نام کی ہے۔''

کانسٹیبل: ''بڑھیا سے مانگ جا کے۔''

دینی: ''کمانے والا میں ہی ہوں۔ لڑکوں کا حال جانتے ہی ہو۔ پیٹ کاٹ کر

کچھ روپے جمع کر رکھے تھے سو ابھی ساتویں دھام کیے چلا آتا ہوں۔''

داروغہ: ''تو اپنی گنیاں اٹھا لے۔ اسے باہر نکال دو جی۔''

دینی: ''آپ کا حکم ہے تو لیجیے جاتا ہوں، دھکے کیوں دلوایئے گا۔''

داروغہ: ''(کانسٹیبل) انہیں حراست میں رکھو۔ منشی سے کہو ان کا بیان لکھ لیں۔''

رمانا تھ نے دینی دین کے چہرے پر اتنی حسرت ناک معذوری کبھی نہ دیکھی تھی۔ جیسے کوئی چڑیا اپنے گھونسلے میں بلی کو گھستے دیکھ کر بے قرار ہو گئی ہو۔ وہ ایک تھانہ کے دروازہ پر کھڑا رہا۔ پھر پیچھے پھرا اور سپاہی سے کچھ کہہ کر لپکا ہوا سڑک تک چلا گیا، مگر ایک لمحہ ہی میں پھر لوٹا اور داروغہ سے بولا:

''مجھ رو دو گھنٹہ کی مہلت نہ دیجیے گا؟''

رما ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر رو پڑا، بولا: ''دادا اب تم حیران نہ ہو۔ میری تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہونے دو۔ میرے باپ بھی ہوتے تو اس سے زیادہ اور کیا کرتے۔ میں مرتے دم تک تمہارا احسان مند رہوں گا۔''

دینی دین نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا: ''کیسی بات کرتے ہو بھیا۔ جب روپوں پر آ گئی تو دینی دین پیچھے ہٹنے والا آدمی نہیں ہے۔ اتنے روپے تو ایک دن کے جوئے میں ہار گیا ہوں۔ ابھی گھر بیچ دوں تو دس ہزار کی مالیت ہے۔ کیا سر پر لاد کر لے جاؤں گا۔ (داروغہ سے) ابھی نہیں حراست میں بھیجئے۔ میں روپے کی فکر کر کے تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

دینی دین چلا گیا تو داروغہ نے رازدار لہجہ میں کہا: ''ہے تو خرانٹ مگر بڑا

نیک۔تم نے اسے کون سی جڑی سنگھا دی؟''

رما: ''غریبوں پر سبھی کو رحم آتا ہے۔''

داروغہ نے مسکرا کر کہا: ''پولیس کو چھوڑ کر اتنا اور کہیے۔ مجھے تو یقین نہیں پچاس گنیاں لائے۔''

رما: ''اگر لائے بھی تو میں اتنا بڑا تاوان نہیں دلانا چاہتا۔ آپ مجھے شوق سے حراست میں لے لیں۔''

داروغہ: ''مجھے پانچ سو کی جگہ ساڑھے چھ سو مل رہے ہیں تو کیوں چھوڑیں۔ تمہاری گرفتاری کا انعام میرے کسی دوسرے بھائی کو مل جائے تو کیا برائی ہے؟''

یکا یک داروغہ کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔ میز کی دراز سے ایک مسل نکالی۔ اس کے ورق ادھر ادھر الٹے۔ تب شفقت آمیز لہجہ میں بولے:

''اگر میں کوئی ایسی ترکیب بتلا دوں کہ دیبی دین کے روپے بھی بچ جائیں گے اور تمہارے اوپر کوئی حرف بھی نہ آئے تو کیسا؟''

رما کو یقین نہ آیا: ''کیا ایسی بھی کوئی ترکیب ہے؟''

داروغہ: ''اجی سائیں کے سو کھیل ہیں۔ آپ کو صرف ایک مقدمہ میں شہادت دینی پڑے گی۔''

رما: ''جھوٹی شہادت ہوگی؟''

داروغہ: ''نہیں بالکل سچی۔ بس یہی سمجھ لو کہ آدمی بن جاؤ گے۔ میونسپلٹی کے پنجہ سے تو چھوٹ ہی جاؤ گے۔ شاید سرکار پرورش بھی کرے۔ بولو اگر چالان ہو گیا تو پانچ سال سے کم سزا نہ ہوگی۔ مان لو اس وقت دیبی دین تمہیں بچا بھی لے تو

بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی، مگر میں مجبور نہیں کرتا۔ تم اپنا نفع نقصان خود سوچ سکتے ہو۔''

داروغہ نے ڈکیتی کی داستان کہہ سنائی۔ رما ایسے کئی مقدمے اخباروں میں پڑھ چکا تھا۔ بدگمان ہو کر بولا:

''تو مجھے مخبر بننا پڑے گا اور یہ کہنا پڑے گا کہ میں ان ڈکیتیوں میں شریک تھا۔ یہ تو جھوٹی شہادت ہے۔''

داروغہ: ''معاملہ بالکل سچا ہے۔ کسی بے گناہ کی جان خطرے میں نہ آئے گی۔ وہی لوگ سزا پائیں گے جو سزا کے مستحق ہیں۔ تب جھوٹ کہاں رہا۔ ڈاکوؤں کے خوف سے یہاں کے لوگ شہادت دینے سے گریز کرتے ہیں۔ بس اور کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ سوچ لیجیے۔ شام تک جواب دیجیے گا۔ یہ میں مانتا ہوں کہ آپ کو کچھ جھوٹ بولنا پڑے گا، لیکن نتائج کے اعتقاد حقیقت ہیں۔''

رما کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ اگر ایک بار جھوٹ بول کر وہ اپنی پچھلی حماقتوں کی تلافی کر سکے تو پوچھنا ہی کیا۔ اس میں بہت آگے پیچھے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ پولیس اس وقت غرض مند ہے اور وہ میری کوئی واجب شرط نامنظور نہ کرے گی۔ اس انداز سے بولا:

''گویا اس کا دل حق و باطل کے مخمصہ میں پڑا ہوا ہے۔ مجھے یہی خوف ہے کہ کہیں میری شہادت سے بے گناہ نہ پھنس جائیں۔''

داروغہ: ''اس کا میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں۔''

رما: ''اور اگر میونسپلٹی میری گردن ماپے تو میں کسے پکاروں گا؟''

داروغہ: ''مجال ہے میونسپلٹی چوں کر سکے۔ فوجداری کے مقدمہ میں مدعی تو سرکار ہوگی۔ سرکار کی جانب سے آپ کو تحریری معافی نامہ دے دیا جائے گا۔ بس اتنا سمجھ لیجیے کہ اگر آپ کی شہادت اچھی ہوئی اور فریق ثانی کے حربوں کے جال سے آپ نکل گئے تو آپ پارس ہو جائیں گے۔''

داروغہ نے اسی وقت موٹر منگوائی اور رما کو ساتھ لے کر ڈپٹی صاحب سے تخلیہ میں خوب ڈینٹ اڑائی۔ اس آدمی کی صورت دیکھتے ہی بھانپ گیا کہ مفرور ہے۔ فوراً گرفتار کیا۔ تجربہ کاروں کی نگاہ کہیں چوک سکتی ہے۔ حضور مجرم کی آنکھیں پہچانتا ہوں۔ الہ آباد میونسپلٹی کے روپے غبن کر کے بھاگا ہے۔ اس معاملہ میں شہادت دینے پر آمادہ ہے۔ آدمی پڑھا لکھا، صورت کا شریف اور ذہین ہے۔

ڈپٹی نے مشتبہ انداز سے کہا: ''ہاں آدمی ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔''

داروغہ: ''مگر معافی نامہ لیے بغیر اسے اعتبار نہ آئے گا۔ کہیں اسے یہ شبہ ہوا کہ ہم اگر اس کے ساتھ کوئی چال چل رہے ہیں تو صاف نکل جائے گا۔''

ڈپٹی: ''یہ تو ہوگا ہی، گورنمنٹ سے اس بارے میں بات چیت کرنا ہوگی۔ آپ کال ملا کر الہ آباد سے پوچھئے کہ اس آدمی پر کیا مقدمہ ہے۔''

داروغہ نے ٹیلی فون ڈائریکٹری دیکھی، نمبر ملایا اور بات چیت شروع ہوئی۔

ڈپٹی: ''کیا بولا؟''

داروغہ: ''کہتا ہے یہاں اس نام کے کسی آدمی پر مقدمہ نہیں ہے۔''

ڈپٹی: ''یہ کیا ابت ہے بھائی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس نے نام تو نہیں بدل دیا۔''

داروغہ: ''یہ تو بڑا تعجب کا بات ہے۔ آدمی بولتا ہے روپیہ لے کر بھاگا، میونسپلٹی بولتا ہے کوئی روپیہ غبن نہیں کیا۔ یہ آدمی پاگل تو نہیں ہے؟''

داروغہ: ''کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر کہہ دیں تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں تو پھر اس کی گرد بھی نہیں ملتی۔''

ڈپٹی: ''اچھا میونسپلٹی کے دفتر سے پوچھیے؟''

داروغہ نے پھر نمبر ملایا۔ سوال و جواب ہونے لگے۔

داروغہ: ''آپ کے یہاں رمانا تھ کوئی کلرک تھا؟''

جواب: ''جی ہاں تھا۔''

داروغہ: ''وہ کچھ روپے غبن کر کے بھاگا ہے؟''

جواب: ''نہیں، وہ گھر سے نکل گیا ہے، لیکن غبن نہیں کیا۔ کیا وہ آپ کے یہاں ہے؟''

داروغہ: ''جی ہاں، ہم نے اسے گرفتار کیا ہے۔ وہ خود کہتا ہے، روپے اس نے غبن کیے۔ بات کیا ہے؟''

جواب: ''آپ تو لال بجھکڑ ہیں۔ ذرا دماغ لڑائیے۔''

داروغہ: ''یہاں تو عقل کام نہیں کرتی۔''

جواب: ''نہیں کیا۔ کہیں بھی کام نہیں کرتی۔ صرف شہادتیں گھڑنا جانتی ہے۔ سنیے رمانا تھ نے میزان لگانے میں غلطی کی ہے۔ ڈر کر بھاگا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ تحویل میں مطلق کمی نہ تھی۔ آئی سمجھ میں بات۔''

ڈپٹی: ''اب کیا کرنا ہوگا کھان صاحب! چڑیا ہاتھ سے گیا۔''

داروغہ: ''نکل کیسے گیا حضور، رمانا تھ سے یہ بات کہی ہی کیوں جائے۔ اسے کسی آدمی سے ملنے ہی کیوں دیا جائے، جو اسے یہ خبر دے سکے۔ گھر والے ضرور اس سے ملنے آئیں گے۔ کسی سے ملنے نہ دیا جائے۔ تحریر میں کوئی بات نہ لائی جائے۔ صرف زبانی اطمینان دلایا جائے۔''

ادھر تو یہ مشورے ہو رہے تھے۔ ادھر دیبی دین ایک گھنٹہ میں لوٹ کر تھانے آیا۔ کانسٹیبل نے کہا کہ داروغہ جی تو صاحب کے پاس گئے۔

دیبی دین نے گھبرا کر کہا: ''تو بھیا کو حراست میں ڈال دیا؟''

کانسٹیبل: ''نہیں انہیں بھی ساتھ لے گئے۔''

دیبی دین نے سر پیٹ کر کہا: ''پولیس والوں کی بات کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کہہ گیا کہ ایک گھنٹہ میں روپے لے کر آتا ہوں، مگر اتنا بھی صبر نہ ہوا۔ سرکار سے پانچ سو ہی ملیں گے۔ تو چھ سو دینے کو تیار ہوں۔ اب اوپر ہی اوپر انہیں پراگ راج بھیج دیں گے۔ میں دیکھ بھی نہ سکوں گا۔ بڑھیا رو رو کر مر جائے گی۔'' یہ کہتا ہوا دیبی دین وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔

کانسٹیبل نے پوچھا: ''تو یہاں کب تک بیٹھے رہو گے؟''

دیبی دین نے بے خوفی سے پوچھا: ''اب تو داروغہ جی سے دو دو باتیں ہی کر کے جاؤں گا۔ چاہے جیل ہی جانا پڑے، مگر پھٹکاروں گا ضرور۔ بری طرح پھٹکاروں گا۔ ان کے بھی تو بال بچے ہیں۔ کیا بھگوان سے بالکل نہیں ڈرتے۔ تم نے بھیا کو جاتی بار دیکھا تھا۔ بہت رنجیدہ تھے۔''

کانسٹیبل: ''رنجیدہ تو نہیں تھے۔ خاصی طرح ہنس رہے تھے۔ خاصی طرح

دونوں صاحب موٹر میں بیٹھ کر گئے ہیں۔‘‘

دینی دین کو یہاں بیٹھے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا کہ یکا یک جگو آ کھڑی ہوئی۔ دینی دین کو دروازے پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر بولی: ’’تم یہاں بیٹھے کیا کرتے ہو، بھیا کہاں ہیں؟‘‘

دینی دین نے شکستہ دل ہو کر کہا: ’’لے گئے، صاحب کے پاس۔ نہ جانے بھینٹ ہوئی ہے کہ اوپر ہی اوپر پراگ راج بھیج دیئے جاتے ہیں۔‘‘

جگو: ’’داروغہ جی تو بڑے وہ ہیں۔ تو کیا اتنا لیں گے۔ اتنا لیں گے۔ کہاں لے کر چل دیئے؟‘‘

دینی: ’’اسی لیے تو بیٹھا ہوں۔‘‘

جگو: ’’ہاں پھٹکارنا ضرور، جو اپنی بات کا نہیں وہ اپنے باپ کا کیا ہوگا۔ میں کھری کہوں گی۔ میرا کیا کرلیں گے۔‘‘

دینی: ’’دکان پر کون ہے؟‘‘

جگو: ’’بند کر آئی ہوں۔ ابھی بیچارے نے کچھ کھایا بھی نہیں۔ سویرے سے ویسے ہی ہے۔ چولہے میں جائے وہ تماشا۔ اسی کے لیے ٹکٹ لینے تو جاتے تھے۔ نہ گھر سے نکلتے تو کاہے کو یہ بلا سر پڑتی۔‘‘

دینی: ’’جو ادھر سے پراگ بھیج دیا تو؟‘‘

جگو: ’’تو چھٹی تو آوے گی۔ چل کر دیکھ آئیں گے۔‘‘

دینی: ’’(آنکھوں میں آنسو بھر کر) سزا ہو جائے گی۔‘‘

جگو: ’’روپے جمع کر دیں گے تو کاہے کو سجا ہو گی۔ سرکار اپنے روپے ہی تو لے

گی۔''

دیبی: ''ارے پگلی ایسا نہیں ہوتا، چور مال لوٹا دے تو وہ چھوڑ تھوڑے ہی دیا جائے گا۔''

جگو نے صورت حال کا احساس کر کے کہا: ''دروگا جی.............!''

داروغہ جی کی موٹر سامنے آ پہنچی۔ انسپکٹر صاحب بھی تھے۔ رما ان دونوں کو دیکھتے ہی موٹر سے اتر کر آیا اور خوش ہو کر بولا۔ ''تم یہاں دیر سے بیٹھے ہو کیا۔ آؤ کمرے میں چلو۔ تم کب آئیں اماں!''

داروغہ نے مذاقاً پوچھا: ''کہو چودھری لائے روپے؟''

دیبی: ''جب کہہ گیا کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں تو آپ کو میری راہ دیکھنی چاہیے تھی۔ چلیے اب روپے لیجیے۔''

داروغہ: ''کھود کر نکالے ہوں گے؟''

دیبی: ''آپ کے اقبال سے ہزار پانچ سو ابھی اوپر ہی نکل سکتے ہیں۔ چلو بھیا! بڑھیا کب سے کھڑی ہے۔ میں روپے چکا کر آتا ہوں۔''

داروغہ: ''تو بھائی اپنے روپے لے جا کر کسی ہانڈی میں رکھ دو۔ افسروں نے انہیں چھوڑنے سے انکار کیا۔ میرے بس کی بات نہیں۔''

انسپکٹر صاحب تو پہلے ہی دفتروں میں چلے گئے تھے۔ یہ تینوں آدمی باتیں کر تے اس کے بغل والے کمرے میں گئے۔

دیبی: ''دروگا جی! مردوں کی بات ایک ہوتی ہے۔ میں تو یہی جانتا ہوں۔ میں روپے آپ کے حکم سے لایا ہوں۔ آپ کو اپنا قول پورا کرنا پڑے گا۔ کہہ کر مکر جانا

نیچوں کا کام ہے۔''

اتنے گستاخانہ الفاظ سن کر داروغہ جی کو بھنا جانا چاہیے تھا، لیکن انہوں نے ذرہ بھی برا نہ مانا۔ ہنستے ہوئے بولے۔ ''بھائی اب چاہے کمینہ کہو۔ چاہے دغا باز کہو، مگر اب انہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ ایسے شکار اور نہیں ملا کرتے۔ قول کے پیچھے اتنی ترقی نہیں چھوڑ سکتا۔''

داروغہ کے ہنسنے پر دینی اور بھی تیز ہوا۔ ''تو آپ نے کہا کس منہ سے تھا۔''

داروغہ: ''کہا تو اسی منہ سے تھا، لیکن منہ ہمیشہ یکساں تو نہیں رہتا۔ اسی منہ سے گالی دیتا ہوں۔ اسی منہ سے اس کی تعریف کرتا ہوں۔''

دینی (تنک کر) ''یہ مونچھیں منڈوا ڈالیے۔''

داروغہ: ''مجھے بڑی خوشی سے منظور ہے۔ نیت تو میری پہلے ہی تھی، لیکن شرم کے مارے نہ منڈواتا تھا۔ اب تم نے دل مضبوط کر دیا۔''

دینی: ''ہنسیے مت دروگا جی۔ آپ ہنستے ہیں اور میرا خون جلا جاتا ہے۔ چاہے جیل ہی کیوں نہ ہو جائے، لیکن میں کپتان صاحب سے ضرور کہہ دوں گا۔ ہوں تو ٹکے کا آدمی لیکن آپ کے اقبال سے بڑے بڑے افسروں تک پہنچ ہے۔''

داروغہ: ''ارے یار تو کیا سچ مچ کپتان صاحب سے میری شکایت کر دو گے؟''

دینی دین نے سمجھا کہ دھمکی کارگر ہوئی۔ اکڑ کر بولا۔ ''آپ جب کسی کی نہیں سنتے تو بات کہہ کر مکر جاتے ہیں۔ دوسرے بھی اپنی سی کریں گے ہی۔ میم صاحب تو روز ہی دکان پر آتی ہیں۔''

داروغہ: ''سن دینی۔ اگر تم نے صاحب یا میم صاحب سے میری شکایت کی تو

قسم کھا کر کہتا ہوں گھر کھدوا کر پھینک دوں۔"

دیبی: "جس روز میرا گھر کھدے گا۔ اس دن یہ پگڑی اور چپڑوں بھی نہ رہے گی حجور۔"

داروغہ: "اچھا تو مارو ہاتھ پر ہاتھ۔ ہماری تو دو دو چوٹیں ہو جائیں۔"

دیبی۔ "پچھتاؤ گے سرکار۔ کہے دیتا ہوں، پچھتاؤ گے۔"

رما اب ضبط نہ کر سکا۔ اب تک وہ دیبی دین کی بدمزاجی کا تماشا دیکھنے کے لیے بھیگی بلی بنا کھڑا تھا۔ قہقہہ مار کر بولا۔ "داروغہ جی تمہیں چڑا رہے ہیں۔ ہم لوگوں میں ایسی صلاح ہوگئی ہے کہ میں بغیر کچھ لیے دیئے ہی جاؤں گا۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی جگہ بھی مل جائے گی۔ صاحب نے پکا وعدہ کیا ہے۔ مجھے اب یہیں رہنا ہوگا۔"

دیبی دین اس کا کچھ مطلب نہ سمجھ سکا۔ بولا: "کیسی بات بھیا۔ کیا کہتے ہو۔ کیا پولیس والوں کے چکمے میں آ گئے۔ اس میں کوئی نہ کوئی چال ضرور چھپی ہوگی۔"

رما نے اطمینان کے ساتھ کہا: "اور کوئی بات نہیں، مجھے ایک مقدمہ میں شہادت دینی پڑے گی۔"

دیبی دین نے بدگمانی سے سر ہلا کر کہا: "جھوٹا مقدمہ ہوگا؟"

رما: "نہیں دادا، بالکل سچا معاملہ ہے۔ میں نے پہلے ہی پوچھ لیا ہے۔"

دیبی دین کو اطمینان نہ ہوا۔ بولا: "میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا بھیا۔ ذرا سوچ سمجھ کر بات کرنا۔ اگر میرے روپوؤں سے ڈرتے ہو تو یہی سمجھ لو کہ اگر دیبی دین نے روپوں کی پروا کی ہوتی تو آج لکھ پتی ہوتا۔ انہی ہاتھوں سے سو سو

روپے کمائے ہیں اور سب اڑائے ہیں۔ کس مقدمہ میں شہادت دینی ہے، کچھ معلوم ہوا؟''

داروغہ جی نے رما کو جواب دینے کا موقع نہ دے کر کہا۔ ''وہی ڈکیتی والا معاملہ ہے۔ جس میں کئی غریب آدمیوں کی جان گئی تھی۔ ان ڈاکوؤں نے صوبہ بھر میں ہنگامہ مچا رکھا تھا۔ ان کے خوف کے مارے کوئی آدمی گواہی دینے پر راضی نہیں ہوتا۔''

دیبی دین نے بے رخی کے ساتھ کہا۔ ''اچھا تو یہ مخبر بن گئے۔ یہ بات ہے۔ اس میں تو جو پولیس سکھائے گی، وہی تمہیں کہنا پڑے گا۔ میں چھوٹی سمجھ کا آدمی ہوں۔ ان باتوں کا مطلب کیا جانوں، لیکن مجھ سے کوئی مخبر بننے کو کہتا تو نہ بنتا۔ چاہے کوئی لاکھ روپے دیتا۔ باہر کے آدمی کو کیا معلوم کہ کون کسور (قصور) وار اور کون بے کسور ہے۔ دو چار ملجموں کے ساتھ دو چار بے کسور تو جرور ہی ہوں گے۔''

داروغہ: ''ہرگز نہیں۔ جتنے آدمی گرفتار کیے گئے ہیں، سب پکے ڈاکو ہیں۔''

دیبی: ''یہ تو آپ کہتے ہیں، نام ہمیں کیا معلوم۔''

داروغہ: ''ہم لوگ بے گناہوں کو پھنسائیں گے ہی کیوں، یہ تو سوچو۔''

دیبی: ''یہ سب بھگتے بیٹھا ہوں دروگا جی! اس سے تو یہی اچھا ہے کہ آپ ان کا چالان کر دیں۔ سال دو سال کی سزا ہی ہوگی۔''

رما نے بزدلانہ انداز سے کہا: ''میں نے خوب سوچ لیا ہے دادا۔ پوری مسل دیکھ لی ہے۔ اس میں کوئی بے گناہ نہیں ہے۔''

دیبی دین نے دل شکستہ ہو کر کہا: ''ہوگا بھائی۔ جان تو پیاری ہوتی ہے۔'' یہ کہہ

کر وہ لوٹ پڑا۔ اپنے جذبات کو وہ اس سے زیادہ واضح طور پر ظاہر نہ کر سکتا تھا۔

یکا یک اسے ایک بات یاد آ گئی۔ مڑ کر بولا: ''تمہیں کچھ روپے دیتا ہوں بھیا۔''

رما نے خفت کے ساتھ کہا: ''کیا ضرورت ہے؟''

داروغہ: ''آج سے انہیں یہیں رہنا پڑے گا۔''

دینی دین طنز کے ساتھ بولا: ''ہاں جو راستا جانتا ہوں۔ ان کی دعوت ہو گی۔ بنگلہ رہنے کو ملے گا۔ نوکر ملیں گے۔ موٹر ملے گی۔ یہ سب جانتا ہوں، کوئی باہر کا آدمی ان سے ملنے نہ پائے گا۔ نہ یہ کسی سے ملنے پائیں گے۔ یہ سب دیکھ چکا ہوں۔''

یہ کہتا ہوا دینی دین تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ گویا یہاں اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ داروغہ نے اسے پکارا، مگر اس نے پھر کر نہ دیکھا۔ اس کے چہرے پہ مایوسی چھائی ہوئی تھی۔

جگو نے پوچھا: ''بھیا نہیں آ رہے ہیں؟''

دینی دین نے سڑک کی طرف تاکتے ہوئے کہا: ''بھیا اب نہیں آئیں گے۔ جب اپنے ہی اپنے نہ ہوئے تو بھیا تو بیگانے ہی ہیں۔''

دونوں اس طرح اداس گھر کی طرف چلے۔ گویا کسی عزیز کی لاش کو جلا کر لوٹ رہے ہوں۔

رونے میں کتنا سکون، کتنی تقویت، کتنا روحانی سرور ہوتا ہے۔ جو تنہائی میں بیٹھ کر کسی کی یاد میں، کسی کے فراق میں یا کسی درد سے بے تاب ہو کر سسک سسک کر نہیں رویا، وہ زندگی کی ایک نعمت سے محروم ہے۔ جس پر صد ہا مسرتیں نثار ہیں، اس میٹھے درد کا لطف انہی سے پوچھو۔ جنہیں یہ مبارک مواقع ملتے ہیں، رونے کے بعد ایک نئی فرحت، ایک تازہ شگفتگی، ایک روح افزا تسکین کا احساس ہوتا ہے۔ جالپا کے پاس اخبار کے دفتر سے خط آیا تو اسے پڑھ کر وہ رو پڑی۔ ایک ہاتھ میں خط لیے اور دوسرے ہاتھ سے چوکھٹ پکڑے وہ خوب روئی۔ کیا سوچ کر روئی۔ یہ کون کہہ سکتا ہے۔ شاید اس غیر متوقع کامیابی نے مسرت کی اس گہرائی تک پہنچا دیا، جہاں پانی ہے، یا اس بلندی تک جہاں برف ہے۔ آج چھ مہینے کے بعد اسے مژدۂ جانفزا ملا۔ اتنے دنوں وہ دغا شعار امید اور بے رحم مایوسی کا کھلونا بنی رہی۔ آہ کتنی بار اس کے دل میں شورش ہوئی کہ زندگی کا خاتمہ کر دے۔ اس تاریکی میں اسے امید کی روشنی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے سوچا وہ کتنے بے درد ہیں، چھ مہینے سے وہاں بیٹھے ہیں۔ ایک خط بھی نہ لکھا۔ آخر یہی تو سوچ لیا ہو گا کہ بہت رو رو کر مر جائے گی۔ انہوں نے میری پرواہی کب کی۔ دس بیس روپے تو آدمی یار دوستوں پر خرچ کر دیتا ہے۔ یہ محبت نہیں ہے۔ محبت دل کی چیز ہے۔ روپے کی نہیں۔

جب تک رما کا کچھ پتا نہ چلتا تھا، جالپا سارا الزام اپنے سر رکھتی تھی، لیکن آج اس کا سراغ پاتے ہی یکا یک اس کا دل اس کی طرف سے سخت ہو گیا۔ طرح طرح کے شکوے پیدا ہونے لگے۔ وہاں کیا سمجھ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسی لیے وہ آزاد

ہیں۔خود مختار ہیں۔کسی کا دیا نہیں کھاتے۔اس طرح اگر میں بغیر کہے سنے کہیں چلی جاؤں تو قیامت آ جائے۔شاید تلوار لے کر میری گردن پر سوار ہو جائے یا زندگی بھر منہ نہ دیکھے۔

اتنے میں رمیش بابو نے دروازہ پر پکارا۔گوپی، گوپی۔ذرا ادھر آنا۔منشی جی نے اپنے کمرے میں پڑے پڑے کراہ کر کہا۔''کون ہے بھائی، کمرہ میں آ جاؤ۔ ارے آپ ہیں رمیش بابو! بابو جی میں تو مر کر جیا۔بس یہی سمجھ لو کہ نئی زندگی پائی۔ کوئی امید نہ تھی۔کوئی آگے ہے نہ پیچھے۔دو لونڈے آوارہ ہیں۔مروں یا جیوں۔ ان سے مطلب نہیں۔ان کی ماں میری صورت سے ڈرتی ہے۔بیچاری بہو نے میری جان بچا دی نہ ہوتی تو اب تک چل بسا ہوتا۔''

رمیش بابو نے مصنوعی ہمدردی دکھاتے ہوئے کہا۔''آپ اتنے بیمار ہو گئے اور مجھے خبر تک نہ دی۔میرے یہاں رہتے آپ کو اتنی تکلیف ہوئی۔بہو نے ایک پرزہ نہ لکھ دیا۔رخصت لینی پڑی ہوگی۔''

منشی جی: ''چھٹی کے لیے درخواست تو بھیج دی تھی، مگر صاحب نے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ نہیں بھیجا۔سولہ روپے کس کے گھر سے لاتا۔آپ تو جانتے ہی ہیں بغیر فیس لیے ڈاکٹر لوگ بات نہیں کرتے۔یہ تو ڈاکٹروں کا حال ہے۔دیکھ رہے ہیں۔آدمی مر رہا ہے مگر بغیر فیس لیے قلم نہ اٹھائیں گے۔''

رمیش بابو نے فکرمندانہ لہجے میں کہا: ''یہ تو آپ نے بری خبر سنائی۔اگر رخصت نامنظور ہوئی تو کیا کیجیے گا؟''

منشی جی نے ماتھا ٹھونک کر کہا: ''ہو گا کیا۔گھر بیٹھ رہوں گا۔صاحب پوچھیں

گے تو صاف کہہ دوں گا، سرجن نے چھٹی نہیں دی۔ آخر کار سرکار نے انہیں کس لیے تعینات کیا ہے۔ محض کرسی کی زینت بڑھانے کے لیے۔ مجھے برخاست ہو جانا منظور ہے مگر سرٹیفکیٹ نہ دوں گا۔ دیکھیے لونڈے غائب ہیں۔ آپ کے لیے پان کیسے منگوائیں؟''

رمیش نے مسکرا کر کہا: ''میرے لیے آپ تردد نہ کریں۔ میں آج پان کھانے کا نہیں، پیٹ بھر مٹھائی کھانے آیا ہوں۔ (جالپا کو پکار کر) بہو جی! تمہارے لیے خوشخبری لایا ہوں۔ مٹھائی منگواؤ۔''

جالپا نے پان کی طشتری ان کے سامنے رکھ دی اور بولی: ''پہلے وہ خبر تو سنائیے۔ شاید آپ جس خبر کو نئی سمجھ رہے ہیں، وہ پرانی ہو گئی ہو؟''

رمیش: ''کہیں ہو نہ رمانا تھ کا پتا چل گیا۔ کلکتہ میں ہیں۔''

جالپا: ''مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے۔''

منشی جی جھپٹ کر اٹھ بیٹھے۔ ان کا بخار گویا بھاگ کر اشتیاق کی آڑ میں چھپا۔ رمیش کا ہاتھ پکڑ کر بولے: ''معلوم ہو گیا کلکتہ میں ہی ہیں، کوئی خط آیا تھا؟''

رمیش: ''خط نہیں تھا۔ ایک پولیس انکوائری تھی۔ میں نے کہہ دیا، ان پر کسی طرح کا الزام نہیں ہے۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ بہو جی؟''

جالپا نے کل داستان کہہ سنائی۔ اخبار کا خط بھی دکھایا۔ خط کے ساتھ روپوں کی ایک رسید تھی جس پر رما کے دستخط تھے۔

رمیش: ''دستخط تو رما کا ہے۔ بالکل صاف۔ کسی طرح کا شبہ نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارا قائل ہو گیا بہو جی۔ واہ کیا حکمت نکالی ہے۔ ہم سب کے کان کٹ گئے۔

کسی کو نہ سوجھی۔ اب جو سوچتا ہوں تو دیکھتا ہوں کسی کو جانا چاہیے جو حضرت کو پکڑ کر گھسیٹ لائے۔''

یہی بات چیت ہو رہی تھی کہ رتن آ پہنچی۔ جالپا اسے دیکھتے ہی وہاں سے نکل آئی اور اس کے گلے سے لپٹ کر بولی: ''بہن کلکتہ سے خط آ گیا۔ وہیں ہیں۔''

رتن: ''میرے سر کی قسم؟''

جالپا: ''سچ کہتی ہوں، خط دیکھ نا۔''

رتن: ''تم تو آج ہی چلی جاؤ۔''

جالپا: ''ہاں یہی تو میں بھی سوچتی ہوں۔ تم چلو گی؟''

رتن: ''چلنے کو تو میں تیار ہوں، لیکن اکیلا گھر کس پر چھوڑوں۔ مجھے اس منی بھوشن پر شبہ ہونے لگا ہے۔ اس کی نیت اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ بینک میں بیس ہزار روپے سے کم نہ تھے۔ سب نہ جانے کہاں اڑا دیئے۔ کہتا ہے کریا کرم میں خرچ ہو گئے۔ حساب مانگتی ہوں تو آنکھیں دکھاتا ہے۔ دفتر کی کنجی اپنے پاس رکھے ہوئے ہے۔ مانگتی ہوں تو ٹال جاتا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ میرے ساتھ کوئی گہری چال چل رہا ہے۔ ڈرتی ہوں میں ادھر جاؤں، ادھر یہ سب کچھ لے دے کر چلتا بنے۔ بنگلے کے گاہک آ رہے ہیں۔ میں بھی سوچتی ہوں دیہات میں جا کر اطمینان سے پڑی رہوں۔ میں نہ ہوں گی تو شاید روپے بھی مجھے دیکھنے کو نہ ملیں گے۔ گوپی کو ساتھ لے کر آج ہی چلی جاؤ۔ روپے کا انتظام میں کر دوں گی۔''

جالپا: ''گوپی ناتھ تو شاید نہ جا سکیں۔ دادا کی دوا دارو کے لیے بھی تو کوئی چاہیے۔''

رتن: ''وہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں روز سویرے آ جاؤں گی اور شام کو بھی ایک بار دیکھ جایا کروں گی۔''

جالپا: ''اور دن بھر ان کے ساتھ کون بیٹھا رہے گا؟''

رتن: ''میں تھوڑی دیر بیٹھی بھی رہا کروں گی، مگر تم آج ہی جاؤ۔ بیچارے پر وہاں نہ جانے کیا گزر رہی ہوگی۔ تو یہی طے رہی نا؟''

رتن، منشی جی کے کمرے میں گئی تو رمیش بابو کھڑے ہو گئے اور بولے: ''آئیے! دیوی جی، رما بابو کا پتا تو چل گیا؟''

رتن: ''اس میں آدھی کارگزاری تو میری ہے۔''

رمیش: ''آپ کی صلاح سے تو ہوا ہوگا۔ اب انہیں یہاں لانے کی فکر کرنی چاہیے۔''

رتن: ''اس کی سب سے اچھی صورت یہی ہے کہ جالپا جا کر انہیں پکڑ لاویں۔ گوپی کو ساتھ لیتی جائیں۔ آپ کو اس میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے دادا جی؟''

منشی کو اعتراض تو نہ تھا۔ ان کا بس چلتا تو اس موقع پر دس پانچ آدمیوں کو اور جمع کر لیتے، مگر معاملہ ایسا آ پڑا تھا کہ کچھ بول نہ سکے۔

گوپی کلکتہ کی سیر کا ایسا اچھا موقع پا کر کیوں نہ خوش ہوتا۔ بشمبر دل ہی میں اینٹھ کر رہ گیا۔ خدا نے اسے کمسن نہ بنایا ہوتا تو آج اس کی حق تلفی کیوں ہوتی۔ گوپی ایسے کہاں بڑے ہوشیار ہیں۔ جہاں جاتے ہیں، وہیں کچھ نہ کچھ کھو آتے ہیں۔ ہاں مجھ سے بڑے ہیں۔ قدرت کے نظام نے اسے مجبور کر دیا۔

رات کے نو بجے جالپا چلنے کو تیار ہوئی۔ ساس سسر کے قدموں پر سر جھکا کر دعائیں لیں۔ بشمبر ناتھ رو رہا تھا۔ اسے گلے لگا کر پیار کیا اور موٹر پر بیٹھی۔ رتن سٹیشن تک پہنچانے کے لیے آئی تھی۔ موٹر چلی تو جالپا نے کہا: ''کلکتہ تو بہت بڑا شہر ہوگا، وہاں پتا کیسے چلے گا؟''

رتن: ''پہلے اخبار کے دفتر میں جانا۔ وہاں سے پتا چل جائے گا۔''

جالپا: ''ٹھہروں گی کہاں؟''

رتن: ''دھرم شالہ میں یا ہوٹل میں ٹھہرنا۔ روپے کی ضرورت پڑے تو مجھے تار دینا۔ بابو آ جائیں تو میری ناؤ پار لگ جائے۔ یہ منی بھوشن مجھے تباہ کر دے گا۔''

جالپا: ''ہوٹل میں بدمعاش تو نہ آتے ہوں گے؟''

رتن: ''کوئی ذرا بھی شرارت کرے تو ٹھوکر مارنا۔ کچھ پوچھنا مت۔ ٹھوکر جما کر تب بات کرنا۔ (کمر سے ایک چھری نکال کر) اسے اپنے پاس رکھو۔ کمر میں چھپائے رکھنا۔ جب کبھی باہر نکلتی ہوں تو اسے اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔ اس سے دل بڑا مضبوط رہتا ہے۔ جو مرد کسی عورت کو چھیڑتا ہے تو سمجھ لو وہ پرلے سرے کا نامرد، کمینہ اور بدمعاش ہے۔ تمہاری چھری کی چمک اور تمہارے تیور ہی دیکھ کر اس کی روح فنا ہو جائے گی۔ سیدھا دم دبا کر بھاگے گا، لیکن اگر ایسا موقع آ ہی پڑے جب تمہیں چھری سے کام لینے پر مجبور ہو جانا پڑے تو ذرا مت جھجکنا۔ اس کی بالکل فکر نہ کرنا کہ کیا ہوگا، کیا نہ ہوگا۔ جو کچھ ہونا ہوگا، ہو جائے گا۔

سٹیشن آ گیا۔ قلیوں نے اسباب اتارا۔ گوپی ٹکٹ لایا۔ جالپا پتھر کی مورت کی طرح پلیٹ فارم پر کھڑی رہی۔ گویا حواس مفلوج ہو گئے ہوں۔ کسی بڑی آزمائش

کے پہلے ہماری وہی حالت ہو جاتی ہے، جو آسمان کے طوفان آنے کے قبل ہوتی ہے۔

رتن نے گوپی سے کہا: ''ہوشیار رہنا۔''

گوپی ادھر کئی مہینوں سے ورزش کرتا تھا۔ چلتا تو موڈھے اور سینہ کو دیکھا کرتا۔ دیکھنے والوں کو تو وہ جیوں کا تیوں نظر آتا تھا، مگر اپنی نگاہ میں وہ کچھ اور ہو گیا تھا۔ شاید اسے تعجب ہوتا تھا کہ اسے آتے دیکھ کر کیوں لوگ راستے سے ہٹ نہیں جاتے۔ کیوں اس کی قد و قامت سے مرعوب نہیں ہو جاتے۔ اکڑ کر بولا:

''کسی نے ذرا بھی چوں چپڑ کی تو ہڈی توڑ دوں گا۔''

رتن مسکرائی: ''یہ تو مجھے معلوم ہے، سو مت جانا۔''

گوپی: ''پلک تو جھپکے گی نہیں۔ مجال ہے نیند آ جائے۔''

گاڑی آ گئی۔ گوپی نے ایک ڈبے میں گھس کر قبضہ جما لیا۔ جالپا کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ بولی: ''بہن دعا دو کہ انہیں لے کر خیریت سے لوٹ آؤں۔''

اس وقت اس کا کمزور دل کوئی سہارا ڈھونڈ رہا تھا اور دعا کے سوا وہ سہارا اور کہاں ملتا۔

انجن نے سیٹی دی، دونوں سہیلیاں گلے ملیں۔ جالپا گاڑی میں جا بیٹھی۔

رتن نے کہا: ''جاتے ہی خط بھیجنا۔''

جالپا نے سر ہلا دیا: ''اگر میری ضرورت معلوم ہو تو فوراً خط لکھنا۔ میں سب کچھ چھوڑ کر چلی آؤں گی۔''

جالپا نے سر ہلایا۔

"راستے میں رونا مت!"

جالپا ہنس پڑی۔ گاڑی چل دی۔

(36)

دیبی دین نے چائے کی دکان اسی دن بند کر دی اور دن بھر اس عدالت کی خاک چھانتا پھرتا تھا، جس میں ڈکیتی کا مقدمہ پیش تھا۔ رماناتھ کی شہادت ہو رہی تھی۔ تین دن رما کی شہادت برابر ہوتی رہی اور تینوں دن دیبی دین نے کچھ کھایا نہ سویا۔ آج بھی اس نے گھر آتے ہی کرتا اتار دیا اور پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ چاگن لگ گیا تھا اور کچھ گرمی شروع ہو گئی تھی، لیکن اتنی گرمی نہ تھی کہ پسینہ چلے اور پنکھے کی ضرورت ہو۔ اکثر لوگ تو ابھی تک جاڑے کے کپڑے پہنتے تھے، لیکن دیبی دین پسینے میں تر تھا۔ اس کا چہرہ جس پر معصوم بڑھاپا ہنستا رہتا تھا، کھسایا ہوا تھا۔ گویا بیگار لے لوٹا ہوا ہو۔

جگو نے لوٹے میں پانی لا کر رکھ دیا اور بولی: "چلم بھر دوں؟"

دیبی دین کی یہ تین دن کی خاطر ہو رہی تھی۔ اس کے پہلے بڑھیا کبھی چلم رکھنے کو نہ پوچھتی تھی۔ دیبی دین اس کا مطلب سمجھتا تھا۔ بڑھیا کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا:

"نہیں رہنے دو۔ چلم نہ پیوں گا۔"

''تو ہاتھ منہ دھولو۔ گرد پڑی ہوئی ہے۔''

''دھولوں گا۔ جلدی کیا ہے۔''

بڑھیا آج کا واقعہ سننے کے لیے بے قرار تھی۔ ڈر رہی تھی کہ دیبی دین جھنجھلا نہ پڑے اور اس کی تھکن مٹا دینا چاہتی تھی، جس میں دیبی دین خوش ہو کر آپ ہی آپ سارا قصہ کہہ چلے۔

''تو کچھ جل پان تو کرلو۔ دوپہر کو بھی تو کچھ نہیں کھایا۔ مٹھائی لاؤں؟ پنکھا مجھے دے دو۔''

دیبی دین نے پنکھا دے دیا۔ بڑھیا جھلنے لگی۔ دو تین منٹ تک آنکھیں بند کر کے بیٹھے رہنے کے بعد اس نے کہا: ''آج بھیا کی گواہی ختم ہو گئی۔''

بڑھیا کا ہاتھ رک گیا: ''تو کل سے وہ گھر آ جائیں گے؟''

دیبی: ''ابھی نہیں چھٹی مل جاتی۔ یہی بیان دیوانی میں دینا ہوگا اور اب وہ یہاں آنے ہی کیوں لگے۔ گھوڑے پر چڑھے چڑھے گھومیں گے، مگر ہے بڑا اپکا۔ مطلبی۔ پندرہ آدمیوں کو بے گناہ پھنسا دیا۔ پانچ چھ کو تو پھانسی ہو جائے گی۔ دوسروں کو دس بارہ بارہ سال کی سجا دھری رکھی ہے۔ اس کے بیان سے مقدمہ ثابت ہو گیا۔ کوئی کتنی ہی جرح کرے، کیا مجال کہ جرا بھی ہچکچائے۔ اب ایک بھی نہ بچے گا۔ کس نے کیا، کس نے نہیں کیا، اس کا حال بھگوان جانیں۔ پر سب مارے جائیں گے۔ گھر سے بھی سب سرکاری روپیہ کھا کر بھاگا تھا۔ ہمیں بڑا دھوکہ دیا۔''

جگو نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا: ''اچھی نیکی بدی اپنے ساتھ ہے۔ مطلب کے

لیے تو دنیا ہے۔ کون کس کے لیے مرتا ہے۔"

دیبی: "اپنے مطلب کے لیے جو دوسروں کا گلا کاٹے، اس کو جہر (زہر) دے دینا بھی پاپ نہیں ہے۔"

یکایک دو آدمی آ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک گورا خوبصورت لڑکا تھا۔ جس کی عمر پندرہ سولہ سال سے زائد نہ تھی۔ دوسرا ادھیڑ تھا۔ صورت سے چپراسی معلوم ہوتا تھا۔

دیبی دین نے پوچھا: "کسے کھوجتے ہو؟"

چپڑاسی نے کہا: "تمہارا ہی نام دیبی دین ہے؟ میں اخبار کے دفتر سے آیا ہوں۔ یہ بابو انہیں رماناتھ کے بھائی ہیں، جنہیں شطرنج کا انعام ملا تھا۔ یہ انہی کی تلاش میں دفتر گئے تھے۔ ایڈیٹر صاحب نے تمہارے پاس بھیج دیا۔ تو میں جاؤں؟"

یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ دیبی دین نے گوپی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ صورت رماناتھ سے ملتی تھی۔ بولا:

"آؤ بیٹا بیٹھو۔ کب آئے گھر سے؟"

گوپی نے ایک کھٹک کی دکان پر بیٹھنا شان کے خلاف سمجھا۔ کھڑا کھڑا بولا:

"آج ہی تو آیا ہوں۔ بھابی جی ساتھ ہیں۔ دھرم شالا میں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

دیبی دین نے کھڑے ہو کر کہا: "تو جا کر بہو کو یہیں لاؤ نا۔ اوپر تو رما بابو کا کمرہ ہے ہی۔ آرام سے رہو۔ دھرم شالے میں کیوں پڑے رہو گے۔ نہیں۔ چلو میں بھی چلتا ہوں۔ یہاں سب طرح کا آرام ہے۔"

اس نے جگو کو یہ خبر سنائی۔ اوپر جھاڑو لگانے کو کہہ کر گوپی کے ساتھ دھرم شالے چل دیا۔ بڑھیا نے فوراً اوپر جا کر جھاڑو لگائی۔ لپک کر حلوائی کی دکان سے مٹھائی اور دہی لائی۔ صراحی میں پانی بھر کر رکھ دیا۔ پھر اپنا منہ ہاتھ دھویا۔ ایک رنگین ساڑھی نکالی۔ گہنے پہنے اور بن ٹھن کر بہو کا انتظار کرنے لگی۔

ذرا دیر میں فٹن بھی آ پہنچی۔ بڑھیا نے جا کر جالپا کو اتارا۔ جالپا پہلے تو ساگ بھاجی کی دکان دیکھ کر کچھ جھجکی مگر بڑھیا کی مادرانہ خاطر مدارات دیکھ کر اس کی جھجک دور ہو گئی۔ اس کے ساتھ اوپر گئی تو ہر ایک چیز اس طرح اپنی جگہ پر پائی گویا اپنا ہی گھر ہو۔

جگو نے لوٹے میں پانی رکھ کر کہا: ''اس گھر میں بھیا رہتے تھے بیٹی۔ آج تو پندرہ دن سے گھر سونا پڑا ہوا ہے۔ منہ ہاتھ دھو کر منہ جھوٹا کر لو۔ بھیا کا حال تو ابھی تمہیں نہ معلوم ہو گا۔''

جالپا نے سر ہلا کر کہا: ''کچھ ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم ہوا۔ اخبار کے دفتر میں اتنا معلوم ہوا کہ پولیس نے گرفتار کر لیا۔''

دیبی دین بھی اوپر آ گیا تھا۔ بولا: ''گرفتار تو کیا تھا مگر اب تو وہ ایک معاملہ میں سرکاری گواہ ہو گئے ہیں۔ پراگ راج میں ان پر اب کوئی مقدمہ نہ چلے گا اور سنا ہے نوکری چاکری بھی مل جائے گی۔''

جالپا نے بے خوفی کے ساتھ کہا: ''وہاں تو ان پر کوئی مقدمہ نہیں ہے۔''

دیبی دین نے ڈرتے ڈرتے کہا: ''سنا ہے کچھ روپے پیسے کا معاملہ تھا؟''

جالپا: ''وہ تو کوئی بات نہ تھی۔ جوں ہی ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان سے کچھ

سرکاری رقم خرچ ہوئی ہے۔اسی وقت روپے داخل کردیئے۔یہ فضول گھبرا کر چلے آئے اور پھر ایسی چپ سادھی کہ اپنی خبر تک نہ دی۔''

دیبی دین کا چہرہ روشن ہوگیا۔گویا کسی درد سے آرام مل گیا ہو۔بولا:''تو یہ ہم لوگوں کو یا معلوم۔بار بار سمجھایا کہ گھر چٹھی پتر بھیج دو۔لوگ گھبراتے ہوں گے،مگر مارے شرم کے لکھتے ہی نہ تھے۔اسی دھوکے میں پڑے ہوئے تھے کہ وہاں ان پر مقدمہ چل رہا ہوگا۔جانتے تو سرکاری گواہ کیوں بنتے۔''

سرکاری گواہ قوم میں کتنا بری نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔لوگ اسے کتنا ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں۔یہ اس سے چھپا نہ تھا۔سرکاری گواہ کیوں بنائے جاتے ہیں۔کس طرح انہیں ترغیبیں دی جاتی ہیں۔کس طرح وہ پولیس کے کٹھ پتلے بن کر اپنے ہی دوستوں کا گلا گھونٹتے ہیں۔یہ اسے معلوم تھا۔اگر کوئی آدمی اپنی ناہمواریوں پر شرمندہ ہو کر حقیقت کا انکشاف کرے۔دغا اور فتنہ انگیزی کا پردہ ہٹا دے تو وہ فرشتہ ہے۔اس کی حق پسندی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے،مگر شرط یہی ہے کہ اپنے رفیقوں کے ساتھ اپنے کیے کا پھل بھوگنے کو تیار ہو۔ہنستا کھیلتا پھانسی چڑھ جائے،لیکن اپنی جان بچانے کے لیے یا خود غرضی کے زیر اثر سزا سے خائف ہو کر جو اپنے رفیقوں سے دغا کرے۔آستین کا سانپ بن جائے۔وہ نامرد ہے۔بے غیرت ہے۔بے حیا ہے۔ایسے آدمی کو دنیا کبھی معاف نہیں کرتی۔کبھی نہیں۔یہاں تو معاملہ اور بھی پیچیدہ تھا۔رما نے سزا کے خوف سے اپنے گرد گناہوں کا پردہ نہیں کھولا تھا۔اس میں کم سے کم سچائی تو ہوتی۔قابل نفرین ہونے پر بھی بات تو سچی ہوتی۔یہاں تو ان گناہوں کا پردہ کھولا گیا تھا،جن کی ہوا تک اسے نہ لگی تھی۔

جالپا کو اس کا یقین نہ آیا۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات اور ہوئی ہوگی، جس نے رما کو سرکاری گواہ بننے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ شرماتی ہوئی بولی:

''کیا یہاں بھی کوئی بات ہوئی تھی؟''

دیبی دین نے اطمینان انگیز لہجہ میں کہا: ''کوئی بات نہیں۔ پراگ راج سے وہ میرے ساتھ ہی یہاں آئے۔ جب سے یہاں سے کہیں گئے نہیں۔ باہر نکلتے ہی نہ تھے۔ بس ایک دن نکلے اور اسی دن پولیس نے پکڑ لیا۔ ایک سپاہی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ڈرے کہ مجھی کو پکڑنے آ رہا ہے۔ بھاگ کھڑے ہوئے۔ سپاہی کو کھٹکا ہوا۔ اس نے شبہے میں گرفتار کر لیا۔ میں بھی ان کے پیچھے تھانے پر پہنچا۔ داروغا پہلے تو رشوت مانگتے تھے، مگر جب میں روپے لے کر پہنچا تو وہاں اور ہی گل کھلا ہوا تھا۔ افسروں نے نہ جانے ان سے کیا بات چیت کی۔ بس سرکاری گواہ بن گئے۔ مجھ سے بھیا نے یہی کہا کہ اس معاملے میں بالکل جھوٹ نہ بولنا پڑے گا۔ میں کیا کرتا۔ چپ ہو رہا۔''

جگو: ''نہ جانے سبھوں نے کون سی بوٹی سنگھا دی۔ بھیا تو ایسے نہ تھے۔ دن بھر اماں اماں کرتے رہتے تھے۔ دن بھر سبھی طرح کے لوگ آتے ہیں۔ مرد بھی عورت بھی۔ کیا مجال کہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا ہو۔''

دیبی: ''کوئی برائی نہ تھی۔ میں نے تو ایسا لڑکا ہی نہیں دیکھا۔''

جالپا نے کچھ سوچ کر کہا: ''کیا ان کا بیان ہو گیا؟''

دیبی: ''ہاں تین دن برابر ہوتا رہا۔''

جالپا نے پوچھا: ''ان سے میری ملاقات تو ہو جائے گی؟''

دینی دین نے مسکرا کر کہا: ''ہاں اور کیا، جس نے سارا بھانڈا پھوڑ کر رکھ دیا۔ پولیس ایسی گدھی نہیں ہے۔ آج کل کوئی بھی ان سے ملنے نہیں پاتا۔ کڑا پہرہ رہتا ہے۔''

اس مسئلہ پر اس وقت زیادہ بحث نہ ہو سکی۔ اس گتھی کو سلجھانا آسان نہ تھا۔ جالپا نے گوپی کو بلایا۔ وہ چھجے پر کھڑا سڑک کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ گویا سسرال آیا ہو۔ جالپا نے کہا:

''منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھا لو تو۔''

گوپی شرما کر پھر باہر چلا گیا۔

دینی دین سمجھ گیا کہ ہم لوگوں کے سامنے یہ لڑکا کچھ کھاتے شرماتا ہے۔ بولا: ''اب ہم دونوں جاتے ہیں تمہیں جس چیز کی ضرورت ہم سے کہہ دینا۔ بھیا کو تو ہم اپنا ہی سمجھتے تھے اور ہمارے کون بیٹھا ہوا ہے۔''

جگو نے غرور سے کہا: ''وہ تو میرے ہاتھ کا بنایا کھا لیتے تھے۔''

جالپا نے مسکرا کر کہا: ''اب تمہیں کھانا نہ پکانا پڑے گا ماں جی۔ میں پکا دیا کروں گی۔''

جگو نے ٹوکا: ''ہماری برادری میں دوسرے کے ہاتھ کا کھانا منع ہے۔ بہو۔ اب چار دن کے لیے برادری میں کیا نکو بنیں۔''

جالپا: ''ہماری برادری میں بھی تو دوسروں کے ہاتھ کا کھانا منع ہے۔''

جگو: ''تمہیں یہاں کون دیکھنے آتا ہے۔ پھر پڑھے لکھے آدمی ان باتوں کا بچار بھی تو نہیں کرتے۔ ہماری برادری تو گنواروں کی ہے۔''

جالپا: ''یہ تو اچھا نہیں لگتا کہ تم پکاؤ اور میں کھاؤں۔ جسے بہو بنایا اس کے ہاتھ کا کھانا پڑے گا۔''

اس اپنے پن سے بھرے ہوئے جملے نے دیبی دین کے دل پر چوٹ کی۔ بولا: ''بہو نے بات تو بڑے پتے کی کہی۔ اس کا جواب سوچ کر دینا ہوگا۔ ابھی چلو۔ ان لوگوں کو آرام کرنے دو۔''

دونوں چلے گئے تو گوپی نے آ کر کہا: ''بھیا اسی کھٹک کے یہاں رہتے تھے کیا۔ کھٹک ہی معلوم ہوتا ہے۔''

جالپا نے پھٹکار کر کہا: ''کھٹک ہوں یا چمار، لیکن ہم سے اور تم سے تو سو گنے اچھے ہیں۔ ایک پردیسی آدمی کو چھ مہینہ تک گھر میں رکھا۔ کھلایا پلایا۔ ہم میں ہے اتنی ہمت۔ یہاں تو کوئی مہمان آ جاتا ہے تو وہ بھی بھاری ہو جاتا ہے۔ اگر یہ لوگ نیچ ہیں تو ہم ان سے کہیں نیچے ہیں۔''

گوپی منہ ہاتھ دھو چکا تھا۔ مٹھائی کھاتا ہوا بولا: ''کسی کو ٹھہرا لینے سے کوئی اونچا نہیں ہو جاتا۔ چمار کتنا ہی دان پن کرے، پر رہے گا چمار ہی۔''

جالپا: ''میں اس چمار کو اس پنڈت سے اچھا سمجھوں گی جو دوسروں کو دغا دے۔''

جل پان کر کے گوپی تو شہر گھومنے چلا گیا۔ جالپا نے کچھ نہ کھایا۔ اس کے سامنے ایک مشکل مسئلہ درپیش تھا۔ رما کو اس دلدل سے کیسے نکالے۔ اس پر رسوائی اور جگ ہنسائی کے خیال سے ہی اس کا ضمیر مجروح ہوا اٹھتا تھا۔

ان بے گناہوں کا خون کس کی گردن پر ہوگا۔ ملزموں میں نہ جانے کون گنہگار

ہے۔کون بے گناہ۔سبھی سزا پا جائیں گے۔شاید دو چار کو پھانسی ہو جائے۔یہ خون ناحق کس کی گردن پر ہوگا؟

اس نے پھر سوچا۔لوگ کہتے ہیں یہ ڈھکوسلا ہے۔کون جانتا ہے کسی پر ہتیا پڑتی ہے یا نہیں۔یہ بھی مان لیا کہ کسی پر ہتیا نہ پڑے گی، لیکن اپنی غرض کے لیے دوسروں کو خطرہ میں ڈالنا کتنا شرمناک ہے۔رما نے اسے قبول ہی کیوں کیا۔اگر مقدمہ چلنے کا خوف بھی تھا تو سال دو سال کی قید کے سوا اور کیا ہوتا۔محض اس سزا سے بچنے کے لیے یہ دغا۔اب معلوم بھی ہو جائے کہ میونسپلٹی کچھ نہیں کر سکتی تو کیا ہو سکتا ہے؟ان کی شہادت تو ہو گئی۔

یکا یک ایک نقطہ کسی باریک کیل کی طرح اس کے دل میں چبھ گیا۔یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ اپنا بیان تبدیل کر دیں۔انہیں معلوم ہو جائے کہ ان پر کوئی مقدمہ نہ چلے گا۔تو شاید وہ خود ہی اپنا بیان بدل دیں، مگر یہ معاملہ ان کے کانوں تک کیسے پہنچے۔

وہ اضطراب کے عالم میں نیچے آئی اور دیبی دین سے بولی: ''کیوں دادا ان کے پاس کوئی خط بھی نہیں پہنچ سکتا۔پہرہ والوں کو دس پانچ روپے دینے سے تو شاید خط پہنچ جائے۔''

دیبی دین نے نفی میں گردن ہلا کر کہا: ''مشکل ہے۔پہرہ پر بڑے منجھے ہوئے آدمی رکھے گئے ہیں۔میں دو بار گیا تھا، سبھوں نے پھاٹک پر کھڑا بھی نہ ہونے دیا۔''

''اس بنگلے کے آس پاس مکان دکان تو ہوں گے؟''

''ہاں ہیں، کیوں نہیں ایک طرف تو دوسرا بنگلہ ہے۔ دوسری طرف آموں کا باغ ہے۔ سامنے سڑک ہے۔''

''شام کو وہ گھومنے گھامنے تو نکلتے ہوں گے؟''

''ہاں نکلتے تو ہیں، لیکن پولیس کے ساتھ اپسر ساتھ رہتے ہیں۔''

''اگر کوئی اس باغ میں چھپ کر بیٹھے تو کیا ہو۔ جب انہیں اکیلے دیکھے خط پھینک دے۔ وہ ضرور اٹھائیں گے؟''

دیبی دین نے سوچ کر کہا: ''ہاں ہو سکتا ہے، لیکن اکیلے ملیں تب تو۔''

ذرا اور اندھیرا ہوا تو جالپا نے دیبی دین کو ساتھ لیا اور رما ناتھ کا بنگلہ دیکھنے چلی۔ ایک خط لکھ کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ بار بار دیبی دین سے پوچھتی۔ اب کتنی دور ہے؟ سوچتی کہیں رما ٹہلتے ہوئے مل جائیں تو کیا پوچھنا ہے۔ خط کو رومال میں باندھ کر ان کے سامنے پھینک دوں۔

دفعتاً اسے ایک اندیشہ پیدا ہوا۔ کہیں وہ خط پا کر بھی اپنا بیان نہ بدلیں تو کیا ہو گا۔ کون جانے اب میری یاد بھی انہیں ہے یا نہیں۔ کہیں مجھے دیکھ کر وہ منہ پھیر لیں تو کیا ہو۔ اس خیال سے وہ سہم اٹھی۔

اس نے دیبی دین سے پوچھا: ''کیوں دادا وہ کبھی ہم لوگوں کا ذکر بھی کرتے تھے؟''

دیبی دین نے سر ہلا کر کہا: ''کبھی نہیں۔ ہاں اداس بہت رہتے تھے۔''

اس جواب نے جالپا کو اور بھی تردد میں ڈال دیا۔ شہر کی گھنی بستی سے یہ لوگ دور نکل آئے تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ دن کی تیز روی کے بعد اس وقت ہوا

بھی آرام کر رہی تھی۔ سڑک کے کنارے درخت اور میدان چاند کی گرد آلود روشنی میں بے جان سے معلوم ہوتے تھے۔ جالپا کو یہ گمان ہونے لگا کہ اس کی کوششوں کا کچھ حاصل نہیں ہے۔ اس کی بادیہ پیمائی بالکل بے سود ہے۔ اس بستی میں اس کی حالت بے کس لڑکے کی سی ہے، جو مٹھی بھر اناج کے لیے دربدر پھرتا ہو۔ وہ جانتا ہے اگلے دروازہ پر بھی اسے کچھ نہ ملے گا۔ شاید گالیاں ہی ملیں۔ پھر بھی دست سوال پھیلاتا ہے۔ یہ امید کا سہارا نہیں، مایوسی کا سہارا ہے۔

یکا یک سڑک کے داہنی طرف بجلی کی روشنی نظر آئی۔

دیبی دین نے ایک بنگلے کی طرف انگلی اٹھا کر کہا: ''وہی ان کا بنگلہ ہے۔''

جالپا نے مایوسانہ انداز سے ادھر دیکھا۔ بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی آدمی نہ تھا۔ پھاٹک پر تالا پڑا ہوا تھا۔ بولی: ''یہاں تو کوئی نہیں ہے۔''

دیبی دین نے پھاٹک کے اندر جھانک کر کہا: ''شاید یہ بنگلہ چھوڑ دیا۔ دیکھو میں پتا لگاتا ہوں۔ بنگلے کے دائیں طرف آموں کے باغ میں روشنی نظر آئی۔ شاید کھٹک باغ کی رکھوالی کر رہا تھا۔ دیبی دین نے باغ میں آ کر پکارا: ''کون ہے۔ یہاں کس نے یہ باغ لیا ہے؟''

ایک آدمی آموں کے جھرمٹ سے نکل آیا۔ دیبی نے اس پہچان کر کہا: ''ارے تم ہو جنگلی۔ تم نے یہ باغ لیا ہے؟'' جنگلی ٹھگنا سا گٹھیلا آدمی تھا۔ دیبی کی آواز پہچان کر کہا:

''ہاں دادا لے تو لیا ہے مگر کچھ ہے نہیں۔ گھاٹا ہی رہے گا۔ تم یہاں کیسے آئے؟''

دینی: ''کچھ نہیں، یونہی چلا آیا۔ اس بنگلہ والے آدمی کہاں گئے؟''

جنگلی نے ادھر ادھر چوکنی آنکھوں سے دیکھ کر ان تینوں کو تاڑا۔ ان میں وہی مخبر ٹکا ہوا تھا۔ ''آج سب چلے گئے۔ سنتے ہیں پندرہ بیس دن میں آویں گے۔ پڑھے لکھے آدمی بھی ایسے دگاباج ہوتے ہیں۔ دادا سراسر جھوٹی گواہی دی۔ نہ جانے اس کے بال بچے ہیں یا نہیں۔ بھگوان سے بھی نہ ڈرا۔''

جالپا وہیں کھڑی تھی۔ دینی دین نے جنگلی کو اور زہر اگلنے کا موقع نہ دیا۔ بولا: ''پندرہ بیس دن میں آویں گے۔ خوب معلوم ہوا ہے۔''

''ہاں، وہی پہرے والے کہہ رہے تھے۔''

''کچھ معلوم ہوا ہے، کہاں گئے ہیں؟''

''وہی موقع دیکھنے گئے ہیں۔ جہاں واردات ہوئی تھی۔''

دینی دین چلم پینے لگا اور جالپا سڑک پر آ کر ٹہلنے لگی۔ رما کی یہ توہین سن کر اس کا دل پاش پاش ہو گیا۔ اسے رما پر غصہ نہ آیا۔ رنج بھی نہ ہوا۔ بلکہ اسے ہاتھوں کا سہارا دے کر اس دلدل سے نکالنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو گیا۔ رما چاہے اسے دھتکار ہی کیوں نہ دے، مگر وہ اسے معصیت کے اس غار میں نہ گرنے دے گی۔

جب دونوں یہاں سے چلے تو جالپا نے پوچھا: ''اس آدمی سے کہہ دیا ہے کہ جب وہ آئیں ہمیں خبر دے دے۔''

''ہاں کہہ دیا ہے۔''

ایک مہینہ گزر گیا۔ گوپی ناتھ پہلے تو کئی دن کلکتہ کی سیر کرتا رہا، مگر چار پانچ دن میں ہی یہاں سے اس کا جی ایسا اچاٹ ہوا کہ گھر کی رٹ لگانی شروع کی۔ آخر جالپا نے اسے لوٹا دینا ہی اچھا سمجھا۔ یہاں تو وہ چھپ چھپ کر رویا کرتا تھا۔

جالپا کئی بار رما کے بنگلے تک ہو آئی۔ وہ جانتی تھی کہ رما نہیں آئے ہیں۔ پھر بھی وہاں کا ایک چکر لگا آنے میں اسے ایک عجیب تسلی ہوئی تھی۔

جالپا کچھ پڑھتے پڑھتے یا لیٹے لیٹے تھک جاتی تو ایک لمحہ کے لیے کھڑکی کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ ایک دن شام کو وہ کھڑکی کے سامنے آئی تو سڑک پر موٹروں کی قطار نظر آئی۔ تعجب ہوا، اتنی موٹریں کہاں جاتی ہیں۔ غور سے دیکھنے لگی۔ کل چھ موٹریں تھیں۔ ان میں پولیس کے افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ آخری موٹر پر اس کی نگاہ پڑی تو سارے جسم میں ایک برقی روسی دوڑ گئی۔ وہ ایک محویت کے عالم میں کھڑکی سے زینے تک دوڑی ہوئی گئی۔ گویا موٹروں کو روک لینا چاہتی ہو، لیکن اتنی ہی دیر میں اسے معلوم ہو گیا کہ میرے نیچے پہنچتے ہی موٹریں نکل جائیں گی۔ وہ پھر کھڑکی کے سامنے آ گئی۔ رما اب بالکل سامنے آ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں کھڑکی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جالپا نے اشارہ سے کچھ کہنا چاہا لیکن حیا مانع ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ رما کی موٹر کچھ دھیمی ہو گئی ہے۔

دیبی دین کی آواز بھی سنائی دی، مگر موٹر رکی نہیں۔

جالپا نے زینے پر آ کر کہا: ''دادا!''

دینی دین نے سامنے آ کر کہا: ''بھیا آ گئے۔ وہ کیا موٹر جا رہی ہے۔''

یہ کہتا ہوا وہ اوپر گیا۔ جالپا نے شوق تجسس کو شرم سے دباتے ہوئے کہا: ''تم سے کچھ کہا؟''

دینی: ''اور کیا کہتے کھالی رام رام کی۔ میں نے خیریت پوچھی۔ دونوں ہاتھوں سے دلاسا دیتے چلے گئے۔ تم نے دیکھا کہ نہیں۔''

جالپا نے سر جھکا لیا: ''دیکھا کیوں نہیں، کھڑکی پر کھڑی تھی۔''

''انہوں نے بھی تمہیں دیکھا ہوگا۔''

''کھڑکی کی طرف تو تاکتے تھے۔''

''بہت چکرائے ہوں گے کہ یہ کون ہے؟''

''کچھ معلوم ہوا۔ مقدمہ کب پیش ہوگا؟''

''کل ہی تو۔''

''تب تو جو کچھ کرنا ہے آج ہی کر لینا چاہیے۔ میرا خط کسی طرح انہیں مل جاتا تو کام بن جاتا۔ دینی دین نے اس طرح دیکھا گویا کہہ رہا ہے، تم اس کام کو جتنا آسان سمجھتی ہو اتنا آسان نہیں ہے۔

جالپا نے اس کے دل کی کیفیت سمجھ کر کہا: ''کیا تمہیں شبہ ہے کہ وہ اپنا بیان تبدیل کرنے پر راضی نہ ہوں گے؟''

دینی دین کہ اب اسے تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بولا: ''ہاں بہو جی! مجھے اس کا بہت بڑا اندیشہ ہے اور سچ پوچھو تو ہے بھی جوکھم۔ اگر وہ بیان بدل بھی دیں تو پولیس کے پنجے سے چھوٹ نہیں سکتے۔ وہ کوئی دوسرا الزام لگا کر انہیں پھر

پکڑے گی اور کوئی نیا مقدمہ چلا دے گی۔''

جالپا نے ایسی نظروں سے دیکھا۔ گویا اسے اس کا بالکل اندیشہ نہیں ہے۔ پھر پکڑے گی اور کوئی پولیس کے پنجے سے بچانے کا ٹھیکہ نہیں لیتی۔ میں صرف یہی چاہتی ہوں کہ ممکن ہو تو انہیں رسوائی سے بچا لوں۔ اگر وہ سچ مچ ڈکیتیوں میں شریک ہوتے تب بھی میں یہی چاہتی کہ آخر تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہیں۔ میں یہ کبھی پسند نہ کرتی کہ وہ دوسروں کو دغا دے کر مخبر بن جائیں، لیکن یہ معاملہ تو بالکل جھوٹ ہے۔ میں یہ کسی طرح نہیں برداشت کر سکتی کہ وہ اپنی غرض کے لیے جھوٹی شہادت دیں۔ اگر انہوں نے اپنا بیان نہ بدلا تو میں عدالت میں جا کر ساری قلعی کھول دوں گی۔ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے قطع تعلق کر لیں۔ میری صورت نہ دیکھیں۔ یہ مجھے منظور ہے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اتنے بے گناہوں کا خون ان کی گردن پر ہو۔

دیبی دین نے اسے عقیدت کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا: ''تم سب کچھ کر لوگی بہو جی! اب مجھے بسواس ہو گیا۔ جب تم نے کلیجا اتنا مضبوط کر لیا ہے، تو تم سب کچھ کر سکتی ہو۔''

''تو یہاں سے نو بجے چلیں؟''

''میں تیار ہوں۔''

وہ رماناتھ، جو پولیس کے خوف سے باہر نہ نکلتا تھا، جو دیبی دین کے گھر میں چوروں کی طرح پڑا زندگی کے دن پورے کر رہا تھا، آج دو مہینوں سے رئیسانہ عیش وعشرت میں ڈوبا ہوا ہے۔ آسائش کے سبھی سامان موجود ہیں۔ خدمت کے لیے چوکیداروں کی ایک فوج، کھانا پکانے کے لیے کاشمیری باورچی بڑے بڑے افسر اس کی دلجوئی کرتے رہتے تھے۔ اس کے منہ سے بات نکلی نہیں کہ پوری ہوئی۔ اتنے ہی دنوں میں اس کے مزاج میں اتنی نفاست آ گئی ہے، گویا وہ خاندانی رئیس ہو۔ اسے اپنی حالت پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ رات کو وہ افسروں کے ساتھ سینما یا تھیٹر دیکھنے جاتا ہے۔ شام کو موٹروں کی سیر ہوتی ہے۔ دلچسپی کے نت نئے سامان مہیا کرتے رہتے ہیں۔ جس دن مجسٹریٹ نے ملزموں کو سیشن سپرد کیا، سب سے زیادہ خوشی رما کو ہوئی۔ گویا اس کی خوش نصیبی کا ستارا طلوع ہو رہا ہے۔

پولیس کو معلوم تھا کہ سیشن جج کی عدالت میں یہ گھر کی کھیتی نہ ہوگی۔ اتفاق سے جج صاحب ہندوستانی تھے۔ اور حق پروری کے لیے بدنام پولیس ہو یا ملزم، ان کی نگاہ میں دونوں برابر تھے۔ وہ کسی کے ساتھ رو رعایت نہ کرتے تھے۔ اس لیے پولیس نے ایک بار رما کو ان مقامات سے روشناس کرا دینا ضروری سمجھا، جہاں وارداتیں ہوئیں تھیں۔ ایک زمیندار کے سجے سجائے بنگلے میں یہ جماعت فروکش ہوئی۔ دن بھر لوگ شکار کھیلتے۔ رات کو گراموفون سنتے۔ تاش کھیلتے یا بجرے پر ندی کی سیر کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شہزادہ شکار کھیلنے آیا ہے۔ ان دلچسپیوں میں رما کو کوئی آرزو تھی، تو یہ کہ جالپا بھی یہاں ہوتی۔ اب تک وہ محتاج تھا۔ اس کی

خواہش گویا نیم جان ہو رہی تھیں۔ نسیم کے ان ٹھنڈے جھونکوں نے انہیں بیدار کر دیا۔ وہ اس خیال سے خوش تھا کہ یہ مقدمہ ختم ہوتے ہی اسے کوئی عہدہ مل جائے گا۔ تب وہ جا کر جالپا کو منا لائے گا اور زندگی سے لطف اندوز ہو گا۔ وہاں ایک نئی زندگی ہو گی۔ اس کے اصول کچھ اور ہوں گے۔ معیار کچھ اور ہوں گے۔ اس میں سخت پابندیاں ہوں گی اور بیدردانہ بندشیں۔ اب اس کی زندگی کا کچھ مقصد ہو گا۔ کچھ نصب العین ہو گا۔ محض کھانا سونا اور روپے کے لیے ہائے ہائے کرنا ہی مآل زندگی نہ ہو گا۔ اسی مقصد کے ساتھ اس بے اصولانہ زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ نفس کی گمراہیوں نے اسے یہ دن دکھایا تھا اور اب تک نئی بے لوث زندگی کا خواب دکھا رہی تھی۔ شرابیوں کی طرح ایسے شخص بھی روز ہی پاک ارادے کرتے ہیں، لیکن ان ارادوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ نئی نئی ترغیبیں سامنے آتی رہتی ہیں اور آغاز اصلاح کی میعاد ٹلتی جاتی ہے۔ نئی سحر کا طلوع کبھی نہیں ہوتا۔

ایک مہینہ دیہات کی سیر کرنے کے بعد رما اپنے ناز برداروں کے ساتھ اپنے بنگلہ پر جا رہا تھا۔ راستہ دینی دین کے گھر کے سامنے سے تھا۔ کچھ دور ہی سے اپنا کمرہ دکھائی دیا۔ اس کی نگاہیں خواہ مخواہ اوپر اٹھ گئیں۔ کھڑکی کے سامنے کوئی کھڑا تھا۔ اس نے سوچا اس وقت دینی دین وہاں کیا کر رہا ہے۔ ذرا غور سے دیکھا تو یہ کوئی عورت معلوم دیتی ہے، مگر عورت کہاں سے آئی تو اس عورت کا چہرہ صاف نظر آنے لگا۔ رما چونک پڑا۔ یہ تو جالپا ہے۔ بیشک جالپا ہے، مگر نہیں جالپا یہاں کیسے آ رہے گی۔ میرا اپتا ٹھکانہ اسے کہاں معلوم۔ کہیں بڈھے نے اسے خط تو نہیں لکھ دیا، ہے تو جالپا ہی۔ نائب داروغہ موٹر چلا رہا تھا۔ رما نے بڑی منت کے ساتھ کہا:

''سردار صاحب ایک لمحہ کے لیے رک جایئے۔ میں ذرا دیبی دین سے ایک بات کرلوں۔'' نائب نے موٹر دھیمی کرلی، لیکن پھر سوچ کر اسے آگے بڑھا دیا۔ رما نے تیز ہو کر کہا ''آپ تو مجھے قیدی سمجھ رہے ہیں۔''

نائب نے خفیف ہو کر کہا ''آپ تو جانتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب کتنے جامے سے باہر ہو جاتے ہیں۔'' بنگلہ پر پہنچ کر رما سوچنے لگا کہ جالپا سے کیسے ملوں؟ وہ جالپا ہی تھی۔ اس میں اسے کچھ ذرا بھی شبہ نہ تھا۔ آنکھوں کو کیسے دھوکہ دیتا۔ دل میں ایک طوفان اٹھا ہوا تھا۔ کیا کرے، کیسے جائے، اسے کپڑے اتارنے کی یاد بھی نہ رہی تھی۔ پندرہ منٹ تک وہ کمرے کے دروازہ پر کھڑا رہا۔ کوئی حکمت نہ سوجھی۔ لاچار پلنگ پر لیٹ گیا۔

ذرا دیر میں وہ پھر اٹھا اور سامنے صحن میں نکل آیا۔ پھاٹک پر چوکیدار کھڑا تھا۔ سڑک پر اسی وقت بجلی روشن ہوگئی۔ رما کو چوکیدار پر ایسا غصہ آیا کہ گولی ماردے۔ سوچنے لگا اگر مجھے کوئی اچھی جگہ مل گئی تو ایک ایک سے سمجھوں گا۔ تمہیں تو ڈسمس کرا کے چھوڑوں گا۔ کیسا شیطان کی طرح سر پر سوار ہے۔ منہ تو ذرا دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے بکری کی دم ہے۔ واہ رے آپ کی پگڑی۔ کوئی نوکری ڈھونے والا قلی ہے۔ ابھی کتا بھونک پڑے تو دم دبا کر بھاگیں گے، مگر یہاں ایسے ڈٹے کھڑے ہیں گویا کسی قلعہ کے دروازے کی حفاظت کر رہے ہیں۔

ایک چوکیدار نے آکر کہا: ''انسپکٹر صاحب نے بلایا ہے۔ باجے کے کچھ نئے توے منگوائے ہیں۔''

رما نے جھلا کر کہا: ''مجھے فرصت نہیں ہے۔'' پھر سوچنے لگا، جالپا اس وقت

یہاں کیسے آئی۔ اکیلی آئی ہے اور کوئی ساتھ ہے۔ ظالم نے بڈھے سے ایک منٹ بھی بات نہ کرنے دی۔ جالپا پوچھے گی تو ضرور کہ کیوں بھاگے تھے۔ صاف صاف کہہ دوں گا، اس وقت اور کر ہی کیا سکتا تھا، مگر ان تھوڑے دنوں کی تکلیف نے زندگی کا مسئلہ تو حل کر دیا۔ اب لطف سے زندگی کٹے گی۔ کوشش کر کے اسی طرف تبادلہ کرا لوں گا۔ یہ سوچتے سوچتے رما کو خیال آیا کہ جالپا بھی میرے ساتھ یہاں رہے تو کیا ہرج ہے۔ مجھے باہر والوں سے ملنے کی ممانعت ہے۔ جالپا کے لیے رکاوٹ ہو سکتی ہے، لیکن اس وقت مسئلہ کو چھیڑنا مناسب نہیں۔ کل اس کا تصفیہ کروں گا۔ دیبی دین بھی عجیب آدمی ہے پہلے تو کئی بار آیا، مگر آج اس نے بھی چپ سادھ لی۔ کم سے کم اتنا تو ہو سکتا تھا کہ آ کر پہرے والے کانسٹیبل کی معرفت مجھے جالپا کے آنے کی خبر دیتا۔ پھر میں دیکھتا کون جالپا کو نہیں آنے دیتا۔

رسویا تھالی لایا۔ گوشت ایک قسم کا تھا۔

رما تھالی دیکھتے ہی جھلا اٹھا۔ ان دنوں لذیذ کھانا دیکھ کر ہی اسے بھوک لگتی تھی۔ جب تک چار پانچ قسم کا گوشت نہ ہو، چٹنی اچار نہ ہو، اسے کھانے کی رغبت نہ ہوتی تھی۔ بگڑ کر بولا: ''کیا کھاؤں! تمہارا سر۔ تھالی اٹھا لے جاؤ۔''

رسوئیے نے ڈرتے ڈرتے کہا: ''حضور اتنی جلد اور چیزیں کیسے بناتا۔ ابھی کل دو گھنٹے تو آئے ہوئے ہوئے ہیں؟''

''دو گھنٹے تمہارے لیے تھوڑے ہوتے ہیں؟''

''اب حضور سے کیا کہوں؟''

''مت بکو۔''

''حضور......؟''

''مت بکو ڈیم۔''

رسوئیے نے پھر کچھ نہ کہا۔ بوتل لایا۔ برف توڑ کر گلاس میں ڈالی اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ رما کو اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ رسوئیے کو نوچ کھائے۔ اس کا مزاج ان دنوں بہت تیز ہو گیا تھا۔

شراب کا دور شروع ہوا تو رما کا غصہ اور بھی تیز ہوا۔ لال لال آنکھیں نکال کر بولا: ''چاہوں تو ابھی تمہارا کان پکڑ کر نکال دوں۔ ابھی اسی دم۔ تم نے سمجھا کیا ہے؟''

اس کا غصہ بڑھتا ہوا دیکھ کر رسویا چپکے سے سرک گیا۔ رما نے گلاس لیا اور دو چار لقمے کھا کر باہر صحن میں ٹہلنے لگا۔ دھن سوار تھی کیسے یہاں سے نکل جاؤں؟

یکا یک اسے ایسا معلوم ہوا کہ تار کے باہر درختوں کی آڑ میں کوئی ہے۔ ہاں کوئی کھڑا اس کی طرف تاک رہا ہے۔ شاید اشارے سے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ رما ناتھ کا دل دھڑکنے لگا۔ کہیں مفسدوں نے اس کی جان لینے کی تو نہیں ٹھانی ہے۔ یہ خدشہ اسے ہمیشہ لگا رہتا تھا۔ اسی خوف سے وہ رات کو بنگلے سے باہر بہت کم نکلتا تھا۔ فقط جان کے اندیشے نے اسے اندر چلے جانے کی تحریک کی۔ اسی وقت ایک موٹر سڑک سے نکلی۔ اس کی روشنی میں رما نے دیکھا۔ وہ اندھیرا سایہ کسی عورت کا ہے۔ اس کی ساڑھی صاف نظر آ رہی تھی۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ وہ عورت اس کی طرف آ رہی ہے۔ پھر خیال آیا کہ کوئی مرد اس صورت میں میرے ساتھ دغا تو نہیں کر رہا ہے۔ وہ جوں جوں پیچھے ہٹتا تھا، وہ سایہ اس کی طرف بڑھتا چلا جاتا۔

یہاں تک کہ تار کے پاس آ کر اس نے کوئی چیز رما کی طرف پھینکی۔ رما چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا، مگر دیکھا تو صرف ایک لفافہ تھا۔ اس لیے کچھ تسکین ہوئی۔ وہ سایہ بھی تاریکی میں غائب ہو گیا تھا۔ رما نے لپک کر وہ لفافہ اٹھا لیا۔ خوف بھی تھا اور تعجب بھی۔ خوف کم تھا، تعجب زیادہ۔ لفافہ کو جیب میں چھپائے وہ کمرے میں آیا۔ دونوں طرف کے دروازے بند کر لیے اور لفافہ کو ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا۔ سرنامہ دیکھتے ہی اس کے دل پر پھریریاں سی اڑنے لگیں۔ تحریر جالپا کی تھی۔ فوراً لفافہ کھولا۔ ایک ہی سانس میں سارا خط پڑھ گیا اور ایک لمبی سانس لی۔ اسی سانس کے ساتھ توہمات کا وہ بوجھ، جس نے چھ ماہ سے اس کی روح کو دبا رکھا تھا۔ وہ سارا درد دل، جو اس کے خون حیات کو چوسے ڈالتا تھا۔ وہ ساری کمزوری، شرم اور خفت جیسے چھومنتر ہو گئی۔ اسے اتنی تقویت، اتنا غرور اور اپنے اوپر اتنا اعتماد کبھی نہ ہوا تھا۔ پہلی سنک یہ سوار ہوئی، ابھی چل کر داروغہ سے کہہ دوں مجھے اس مقدمہ سے کوئی تعلق نہیں، لیکن پھر خیال آیا بیان تو اب ہو ہی چکا۔ جتنی رسوائی ہونی تھی، ہو ہی چکی۔ اب گناہ کی لذت سے کیوں ہاتھ دھوؤں، مگر ان ظالموں نے مجھے کیسا دھوکہ دیا ہے۔ کیسا چکمہ دیا ہے اور ابھی تک مغالطہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ اب بھی ان پر مجھے اعتبار نہیں ہے۔ اگر کسی بات پر اپنا بیان بدل دوں تو ناطقہ بند ہو جائے۔ یہی تو ہوگا۔ مجھے کوئی جگہ نہ ملے گی۔ بلا سے، ان لوگوں کے منصوبے تو خاک میں مل جائیں گے۔

اس دغابازی کی سزا تو مل جائے گی۔ اور کچھ بھی نہ سہی۔ اتنی بدنامی سے تو بچ جاؤں گا۔ یہ سب شرارت ضرور کریں گے، لیکن جھوٹا الزام لگانے کے سوا کر ہی کیا

سکتے ہیں۔ جب میرا یہاں رہنا ثابت ہی نہیں، تو مجھ پر الزام ہی کیا لگ سکتا ہے۔ سبھوں کے منہ میں کالک لگ جائے گی۔ ایک ایک کو اپنی جان کی خیر منانی پڑے گی۔ انہیں چکمہ دوں گا۔ کہہ دوں گا، اگر آج مجھے کوئی اچھی جگہ مل جائے گی تو میں شہادت دوں گا۔ اس معاملہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ نہیں تو پیچھے سے کسی چھوٹے موٹے تھانہ میں نائب داروغہ بنا کر بھیج دیں اور وہاں سڑا کروں۔ لوں گا انسپکٹری اور کل دس بجے تک میرے پاس تقرری کا پروانہ آ جائے۔ وہ چلا کہ اسی وقت داروغہ سے کہے، لیکن پھر رک گیا۔ ایک بار جالپا سے ملنے کے لیے اس کی جان تڑپ رہی تھی۔ جالپا سے اتنی محبت، اتنی شیفتگی اور اتنی عقیدت کبھی نہ ہوئی تھی۔ گویا وہ کوئی غیبی طاقت ہے، جسے دیوتاؤں نے اس کی حفاظت کے لیے بھیجا ہو۔

دس بج گئے تھے۔ رماناتھ نے بجلی گل کر دی اور برآمدے میں آ کر زور سے کواڑ بند کر دیئے۔ جس سے پہلے والے سپاہی کو معلوم ہو۔ اندر سے کواڑ بند کر کے سو رہے ہیں۔ وہ اندھیرے برآمدے میں ایک منٹ تک کھڑا رہا۔ تب آہستہ سے اتر اار کانٹے دار کے پاس آ کر سوچنے لگا۔ اس پار کیسے جائے۔ شاید جالپا ابھی باغیچے میں ہو۔ دیبی دین ضرور اس کے ساتھ ہوگا۔ صرف یہ باڑ اس کا راستہ روکے ہوئے ہے۔ اسے پھاند جانا غیر ممکن تھا۔ اس نے تاروں کے بیچ میں سے ہو کر نکل جانے کا ارادہ کیا۔ اپنے سب کپڑے سمیٹ لیے اور کانٹوں کا بچاتے ہوئے سر اور کندھے کو تار کے بیچ میں ڈالا، مگر نہ جانے کیوں کپڑے پھنس گئے۔ ہاتھ سے کپڑوں کو چھڑانا چاہا تو آستین کانٹوں میں پھنس گئی۔ دھوتی بھی الجھی ہوئی تھی۔ بیچارہ بڑی مصیبت میں پڑا۔ نہ اس پار جا سکتا نہ اس پار۔ ذرا سی غلطی

ہوئی اور کانٹے اس کے جسم میں چبھ جائیں گے۔

مگر اس وقت اسے کپڑوں کی پروا نہ تھی۔ اس نے گردن اور آگے بڑھائی اور کپڑوں میں لمبا چیرا لگاتا ہوا اس پار نکل گیا۔ سارے کپڑے تار تار ہو گئے۔ پیٹھ میں بھی کھرونچے لگے، مگر اس وقت کوئی بندوق کا نشانہ باندھ کر بھی اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا تو وہ پیچھے نہ ہٹتا۔ پھٹے ہوئے کپڑوں کو اس نے وہیں پھینک دیا۔ گلے کی چادر پھٹ جانے پر بھی کام دے سکتی تھی۔ اسے اوڑھ لیا۔ دھوتی سمیٹ لی اور باغیچہ میں گھومنے لگا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ شاید رکھوالا کھٹک کھانے گیا ہوا تھا۔ اس نے دو تین بار آہستہ آہستہ جالپا کا نام پکارا۔ کسی کی آہٹ نہ ملی۔ سمجھ گیا جالپا چلی گئی۔ وہ انہیں پیروں دیبی دین کے گھر کی طرف چلا۔ اسے مطلق خوف نہ تھا۔ بلا سے کسی کو معلوم ہو جائے کہ میں بنگلے سے نکل آیا ہوں۔ پولیس میرا کر ہی کیا سکتی ہے۔ میں قیدی نہیں ہوں۔ کسی کی غلامی نہیں لکھائی۔

آدھی رات ہو گئی تھی۔ دیبی دین آدھ گھنٹہ پہلے لوٹا تھا اور کھانا کھانے جا رہا تھا کہ ایک ننگ دھڑنگ آدمی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ رما نے چادر سر پر باندھ لی تھی اور دیبی دین کو ڈرانا چاہتا تھا۔

دیبی دین نے ہکلا کر پوچھا: ''کون ہے؟''

پھر رما ناتھ کو پہچان گیا اور جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑتا ہوا بولا: ''تم نے بھیا خوب بھیس بنایا ہے۔ کپڑے کیا ہوئے؟''

''تار نکل رہا تھا۔ سب اس کے کانٹوں میں الجھ کر پھٹ گئے۔''

''رام رام، بدن میں تو کانٹے نہیں چبھے؟''

''کچھ نہیں۔ دو ایک کھر و نچے لگے ہیں۔ میں بہت بچ کر نکلا۔''

''بہو کا خط تو مل گیا تھا؟''

''ہاں اسی وقت مل گیا تھا۔ کیا وہ بھی تمہارے ساتھ تھیں۔''

''وہ میرے ساتھ نہیں تھی۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ جب سے تمہیں موٹر پر آتے دیکھا تبھی سے جانے جانے لگائے ہوئے تھیں۔''

''تم نے گھر میں کوئی خط لکھا تھا؟''

''میں نے کوئی خط وط نہیں لکھا بھیا۔ جب وہ آئیں تو مجھے خود اچنبھا ہوا کہ بغیر جانے بوجھے کیسے آ گئیں۔ پیچھے سے انہوں نے بتایا وہ شطرنج والا نقشہ انہی نے پراگ راج سے بھیجا تھا اور انعام بھی وہیں سے آیا تھا۔''

رما حیرت میں آ گیا۔ جالپا کی دانشمندی نے استعجاب میں ڈال دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی شکست کے خیال نے اسے کچھ ملول بھی کر دیا۔ یہاں بھی اس کی ہار ہوئی۔

بڑھیا اوپر گئی ہوئی تھی۔ دیبی دین نے زینے کے پاس جا کر کہا: ''ارے کیا کرتی ہو؟ بہو سے کہہ دے کہ ایک آدمی ان سے ملنے آیا ہے۔''

یہ کہہ کر دیبی دین نے رما کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا: ''چلو اب سرکار میں تمہاری پیشی ہوگی۔ بہت بھاگے تھے۔ بغیر وارنٹ کے پکڑے گئے۔''

رما کا ولولہ اور اشتیاق اڑا جاتا تھا۔ اس کی شرم اس کے سر پر سوار ہو جاتی تھی۔ جالپا کے سوالوں کا اس کے پاس کیا جواب تھا۔ جس خوف سے وہ بھاگا تھا، اس نے بالآخر اس کا پیچھا کر کے اسے مغلوب کر ہی دیا۔ وہ جالپا کے سامنے آنکھیں

بھی تو نہ سیدھی کر سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ چھڑا لیا اور زینہ کے پاس ٹھٹھک گیا۔

دیبی دین نے پوچھا: ''کیوں رک گئے؟''

رما نے سر کھجلاتے ہوئے جواب دیا: ''چلو میں آتا ہوں۔''

بڑھیا نے اوپر ہی سے کہا: ''پوچھو کون آدمی ہے۔ کہاں سے آیا ہے؟''

دیبی دین نے دل لگی کی: ''کہتا ہے اب جو کچھ کہوں گا، بہو سے کہوں گا۔''

''کوئی چٹھی لایا ہے؟''

''نہیں۔''

سناٹا ہو گیا۔ دیبی دین نے ایک لمحہ کے بعد پوچھا: ''کہہ دوں لوٹ جائے؟''

جالپا زینہ پر آ کر بولی: ''کون آدمی ہے۔ پوچھتی تو ہوں؟''

''کہتا ہے بڑی دور سے آیا ہوں۔''

''ہے کہاں؟''

''یہ کیا کھڑا ہے؟''

''اچھا بلا لو۔''

رما چادر اوڑھے کچھ جھجکتا کچھ جھینپتا کچھ ڈرتا زینہ پر چڑھا۔ جالپا اسے دیکھتے ہی فوراً دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ دیبی دین وہاں نہ ہوتا تو وہ دو قدم آگے بڑھی ہوتی۔

جالپا کی آنکھوں میں کبھی اتنا سرور نہ تھا۔ جسم میں کبھی اتنی چستی نہ تھی۔ رخساروں پر کبھی اتنی چمک نہ تھی۔ سینہ میں کبھی اتنا ارتعاش نہ تھا۔ آج اس کی تمنا پوری ہوئی۔

ساری رات باتوں میں گزر گئی۔ دونوں ہی کو اپنی اپنی چھ مہینے کی داستان کہنی تھی۔ رما نے اپنا وقار جمانے کے لیے اپنی خستہ حالی کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا۔ جالپا نے اپنی داستان میں اپنی تکلیفوں کا ذکر تک نہ کیا۔ وہ ڈرتی تھی انہیں رنج ہو گا، لیکن رما کو اسے رلانے میں مزا آ رہا تھا۔ وہ کیوں بھاگا۔ کس کے لیے بھاگا۔ یہ سارا قصہ اس نے دردناک آواز میں سنایا اور جالپا نے سسک سسک کر سنا۔ وہ اپنی لفاظی سے اس پر رعب جمانا چاہتا تھا۔ اب تک ہر ایک معاملے مین اس کی ہار ہوتی تھی۔ جو بات اسے محال معلوم ہوتی تھی، اسے جالپا نے چٹکیوں میں پورا کر دیا۔ شطرنج والے واقعہ کو وہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کر سکتا تھا، لیکن وہاں بھی جالپا ہی غالب رہی۔ پھر اس کے لیے اس کے سوا اور کیا تدبیر رہ گئی تھی، کہ اپنی تکلیفوں کو رائی کا پربت بنا کر دکھائے۔

جالپا نے سسک کر کہا۔ تم نے یہ ساری کڑیاں جھیلیں اور مجھ کو ایک خط بھی نہ لکھا۔ کیوں لکھتے ہم سے ناتا ہی کیا تھا۔ منہ دیکھے کی محبت تھی۔ آنکھ اوٹ پہاڑ اوٹ۔

رما نے حیرت ناک لہجہ میں کہا۔ ''یہ بات نہیں جالپا۔ دل پر جو کچھ گزرتی تھی۔ دل ہی جانتا ہے لیکن لکھنے کا منہ بھی ہو۔ جب روپوش ہو کر گھر سے بھاگا تو اپنا قصہ غم کیا لکھنے بیٹھتا۔ میں نے تو سوچ لیا تھا۔ جب تک خوب روپے نہ کما لوں گا ایک لفظ بھی نہ لکھوں گا۔''

جالپا نے چشم پر آب میں طنز بھر کر کہا۔ ''ٹھیک ہی تھا۔ روپے آدمی سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔ ہم تو روپے کے یار ہیں۔ تم چاہے چوری کرو۔ ڈاکہ ڈالو۔ جھوٹی گواہیاں دو۔ یا بھیک مانگو کسی طرح روپے لاؤ۔ تم نے تو میری عادت کو کتنا ٹھیک سمجھا ہے کہ واہ!''

رما نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''نہیں نہیں۔ جالپا یہ بات نہیں تھی۔ میں یہی سوچتا تھا کہ ان پھٹے حالوں جاؤں گا کیسے۔ سچ کہتا ہوں مجھے سب سے زیادہ خوف تمہی سے لگتا تھا۔ سوچتا تھا۔ تم مجھے کتنا دغاباز مکار اور کچا دھاگا سمجھ رہی ہوگی۔ شاید میرے دل میں یہ خیال تھا کہ روپے کی تھیلی دیکھ کر تمہارا دل کچھ تو نرم ہوگا۔''

جالپا نے اسی ستم ظریفانہ لہجہ میں کہا۔ ''تو تمہارا وہ خیال تھا۔ میں شاید اس تھیلی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔ آج مجھے معلوم ہوگیا۔ تم مجھے کتنا خود غرض سمجھتے ہو۔ اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں۔ ساری خطا میری ہے۔ اگر میں بھلی ہوتی، تو آج کا دن بھی کیوں آتا۔ جو آدمی تیس چالیس روپے مہینہ کا نوکر ہو، اس کی بیوی اگر دو چار روپے روز خرچ کرے، ہزار دو ہزار روپے کے زیور پہنے تو وہ اپنی اور اپنے شوہر کی تباہی کا سامان کر رہی ہے۔ اگر تم نے مجھے اتنا بندۂ زر سمجھا تو کوئی بے انصافی نہیں کی، مگر ایک بار جس آگ میں جل چکی، اس میں پھر نہ کودوں گی۔ ان چند مہینوں میں میں نے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کیا ہے اور جو کچھ باقی ہے وہ آخری دم تک کرتی رہوں گی۔ یہ میں نہیں کہتی کہ عیش و آرام سے میرا جی بھر گیا یا گہنے کپڑے سے میں اوب گئی یا سیر تماشا سے مجھے نفرت ہوگئی۔ یہ ساری تمنائیں جوں کی توں ہیں۔ اگر تم اپنی قوت بازو سے اپنی جانفشانی سے

انہیں پورا کر سکو تو کیا کہنا، لیکن نیت کھوٹی کر کے یا ضمیر کا خون کر کے ایک لاکھ بھی لاؤ تو میں اسے ٹھکرا دوں گی۔ جس وقت مجھے معلوم ہوا کہ تم پولیس کے گواہ بن گئے ہو۔ مجھے اتنا رنج ہوا کہ دیبی دادا کو ساتھ لے کر تمہارے بنگلے تک گئی۔ اسی دن تم باہر چلے گئے تھے۔ میں اتنے آدمیوں کا خون اپنی گردن پر نہیں لینا چاہتی۔ تمہیں بیان واپس لینا پڑے گا۔''

رما فکر مند ہو کر بولا: ''جب سے تمہارا خط ملا میں اسی معاملہ پر غور کر رہا ہوں، لیکن بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ایک بات کہہ کر مکر جانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔''

''بیان تو بدلنا ہی پڑے گا۔''

''آخر کیسے؟''

''مشکل کیا ہے۔ جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ میونسپلٹی تمہارے اوپر کوئی مقدمہ نہیں چلا سکتی تو پھر کس بات کا ڈر؟''

''ڈر نہ ہو۔ جھینپ بھی تو کوئی چیز ہے۔ جس منہ سے ایک بات کہی، اسی منہ سے مکر جاؤں۔ یہ تو مجھ سے نہ ہو گا۔ پھر مجھے کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔ آرام سے زندگی بسر ہو گی۔ مجھ میں گلی گلی ٹھوکر کھانے کا بوتا نہیں ہے۔''

جالپا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی، انسان کتنا خود غرض ہوتا ہے۔

رما نے پھر پہلو بدلا: ''اور کچھ میری شہادت پر ہی تو سارا فیصلہ نہیں ہوا جاتا۔ میں بدل بھی جاؤں تو پولیس نہایت آسانی سے کوئی دوسرا گواہ کھڑا کر دے گی۔ ملزموں کی جان تو کسی طرح نہیں بچ سکتی ہاں! میں مفت میں مارا جاؤں گا۔''

جالپا نے ترش ہو کر کہا: ''کیسی بے شرمی کی باتیں کرتے ہو جی۔ کیا تم اتنے گئے گزرے ہو کہ تمہیں اپنی روٹیوں کے لیے دوسروں کا گلا کاٹنا پڑے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے مزدوری کرنا، بھوکوں مر جانا منظور ہے، لیکن کسی کا برا چیت کر میں جنت کا راج بھی نہیں لے سکتی۔''

رما چڑ کر بولا: ''تو کیا تم چاہتی ہو کہ میں یہاں قلی گیری کروں؟''

جالپا: ''نہیں میں یہ نہیں چاہتی، لیکن اگر قلی گیری بھی کرنی پڑے تو وہ خون چپڑی ہوئی روٹیاں کھانے سے کہیں بڑھ کر ہے۔''

رمانے تحمل کے ساتھ کہا: ''جالپا تم مجھے جتنا کمینہ سمجھتی ہو، اتنا کمینہ میں نہیں ہوں۔ بری بات ہر ایک کو بری لگتی ہے۔ مجھے بھی اس بات کا رنج ہے کہ میرے ہاتھوں اتنے آدمیوں کا خون ہو رہا ہے، لیکن حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ تم مجھے کیوں اس اونچائی پر چڑھانا چاہتی ہو، جہاں پر پہنچنے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔''

جالپا نے پر ملامت تبسم کے ساتھ کہا: ''جس آدمی میں خون کرنے کی طاقت ہو، اس میں خون نہ کرنے کی طاقت کا نہ ہونا تعجب کی بات ہے۔ جس میں دوڑنے کی طاقت ہو، اس میں کھڑے ہونے کی طاقت نہ ہو،، اسے کون باور کرے گا۔ جب ہم کوئی ارادہ کر لیتے ہیں تو طاقت آپ ہی آپ آ جاتی ہے۔ تم یہ طے کر لو کہ تمہیں بیان بدلنا ہے۔ بس اور ساری باتیں آپ ہی آپ آ جائیں گی۔''

رما سر جھکائے سنتا رہا۔

جالپا نے پھر اسی رو سے کہا: ''اگر تمہیں یہ پاپ کی کھیتی کرنی ہے تو مجھے آج ہی

یہاں سے رخصت کر دو۔ میں آج منہ پر کالک لگا کر چلی جاؤں گی۔ پھر تمہیں دق کرنے نہ آؤں گی۔ تم زندگی کے مزے اٹھانا۔ میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھر لوں گی۔''

رما کے دل پر کچھ چوٹ لگی۔ سر کھجلا کر بولا: ''چاہتا تو میں بھی ہوں کہ کسی طرح میری گلوخلاصی ہو جائے۔''

جالپا نے جواب دیا: ''تو پھر کرتے کیوں نہیں؟ اگر تمہیں کہتے شرم آتی ہے تو میں کہوں؟ یہی اچھا ہو گا، میں تمہارے ساتھ چلی چلوں گی اور تمہارے چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جالپا میں ان لوگوں کو سمجھا لوں گا۔''

جالپا نے مزید اطمینان کے لیے پوچھا: ''تو وعدہ کرتے ہو، اپنا بیان بدل دو گے؟''

رما نے سرگرمی سے کہا: ''کہتا تو ہوں۔''

''میرے کہنے سے یا اپنے دل سے؟''

''تمہارے کہنے سے نہیں اپنے دل سے۔ مجھے خود ایسی باتوں سے نفرت ہے۔ کچھ جھجک تھی وہ تم نے نکال دی۔''

پھر اور باتیں ہونے لگیں۔ کیسے پتا چلا کہ رما نے روپے خرچ کر ڈالے۔ روپے ادا کیسے ہو گئے؟ رتن پر کیا گزری؟ گوپی کیوں اتنی جلد بھاگ گیا۔ دونوں کچھ پڑھ رہے ہیں یا اسی طرح آوارہ پھر رہے ہیں؟ اماں تو بہت نہیں روتی ہیں؟ دادا کے کیا رنگ ڈھنگ ہیں۔ یہ ساری باتیں ہوئیں۔ پھر زندگی کے منصوبے باندھے جانے لگے۔

جالپا نے کہا: ''چلو وہیں رتن سے تھوڑی زمین لے لیں اور کھیتی باڑی کریں؟''

رمانے کہا: ''اس سے کہیں اچھا ہے کہ یہاں چائے کی دکان کھول لیں۔''

اس پر دونوں میں مباحثہ ہوا۔ آخر رما کو ہار ماننا پڑی۔ یہاں رہ کر وہ گھر کی دیکھ بھال نہ کرسکتا تھا۔ بھائیوں کی نگرانی نہ کرسکتا تھا اور ماں باپ کی کچھ خدمت نہ کرسکتا تھا۔ آخر گھر والوں کے ساتھ بھی تو اس کا کچھ فرض ہے۔ رما لاجواب ہو گیا۔

(40)

رما منہ اندھیرے بنگلہ پہنچا۔ کسی کو شبہ نہ ہوا۔

ناشتہ کر کے رمانا تھ نے خط صاف کیا اور داروغہ کے پاس پہنچا۔ تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ داروغہ نے پوچھا: ''خیریت تو ہے نوکروں نے کوئی شرارت تو نہیں کی؟''

رمانے کھڑے کھڑے جواب دیا: ''نوکروں نے شرارت نہیں کی۔ ہاں آپ نے اور آپ کے افسروں اور ماتحتوں نے مجھے چرکا دیا ہے۔''

داروغہ نے کچھ پریشان ہوکر پوچھا: ''آخر بات کیا ہے کچھ تو کہیے؟''

رما: ''بات یہی ہے کہ میں اس معاملے میں اب مطلق شہادت نہ دوں گا۔ آپ لوگوں نے مجھے دغا دی اور وارنٹ کی دھمکی دے کر مجھے شہادت پر مجبور کیا۔

اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے اوپر کسی قسم کا الزام نہیں ہے۔ میں پولیس کی طرف سے شہادت نہیں دینا چاہتا۔ میں آج جج صاحب سے صاف کہہ دوں گا۔''

داروغہ نے اسے مرعوب کرنے کی کوشش کر کے کہا: ''آپ نے خود غبن تسلیم کیا تھا۔''

رما: ''وہ میزان کی غلطی تھی۔ غبن نہ تھا۔''

''یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''اس سے آپ کو کوئی بحث نہیں۔ میں شہادت نہ دوں گا۔ جن تاریخوں کا یہ وقوعہ ہے، ان تاریخوں میں الہ آباد میں تھا۔ میونسپل آفس میں میری حاضری درج رجسٹر ہے۔''

داروغہ نے اس معاملہ کو ہنسی میں اڑا کر کہا: ''اچھا صاحب پولیس نے آپ کو دھوکہ دیا، لیکن اس کا خاطر خواہ انعام دینے کو حاضر ہے۔ کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔ موٹر پر بیٹھے سیر کرو گے۔ خفیہ پولیس کی کوئی جگہ مل گئی تو چین ہی چین ہے۔ سوچو سرکار کی نظروں میں کتنا رسوخ بڑھ گیا۔ یوں مارے مارے پھرتے۔ یوں کہو کہ تمہاری ترقی کا دروازہ کھل گیا۔ اچھی کارگزاری دکھائی تو ایک دن رائے بہادر ہو جاؤ گے۔ تمہیں ہمارا احسان ماننا چاہیے اور آپ الٹے خفا ہوتے ہیں۔''

رما پر اس کچھ اثر نہ ہوا۔ بولا: ''میں ایسی ترقی سے درگزرا۔ وہ آپ ہی کو مبارک ہو۔''

اتنے میں ڈپٹی اور انسپکٹر دونوں آ پہنچے۔ رما کو دیکھ کر انسپکٹر صاحب نے فرمایا: ''ہمارے بابو صاحب تو آج پہلے ہی تیار بیٹھے ہیں۔ بس آج کی کارگزاری پر وارا

نیارا ہے۔"

رما: "جی ہاں آج وارا نیارا کر دوں گا۔ اتنے دنوں تک آپ لوگوں کے اشاروں پر چلا۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر چلوں گا۔"

انسپکٹر نے داروغہ کا منہ دیکھا۔ داروغہ نے ڈپٹی کا منہ دیکھا۔ "یہ لونڈا کیا کہتا ہے؟" انسپکٹر صاحب نے استعجاب سے کہا۔ "کیا معاملہ ہے۔ حلف سے کہتا ہوں آپ کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔"

رما: "میں نے اپنا بیان تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بے گناہوں کا خون نہیں کرنا چاہتا۔"

انسپکٹر نے اسے نگاہ ترحم سے دیکھ کر کہا: "آپ بے گناہوں کا خون نہیں کر رہے ہیں۔ صاحب اپنی تقدیر کی عمارت کھڑی کر رہے ہیں۔ حلف سے کہتا ہوں ایسے موقعے بہت کم آدمیوں کو ملتے ہیں۔ آج کیا بات ہوئی کہ آپ خفا ہو گئے۔ آپ کو کچھ معلوم ہوا داروغہ جی! اگر کسی نے آپ کے مزاج کے خلاف کوئی حرکت کی ہو تو اس کی گوشمالی کیجیے۔"

داروغہ: "میں ابھی جا کر تحقیق کرتا ہوں۔"

رما: "آپ تکلیف نہ کریں۔ مجھے کسی سے شکایت نہیں ہے۔ میں اپنے فائدے کے لیے اپنے ضمیر کا خون نہیں کرنا چاہتا۔"

ایک منٹ سناٹا رہا۔ کسی کو کوئی بات نہ سوجھی۔ داروغہ کوئی دوسرا چکمہ سوچ رہے تھے۔ انسپکٹر صاحب کوئی دوسری ترغیب۔

دفعتاً ڈپٹی صاحب نے کہا: "رما بابو یہ اچھا بات نہ ہوگا۔"

رمانے دلیری کے ساتھ کہا: ''آپ کے لیے نہ ہوگا، میرے لیے تو سب سے اچھی یہی بات ہے۔''

ڈپٹی: ''نہیں آپ کے لیے اس سے برا دوسرا بات نہیں ہے۔ ہم آپ کو چھوڑے گا نہیں۔ تم کو ایسا لیسن دے گا کہ تم زندگی بھر نہ بھولے گا۔ آپ کو وہی گواہی دینا ہوگا جو پہلے دے چکا ہے۔ اگر کچھ بھی گول مال کیا تو ہم تمہارے ساتھ دوسرا برتاؤ کرے گا۔ ایک رپورٹ میں تم یوں (کلائیوں کو نیچے اوپر رکھ کر) چلا جائے گا۔''

رما سہم اٹھا۔ اس تخویف نے اسے لرزہ براندام کر دیا۔ کہیں یہ سب کوئی جھوٹا مقدمہ چلا کر اسے پھنسا نہ دیں۔ تو کون اس کی فریاد سنے گا۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ ڈپٹی صاحب جو اخلاق اور مروت کے پتلے بنے ہوئے تھے، یک بارگی اتنے طیش میں آ جائیں گے۔ پھر بھی خودداری کے ساتھ بولا: ''آپ مجھ سے جبراً شہادت دلوائیں گے؟''

ڈپٹی نے پیر پٹک کر کہا: ''ہاں جبراً دلائے گا۔''

رما: ''واہ اچھی دل لگی ہے۔''

ڈپٹی: ''تم نے ابھی پولیس کی چال نہیں دیکھی ہے۔ ہم ابھی دو گواہ دے کر تم پر بغاوت کا کیس چلا سکتا ہے۔ بس چلا جائے گا سات سال کے لیے۔ چکی پیستے پیستے ہاتھ میں چھالے پڑ جائیں گے۔ یہ چکنا چکنا منہ نہیں رہے گا۔''

رما جیل سے ڈرتا تھا۔ جیل کی زندگی کے خیال سے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ جیل ہی کے خوف سے اس نے یہ شہادت دینی منظور کی

تھی۔ وہی خوف اس وقت بھی اس کے دل میں رعشہ پیدا کرنے لگا۔ ڈپٹی نفسیات کا ماہر تھا۔ آسن کا پتا پا گیا۔ اسی لہجہ میں بولا: ''حلوہ پوری نہیں پائے گا، دھول ملا ہوا آٹا کا روٹی۔ گوبھی کے سڑے ہوئے پتوں کا ساگ کھانے کو پائے گا۔ چار مہینہ بھی کال کوٹھڑی میں گیا تو تم بچ نہیں سکتا۔ وہیں مر جائے گا۔ بات بات پر وارڈر گالی دے گا۔ جوتوں سے پیٹے گا۔ تم سمجھتا کیا ہے؟''

رما کے چہرے کا رنگ فق ہونے لگا۔ اپنی کمزوری پر اسے اتنا ملال ہوا کہ رو پڑا۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا: ''آپ لوگوں کی یہی خواہش ہے تو یہی سہی۔ بھیج دیجیے جیل۔ مر ہی تو جاؤں گا۔ گلا تو چھوٹ جائے گا۔ جب آپ یہاں تک مجھے تباہ کرنے پر آمادہ ہیں تو میں بھی مرنے کو تیار ہوں۔ جو کچھ ہونا ہوگا، ہو جائے گا۔''

اس کا دل ضعف کی اس حالت کو پہنچ گیا تھا۔ جب ذرا سی ہمدردی، ذرا سی شفقت، سینکڑوں دھمکیوں سے زیادہ کارگر ہو جاتی ہے۔ انسپکٹر صاحب نے اس کی نبض پہچان لی۔ اس کی حمایت کرتے ہوئے بولے:

''حلف سے کہتا ہوں، آپ لوگ آدمی کو پہچانتے تو ہیں نہیں۔ لگتے ہیں رعب جمانے۔ اس قسم کی شہادت دینا ہر ایک ذی فہم آدم کو ناگوار گزرے گا۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ بابو کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم منحرف ہو جائیں گے۔ آپ لوگ اپنا کام کیجیے۔ بابو صاحب کی طرف سے مطمئن رہیے۔ میں ان کا ذمہ لیتا ہوں۔''

اس نے رما کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ''آپ ڈپٹی صاحب کی گیدڑ بھبکیوں میں آ گئے۔ آیئے میرے ساتھ چلیے۔ ایسے ایسے ریکارڈ سناؤں گا طبیعت پھڑک اٹھے گی۔''

رما نے روٹھے ہوئے لڑکے کی طرح ہاتھ چھڑا کر کہا: ''مجھے دق نہ کیجیے۔ انسپکٹر صاحب! اب تو مجھے جیل خانے میں مرنا ہے۔''

انسپکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ''ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو۔ بھائی جان جیل خانے میں مریں آپ کے دشمن۔''

ڈپٹی نے تسمہ بھی باقی نہ چھوڑنا چاہا۔ اس طرح بولا گویا رما سے کبھی جان پہچان نہیں: ''صاحب ہم تمہارے ساتھ سب طرح کا سلوک کرنے کو تیار ہے، لیکن جب تم ہمارا جڑ کھودو گے تو ہم بھی اپنی کاروائی کرے گا۔ ضرور سے کرے گا۔ کبھی چھوڑ نہیں سکتا۔''

اسی وقت سرکاری ایڈووکیٹ اور بیرسٹر موٹر سے اترے۔

(41)

رتن اپنے خطوں میں جالپا کو تشفی دیتی رہتی تھی، مگر اپنے بارے میں کچھ نہ لکھتی تھی۔ جو خود ہی مبتلائے غم ہو، اسے اپنی مصیبت کی کہانی کیا سنائے۔ جس نے روپوں کی کبھی کوئی حقیقت نہ سمجھی وہ اس ایک مہینہ میں روٹیوں کی محتاج ہو رہی تھی۔ پہلے بھی اس کی زندگی پر عافیت نہ تھی، لیکن اسے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ مریل گھوڑے پر سوار ہو کر بھی سفر پورا کیا جا سکتا ہے۔ اگر سڑک اچھی ہو، نوکر چاکر اور کھانے پینے کا سامان ساتھ ہو، گھوڑا بھی تیز ہو تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ رتن کی حالت

بھی اسی سوار کی سی تھی۔ اسی سوار کی طرح وہ آہستہ آہستہ زندگی کے مرحلے طے کرتی جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ گھوڑے پر جھنجلاتی ہوگی۔ دوسرے سواروں کو آگے بڑھتا دیکھ کر اسے خواہش ہوتی ہوگی کہ اس کا گھوڑا بھی اتنا ہی تیز خرام ہوتا، لیکن وہ رنجیدہ نہ تھی۔ اپنے نصیبوں کو نہ روتی تھی۔ وہ گائے کی طرح تھی جو ایک پیلی سی پگھیا کے بندھن میں پڑ کر اپنی ناند کے بھوسے کھلی میں مگن رہتی ہے۔ سامنے ہرے بھرے میدان ہیں، اس میں اشتہا انگیز گھاسیں لہرا رہی ہیں، مگر رسی توڑ کر کبھی ادھر نہیں جاتی۔ اس کی اس رسی اور لوہے کی زنجیر میں کوئی فرق نہیں ہے۔

عالم شباب میں محبت کی اتنی پیاس نہیں ہوتی جتنی خودنمائی کی یہ پیاس بعد کو آتی ہے۔ رتن کو خودنمائی کے سبھی سامان ملے ہوئے تھے۔ اس کا شباب میں مست دل اپنی زیبائش اور آرائش میں خوش تھا۔ ہنسی مذاق، سیر و تفریح، کھانا پینا یہی اس کی زندگی تھی۔ اس سے گہرے پانی میں اسے جانے کی نہ خواہش تھی، نہ غرض۔ فارغ البالی بہت کچھ رنج و محن کا ازالہ کرتی رہتی ہے۔ اس کے پاس اتنی مصیبتوں کو بھلانے کے لیے کتنے ہی سامان ہیں۔ سینما ہے۔ سیر و سیاحت ہے۔ کتابوں کا معاملہ ہے۔ سرود و ستار ہے۔ پالتو جانور ہیں، لیکن افلاس کو بھلانے کا انسان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ روئے، اپنی تقدیر کو کوسے اور دنیا سے مایوس ہو کر خودکشی کر لے۔ رتن کی تقدیر نے پلٹا کھایا تھا۔

اور یہ ہوا اپنے ہی ہاتھوں۔ پنڈت جی ان آدمیوں میں تھے، جنہیں موت کی فکر نہیں ہوتی۔ انہیں کسی طرح یہ خیال ہو گیا تھا کہ دائم المریض آدمی اگر احتیاط اور پرہیز سے رہے تو اس کی عمر دراز ہو سکتی ہے۔ وہ پرہیز اور احتیاط کے دائرے سے

باہر کبھی نہیں جاتے تھے۔ پھر موت کو ان سے کیا دشمنی تھی۔ جو خواہ مخواہ ان کے پیچھے پڑتی۔ اپنی وصیت لکھنے کا خیال انہیں اس وقت آیا جب قریب المرگ ہوئے، لیکن رتن وصیت کا نام سنتے ہی اتنی پریشان اور غمگین ہوئی کہ پنڈت جی نے اسے اس وقت ملتوی کرنا ہی مناسب سمجھا۔ تب سے انہیں اتنا ہوش نہ آیا کہ وصیت لکھواتے۔

پنڈت جی کی وفات کے بعد رتن دنیا سے اس قدر بیزار ہوگئی کہ اسے کسی بات کی بھی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ یہ وہ موقع تھا جب اسے خاص طور پر ہوشیار رہنا چاہیے تھا۔ گویا دشمنوں نے اسے گھیر رکھا ہو، مگر اس نے سب کچھ منی بھوشن پر چھوڑ دیا اور اس منی بھوشن نے رفتہ رفتہ اس کا سارا اثاثہ ہضم کر لیا۔ ایسا سوانگ بھرا کہ سادہ لوح رتن کو اس کی فتنہ انگیزیوں کی بھنک تک نہ ملی۔ پھندا جب خوب کس گیا تو اس نے ایک دن آ کر رتن سے کہا:

''آج بنگلہ خالی کرنا ہوگا۔ میں نے اسے بیچ دیا ہے۔''

رتن نے تیز ہو کر کہا: ''میں نے تو تم سے کہا ابھی بنگلہ نہ بیچوں گی۔''

منی بھوشن نے ظاہر داری کا پردہ اتار پھینکا اور بولا: ''آپ میں یہ بہت بڑا عیب ہے کہ آپ ایک بات کہہ کر اسے بھول جاتی ہیں۔ اسی کمرے میں میں نے آپ سے یہ ذکر کیا تھا اور آپ نے حامی بھری تھی۔ جب میں نے بنگلہ بیچ دیا تو آپ یہ رنگ لائیں۔ یہ بنگلہ آج خالی کرنا ہوگا اور آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''میں ابھی یہیں رہنا چاہتی ہوں۔''

''میں آپ کو یہاں نہ رہنے دوں گا۔''

''میں تمہاری لونڈی نہیں ہوں۔''

''آپ کی خبر گیری کا بار مجھ پر ہے۔اپنے خاندان کے حفظ و وقار کے لیے میں آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

رتن نے ہونٹ چبا کر کہا: ''میں اپنی عصمت کی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔ تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔میری اجازت کے بغیر تم کوئی چیز فروخت نہیں کر سکتے۔''

منی بھوشن نے گولی سی ماری: ''آپ کا اس گھر پر اور چچا صاحب کی جائیداد پر کوئی حق نہیں ہے۔ یہ میری ملکیت ہے۔آپ مجھ پر صرف گزارے کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔''

رتن نے حیرت میں آ کر کہا: ''تم کچھ بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو؟''

منی بھوشن نے بے دردانہ انداز میں کہا: ''میں اتنی بھنگ نہیں کھاتا کہ بے سر پیر کی باتیں کرنے لگوں۔آپ تو پڑھی لکھی ہیں۔ایک بڑے وکیل کی بیوی تھیں۔ قانون کی بہت سی باتیں جانتی ہوں گی۔مشترکہ خاندان کی بیوہ کا شوہر کی جائیداد پر کوئی حق نہیں ہوتا۔چچا صاحب اور میرے والد میں کبھی علیحدگی نہیں ہوئی، اگر چچا صاحب اپنی جائیداد آپ کو دینا چاہتے تو کوئی وصیت ضرور لکھ جاتے اور اگر چہ قانوناً اس وصیت کی کوئی وقعت نہ ہوتی، مگر ہم اس کا احترام کرتے۔مرحوم کا کوئی وصیت نہ لکھنا ثابت کر رہا ہے کہ وہ آپ کے ساتھ کوئی خاص سلوک نہ کرنا چاہتے تھے۔آج آپ کو بنگلہ خالی کرنا ہوگا۔دوسرے سامان بھی نیلام کر دیے جائیں گے۔آپ کی مرضی ہو میرے ساتھ چلیں یا یہیں رہیں۔یہاں رہنے کے لیے

آپ کو دس پندرہ روپے کا مکان کافی ہو گا۔ گزارا کے لیے پچاس روپے مہینہ کا انتظام میں نے کر دیا ہے۔ کل مطالبات ادا کرنے کے بعد اس سے زیادہ گنجائش ہی نہیں ہے۔''

رتن نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر وہ مفلوج سی بیٹھی رہی۔ پھر موٹر منگوائی اور سارا دن وکیلوں کے پاس دوڑتی رہی۔ کتنے ہی وکیلوں سے پنڈت جی کا یارانہ تھا۔ ہر ایک نے ان کی حالت سن کر رنج کیا اور وکیل صاحب کے وصیت نہ لکھ جانے پر تعجب کرتے رہے۔ اب اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا۔ وہ یہ ثابت کرے کہ وکیل صاحب اور ان کے بھائی میں علیحدگی ہو گئی تھی اور یہ ثابت کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ تو رتن کا اس جائیداد پر قبضہ ہو جائے گا، ورنہ اس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔

رتن شام کو گھر لوٹ آئی۔ اس نے فیصلہ یا جو کچھ میرا نہیں ہے، اسے لینے کے لیے میں جھوٹ کا سہارا نہ لوں گی۔

اتنے دنوں میں وہ اپنے آپ کو اس گھر کی مالکن سمجھتی رہی۔ یہ کتنی بڑی غلطی تھی۔ شوہر کی زندگی میں جو لوگ اس کا منہ تاکتے تھے، وہ آج اس کے مخدوم بنے ہوئے ہیں۔ یہ ذلت رتن جیسی خوددار عورت کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ مانا کمائی پنڈت جی کی تھی، لیکن یہ گاؤں تو اسی نے خریدا تھا۔ کئی مکان تو اس کے اپنے ہی ہاتھوں سے بنوائے تھے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہ کیا تھا کہ ایک دن یہ جائیداد اس کی زندگی کی کفیل ہو گی۔ اسے اس جائیداد کے خریدنے میں اس کی ترقی اور تنظیم میں وہی مسرت ہوتی تھی، جو ماں اپنی اولاد کو پھلتے پھولتے

دیکھ کر حاصل کرتی ہے۔ اس میں غرض کا شائبہ بھی نہ تھا۔ محض اپنے پن کا غرور تھا۔ وہی محبت تھی، لیکن شوہر کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے پالے اور گود کے کھلائے ہوئے بچے بھی اس کی گود سے چھین لیے گئے۔ اس کا ان پر اب کوئی اختیار نہیں۔ اگر وہ جانتی کہ ایک دن یہ مسئلہ ضرور پیش ہوگا تو وہ چاہے روپے کو لٹا دیتی، خیرات کرتی، مگر ملکیت کی میخ اپنے سینے میں نہ لگاتی۔ کیا گرمیوں میں وہ منصوری یا نینی تال نہ جا سکتی تھی۔ ایک کیا دو چار نوکر اور نہ رکھے جا سکتے تھے۔ اگر وہ زیور ہی بنواتی تو ایک ایک مکان کی قیمت کا ایک ایک زیور بنوا سکتی تھی، مگر اس نے نفس کو کبھی پاؤں نہ پھیلانے دیا۔ کیا اس نفس کشی کا یہی صلہ تھا۔ جو چیز کل تک اس کی تھی، آج اس کی طرف وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی۔ کل تک وہ دوسروں کی پرورش کرتی تھی، آج وہ خود دوسروں کی محتاج ہے۔

دفعتاً اس کے دماغ میں ایک تغیر ہوا۔ وہ کیوں اپنے آپ کو بے کس سمجھے۔ کیوں غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ دنیا میں لاکھوں ہی عورتیں دیدہ ریزی کر کے اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔ کیا وہ کپڑے نہیں سی سکتی تھی۔ کسی چیز کی چھوٹی موٹی دکان نہیں رکھ سکتی۔ لڑکوں کو بھی پڑھا سکتی ہے۔ یہی تو ہوگا۔ لوگ ہنسیں گے، مگر اسے ہنسی کی کیا پروا۔ یہ اس کی ہنسی نہیں ہے۔ اپنی قوم کی رسم و رواج کی ہنسی ہے۔

شام کو دروازے پر کئی ٹھیلے والے آ گئے۔ منی بھوشن نے آ کر کہا: ''میں نے ایک مکان طے کر لیا ہے۔ آپ جو چیزیں کہیں لدوا کر بھیج دوں۔''

رتن نے بے اعتنائی کے ساتھ کہا: ''مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں، نہ تم میرے

لیے کوئی مکان لو۔ جس پر میرا کوئی اختیار نہیں، وہ میں ہاتھ سے بھی نہیں چھوتی۔ میں اپنے گھر سے لے کر کچھ نہیں آئی تھی، اسی طرح لوٹ جاؤں گی۔''

منی بھوشن نے شرمندہ ہو کر کہا: ''آپ کا سب کچھ ہے۔ یہ آپ کیسے کہتی ہیں کہ آپ کا کچھ اختیار نہیں۔ آپ وہ مکان دیکھ لیں۔ میں تو سمجھتا ہوں، آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی؟''

رتن نے طنزیہ انداز سے کہا: ''اتنا بڑا مکان لے کر میں کیا کروں گی۔ میرے لیے ایک کوٹھڑی ہی کافی ہے، جو دو روپیہ میں مل جائے گی۔ سونے کے لیے زمین ہی ہے۔ احسان کا بوجھ سر پر جتنا ہی کم ہو، اتنا ہی اچھا۔''

منی بھوشن نے عاجزی سے کہا: ''آخر آپ چاہتی کیا ہیں؟ کچھ تو کہیے؟''

رتن نے جواب دیا: ''میں کچھ نہیں چاہتی۔ میں اس گھر کا ایک تنکا بھی اپنے ساتھ نہ لے جاؤں گی۔ جس چیز پر میرا کوئی اختیار نہیں، وہ میرے لیے ویسی ہی ہے جیسے کسی غیر کی چیز۔ تم ان چیزوں کے مالک ہوتے جاؤ میں ذرا بھی برا نہیں مانتی۔ رحم کی چیز نہ زبردستی لی جا سکتی ہے، نہ زبردستی دی جا سکتی ہے۔ دنیا میں ہزاروں بیوہ عورتیں پڑی ہوئی ہیں۔ میں بھی انہی میں سے ایک ہوں۔ میں بھی انہیں کی طرح مزدوری کروں گی اور نہ کر سکوں گی تو کسی گڈھے میں ڈوب مروں گی۔ جو اپنا پیٹ بھی نہ پال سکے، اسے زندہ رہ کر دوسروں کے اوپر بار بننے کا حق نہیں ہے۔''

یہ کہتی ہوئی رتن گھر سے نکلی اور دروازہ کی طرف چلی۔ منی بھوشن نے اس کا راستہ روک کر کہا۔ ''اگر آپ کی مرضی نہ ہو تو میں ابھی بنگلہ نہ بیچوں؟''

رتن نے جلتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ آنسوؤں کے امنڈے ہوئے سیلاب کو روک کر بولی:

''میں نے کہہ دیا اس گھر کی کسی چیز پر میرا دعویٰ نہیں ہے۔ میں کرائے کی لونڈی تھی۔ لونڈی کا گھر سے کیا تعلق۔ نہ جانے کس پاپی نے یہ قانون بنایا تھا۔ اگر ایشور کہیں ہے اور اس کے یہاں انصاف ہوتا ہے تو ایک دن اسی کے سامنے اس پاپی سے پوچھوں گی۔ کیا تیرے گھر میں ماں بہن نہ تھیں۔ تجھے اس کی توہین کرتے شرم نہ آئی؟ اگر میری زبان میں اتنی طاقت ہوتی کہ اس کی آواز سارے ملک میں پہنچ سکتی، تو میں اپنی بہنوں سے کہتی۔ بہنو! کسی مشترکہ خاندان میں شادی مت کرنا اور اگر کرنا تو جب تک اپنا گھر الگ نہ بنالینا، آرام کی نیند مت سونا۔ خاندان تمہارے لیے پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کا بستر ہے۔ تمہیں پار لے جانے والی کشتی نہیں، تمہیں نگل جانے والا جانور ہے۔''

شام ہو گئی تھی۔ گرد سے بھری ہوئی پھاگن کی ہوا چلنے والوں کی آنکھوں میں دھواں جھونک رہی تھی۔ رتن چادر سنبھالتی ہوئی سڑک پر چلی جارہی تھی۔ راستہ میں کئی پہچان کی عورتوں نے اسے ٹوکا، کئی نے اپنی موٹر روک لی اور اسے بیٹھنے کو کہا، مگر رتن کو ان کی ہمدردی تیر کی لگ رہی تھی۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی جالپا کے گھر جارہی تھی۔ آج اس کی اصلی زندگی کا آغاز ہوا تھا۔

ٹھیک دس بجے جالپا اور دیبی دین کچہری پہنچ گئے۔ تماشائیوں کی کافی بھیڑ تھی۔ اوپر کی گیلری تو بھری ہوئی تھی۔ ہزاروں آدمی سامنے کے میدان میں کھڑے تھے۔ جالپا اوپر گیلری میں جا بیٹھی۔ دیبی دین برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔

اجلاس پر جج کے ایک طرف اہلمد تھا۔ دوسری طرف پولیس کے کئی عملے کھڑے تھے۔ سامنے کٹہرے کے باہر دونوں طرف کے وکیل کھڑے مقدمہ پیش ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ ملزموں کی تعداد پندرہ سے کم نہ تھی۔ سب کٹہرے کی بغل میں زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سبھی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور پیروں میں بیڑیاں تھیں۔ کوئی لیٹا تھا۔ کوئی بیٹھا تھا۔ دو پنجے لڑا رہے تھے۔ دو میں کسی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ سبھی بشاش تھے...... مایوسی یا غم کا کسی کے چہرے پر نشان نہ تھا۔

گیارہ بجتے بجتے مقدمہ کی پیشی ہوئی۔ پہلے پولیس کی شہادتیں ہوئیں۔ آخر میں کوئی تین بجے رمانا تھ کچہری میں لایا گیا۔ تماشائیوں میں سنسنی پھیل گئی۔ کوئی تنبولی کی دکان سے پان کھاتا ہوا بھاگا۔ کسی نے اخبار کو مروڑ کر جیب میں رکھا اور اجلاس کی طرف دوڑا۔ جالپا بھی سنبھل کر بارجے میں کھڑی تھی۔ وہ چاہتی تھی ایک بار رما کی آنکھیں اٹھ جاتیں اور وہ اسے دیکھ لیتی، لیکن رما سر جھکائے کھڑا تھا۔ گویا آنکھیں اٹھاتے ڈر رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ رہا تھا۔ کچھ سہا ہوا گھبرایا ہوا اس طرح کھڑا تھا، گویا اسے کسی نے باندھ رکھا ہے اور بھاگنے کی راہ نہیں ہے۔ جالپا کا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ جیسے اس کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا ہے۔

رما کا بیان شروع ہوا۔ پہلا ہی جملہ سن کر جالپا کانپ اٹھی۔ دوسرے جملے نے اس کی تیوریوں پر بل ڈال دیئے۔ تیسرے جملے نے اس کے چہرے کا رنگ فق کر دیا اور چوتھا جملہ سنتا تھا کہ وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر پیچھے رکھی ہوئی کرسی پر گر پڑی، مگر پھر دل نہ مانا۔ جنگلے پر جھک کر ادھر کان ہی لگا دیئے۔ وہی پولیس کی سکھائی ہوئی شہادت تھی۔ جس کا خلاصہ وہ دیبی دین کے منہ سے سن چکی تھی۔ عدالت میں سناٹا چھا گیا۔ جالپا نے کئی بار کھانسا کہ شاید رما کی آنکھیں اب بھی اوپر اٹھ جائیں، لیکن رما کا سر اور بھی جھک گیا۔ معلوم نہیں اس نے جالپا کے کھانسنے کی آواز پہچان لی یا ندامت کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ اس کی آواز کچھ اور دھیمی ہو گئی۔

ایک خاتون نے جو جالپا کے پاس ہی بیٹھی تھی، ناک سکوڑ کر کہا: "جی چاہتا ہے کہ اس شیطان کے گولی مار دے۔ ایسے ایسے خود غرض لوگ بھی اس بدنصیب دیش میں پڑے ہیں، جو تھوڑے فائدے کے لیے بے گناہوں کا گلا دباتے بھی نہیں ہچکچاتے۔"

جالپا نے کوئی جواب نہ دیا۔

ایک دوسری خاتون نے، جو آنکھوں پر عینک لگائے ہوئے تھیں، تلملا کر کہا: "اس بدنصیب **ملک** کا ایشور ہی مالک ہے۔ گورنری تو لالہ کو کہیں مل نہیں جاتی۔ زیادہ سے زیادہ کلرکی مل جائے گی۔ اس کے لیے اپنا ایمان بیچے ڈالتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی نہایت کمینہ آدمی ہے۔"

تیسری عورت نے عینک والی دیوی سے مسکرا کر پوچھا: "آدمی تو فیشن ایبل اور پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ بھلا تم اسے پا جاؤ تو کیا کرو؟"

عینک والی نے جوش سے کہا: ''ناک کاٹ لوں، بس نکٹا بنا کر چھوڑ دوں۔''

''جانتی ہو، میں کیا کروں؟''

''نہیں، شاید گولی مار دو گی؟''

''نہیں گولی نہ ماروں۔ سر بازار کھڑا کر کے پانچ سو جوتے لگواؤں۔ چاند گنجی ہو جائے۔''

''تمہیں ذرا بھی رحم نہ آئے گا؟''

''یہ کچھ رحم ہے۔ اس کی پوری سزا تو یہ ہے کہ کسی اونچی پہاڑی سے دھکیل دیا جائے۔''

ایک ضعیفہ نے ان دیویوں کو ملامت کرتے ہوئے کہا: ''کیوں مفت میں منہ خراب کرتی ہو۔ یہ غریب نفرت کے قابل نہیں، رحم کے قابل ہے۔ دیکھتی نہیں ہو اس کا چہرہ کیسا زرد ہو گیا ہے؟ جیسے کوئی اس کا گلا دبائے ہوئے ہے۔ اپنی ماں یا بہن کو دیکھ لے تو ضرور رو پڑے گا۔ آدمی کا دل برا نہیں ہے۔ پولیس نے مار پیٹ کر سیدھا کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ایک ایک لفظ اس کے دل کو چیرتا ہوا نکل رہا ہے۔''

عینک والی خاتون نے طعنہ مارا: ''جب اپنے پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے، جبھی آہ نکلتی ہے۔''

جالپا اب وہاں نہ ٹھہر سکی۔ ایک ایک لفظ چنگاری کی طرح اس کے دل پر لگتا تھا۔ دل میں ایسا ابال آتا تھا کہ اسی وقت اٹھ کر کہہ دوں کہ یہ شخص بالکل جھوٹ بول رہا ہے۔ اور اسی وقت اس کا ثبوت دے دے۔ اس غصۂ جائز کو پوری

طاقت سے دبائے ہوئے تھی۔ اس کا ضمیر اس کے تحمل پر ہی نفرین کر رہا ہے۔ کیوں وہ اسی وقت ساری کیفیت بیان نہیں کر دیتی۔ پولیس اس کی دشمن ہو جائے گی، ہو جائے۔ عدالت کو تو کچھ خیال ہو گا۔ ممکن ہے غریبوں کی جان بچ جائے۔ کم سے کم عوام کو تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹی شہادت ہے۔ اس کے منہ سے ایک بار آواز نکلتے نکلتے رہ گئی۔

آخر وہ وہاں سے اٹھ کر باہر چلی آئی۔

دیبی دین اسے اترتے دیکھ کر برآمدے میں آیا اور رحمدرانہ لہجہ میں بولا: ''کیا گھر چلتی ہو بہو جی؟''

جالپا نے آنسوؤں کی یورش کو روک کر کہا: ''ہاں اب یہاں بیٹھا نہیں جاتا۔''

احاطہ سے باہر نکل کر دیبی دین نے جالپا کو تشفی دینے کے ارادے سے کہا: ''پولیس نے جسے ایک بار بوٹی سنگھا دی، اس پر کسی دوسری بات کا اثر نہیں ہو سکتا۔''

جالپا نے کچھ دیر جواب نہ دیا۔ کچھ دور تک دونوں خاموش چلتے رہے۔ یکایک جالپا نے کہا: ''کیوں دادا اب اور تو کہیں اپیل نہ ہو گی؟ قیدیوں کا یہیں فیصلہ ہو جائے گا؟''

دیبی دین اس سوال کا مطلب سمجھ گیا اور بولا: ''نہیں ہائی کورٹ میں اپیل ہو سکتی ہے۔''

پھر تھوڑی دیر تک دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ جالپا ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی اور بولی: ''دادا میرا جی چاہتا ہے آج جج صاحب سے مل کر سارا واقعہ

کہہ دوں۔ شروع سے جو کچھ ہوا، سب کچھ سناؤں۔ میں ثبوت دوں گی تب تو مانو گے۔''

دینی دین نے آنکھیں پھاڑ کر کہا: ''جج صاحب سے؟''

جالپا نے کہا: ''ہاں۔''

دینی دین آنکھیں پھاڑ کر بولا: ''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہو جی! حاکم کا واسطہ نہ جانے چت پڑے یا پٹ۔''

جالپا بولی: ''وہ کیا پولیس والوں سے کہہ نہیں سکتا کہ تمہارا گواہ فرضی ہے۔''

''کہہ تو سکتا ہے۔''

''تو آج میں اسی سے ملوں۔ مل تو لیتا ہے۔''

''چلو دریافت کریں گے، لیکن جوکھم کی بات ہے۔''

''کی جوکھم ہے بتاؤ؟''

''بھیا پر کہیں جھوٹی گواہی کا الجام لگا کر سجا کر دے تو؟''

''تو کچھ نہیں، جو جیسا کرے ویسا بھرے۔''

دینی دین نے جالپا کی اس بے دردی پر متحیر ہو کر کہا: ''ایک دوسرا کھٹکا بھی ہے۔ سب سے بڑا ڈر اسی کا ہے۔''

جالپا نے پوچھا: ''وہ کیا؟''

دینی دین: ''پولیس والے بے مروت ہوتے ہیں۔ کسی کی عزت اتار لینا تو ان کے لیے دل لگی ہے۔ جج صاحب پولیس کمشنر کو بلا کر یہ سب حال جرور کہیں گے۔ کمشنر سوچے گا یہی عورت سارا کھیل بگاڑ رہی ہے۔ اسی کو گرفتار کر لو۔ جج

انگریج ہوتا تو نڈر ہو کر پولیس کو تنبیہ کرتا۔ ہمارے بھائی تو ایسے مکدموں (مقدموں) پر منہ کھولتے ڈرتے ہیں کہ کہیں سرکار ان سے برا نہ مان جائے۔ جج صاحب پولیس کمشنر سے جرور کہیں گے۔ پھر یہ تو ہو گا کہ مکدمہ اٹھا لیا جائے۔ یہی ہو گا کہ کبھی نہ کھلنے پائے۔ کبھی کبھی کب گواہ بدلنے لگتا ہے تو پولیس والے اس کے ساتھ بری بدعت کرتے ہیں۔''

جالپا کو اپنی گرفتاری کا خوف نہ تھا، لیکن یہ خوف ضرور تھا کہ رما پر کہیں آفت نہ آ جائے۔ اس خوف نے اس کی ہمت پست کر دی۔ اس وقت ایک تکان معلوم ہوئی۔ گویا سینکڑوں میل کی منزل پار کر آئی ہو۔

کچھ دور اور چلنے کے بعد اس نے دیبی دین سے پوچھا: ''اب تو ان سے ملاقات نہ ہو سکے گی؟''

دیبی دین نے سر ہلا کر کہا: ''کسی طرح نہیں۔ پہرہ اور کڑا کر دیا جائے گا۔ چاہے وہ بنگلہ ہی چھوڑ دیا جائے اور اب ان سے ملاقات ہو ہی گئی تو کیا اب کسی طرح اپنا بیان بدل نہیں سکتے۔ دروگ (دروغ) حلفی میں پھنس جائیں گے۔''

کچھ دور اور چل کر جالپا نے کہا: ''میں سوچتی ہوں گھر چلی جاؤں۔ یہاں رہ کر اب کیا کروں گی؟''

دیبی دین نے پر درد نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا: ''نہیں نہیں بہو ابھی میں نہ جانے دوں گا۔ تم چلی جاؤ گی تو یہاں پل بھر بھی ہمارا جی نہ لگے گا۔ بڑھیا تو رو رو کر جان دے دے گی۔ ابھی یہاں رہو۔ دیکھو کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ بھیا کو میں اتنے کچے دل کا آدمی نہ سمجھتا تھا۔ نہ جانے لوگ کیسے سرکاری نوکری پر جان دیتے

ہیں۔ مجھے تو کوئی سو روپے بھی طلب دے تو نوکری نہ کروں۔ اپنے روزگار کی بات ہی دوسری ہے۔ اس میں آدمی کبھی تھکتا ہی نہیں۔ نوکری میں ت جہاں پانچ چھ گھنٹے ہوئے کہ بدن ٹوٹنے لگا۔ جھپکیاں آنے لگیں۔''

راستے میں اور کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ جالپا کا دل اپنی شکست ماننے کے لیے کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ وہ ناکام ہو کر ایک ناظر کی بے تعلقی سے اس تماشے کو دیکھنے پر قناعت نہ کر سکتی تھی۔ وہ اس تماشے میں شریک ہو کر اپنا پارٹ ادا کرنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔ کیا ایک بار پھر رما سے ملاقات ہو گی۔ اس کے دل میں ان آتشیں الفاظ کا ایک شعلہ سا دہک رہا تھا، جو وہ اس سے کہنا چاہتی تھی۔ اسے رما پر ذرا بھی رحم نہ آتا تھا۔ اس سے شمہ بھر بھی ہمدردی نہ ہوتی تھی۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی۔ تمہاری دولت اور تمہارا عہدہ تمہیں مبارک ہو۔ جالپا کی نظروں میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ جس نے ان حقیر چیزوں کے لیے اپنا ضمیر بیچ دیا، اسے میں انسان نہیں سمجھتی۔ تم انسان نہیں ہو، تم حیوان بھی نہیں ہو۔ نامرد ہو، رو سیاہ ہو۔

جالپا کا چہرہ فرط غضب سے چمک اٹھا۔ غرور سے اس کی گردن تن گئی۔ وہ شاید سمجھتے ہوں گے، جالپا جس وقت مجھے چھپے دار پگڑی باندھے گھوڑے پر سوار دیکھے گی، پھولی نہ سمائے گی۔ جالپا اتنی کور باطن نہیں ہے۔ تم گھوڑے پر نہیں آسمان پر اڑو، میری نظروں میں قاتل ہو۔ میں نے چلتے چلتے سمجھایا تھا۔ اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ جالپا تمہاری محتاج نہیں ہے۔

(43)

ایک مہینہ گزر گیا۔

جالپا کئی دن تک بہت بے قرار رہی۔ کئی بار جنون سا ہوا کہ سارا واقعہ کسی اخبار میں چھپوا دے، لیکن دل کی گہرائیوں میں چھپی ہوئی کوئی طاقت اس کی زبان بند کر دیتی تھی۔ رما کی طرف سے وہ بے تعلق ہو گئی تھی۔

اس کے اوپر اب اسے غصہ نہ آتا تھا، رحم بھی نہ آتا تھا۔ صرف ایک بے نیازی تھی۔ اس کے مر جانے کی خبر پا کر شاید اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آتے۔ ہاں اسے تقدیر کا ایک کھیل سمجھ کر تھوڑی دیر کے لیے رنجیدہ ہو جاتی۔ شادی کا وہ رشتہ باقی تھا۔ اس درمیان میں اس نے رما کو کئی بار اپنے مکان کے سامنے سے جاتے دیکھا۔ اس کی آنکھیں کسی کی تلاش کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ان آنکھوں میں کچھ شرم تھی۔ کچھ عذر تقصیر تھا، لیکن جالپا نے کبھی اس کی طرف آنکھ نا اٹھائی۔

وہ شاید اس وقت آ کر اس کے پیروں پر گر پڑتا تب بھی وہ اس سے مخاطب نہ ہوتی۔ رما کی اس نفرت انگیز خود غرضی نے جالپا کے دل کو مجروح کر دیا تھا۔ پھر بھی اس رشتۂ الفت کا نشان ابھی قائم تھا۔

رما کی محبت آمیز بے خودی، جسے دیکھ کر ایک دن وہ خوشی سے متوالی ہو جاتی تھی، کبھی کبھی اس کے باطن میں چھپی ہوئی تاریکی میں ایک غمناک ٹمٹماتی ہوئی شمع مزار کی طرح چمک اٹھتی، لیکن پھر اسی تاریکی اور غم کا پردہ پڑ جاتا۔

وہی جالپا، جو پہلے بات بات پر ضد کیا کرتی تھی، اب خدمت، ایثار اور حلیم کی

صورت بنی ہوئی تھی۔ جگو منع کرتی رہتی، پر وہ اندھیرے ہی میں سارے گھر میں جھاڑو لگا آتی۔ چوکا برتن کر ڈالتی۔ آٹا گوندھ کر رکھ دیتی۔ بڑھیا کو صرف روٹی بنانا باقی رہ جاتی۔ بڑھیا اس کو ٹھیل ٹھال کر رسوئی میں لے جاتی اور کچھ نہ کچھ کھلا دیتی۔ دونوں میں ماں بیٹی کی سی محبت ہو گئی تھی۔

مقدمہ کی کارروائیاں ختم ہو چلی تھیں۔ دونوں طرف کے وکیلوں کی بحث ختم ہو چکی تھی۔ صرف فیصلہ سنانا باقی تھا۔ آج اسی فیصلے کی تاریخ تھی۔ آج علی الصبح گھر کے کام دھندے سے فرصت پا کر جالپا روزانہ اخبار والے کی آواز پر کان لگائے بیٹھی تھی۔ گویا آج اس کی تقدیر کا فیصلہ ہونے والا ہے۔

اتنے میں دیبی دین نے اخبار لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ جالپا اخبار پر ٹوٹ پڑی اور آج کا فیصلہ پڑھنے لگی۔ فیصلہ کیا تھا ایک خیالی افسانہ تھا، جس کا ہیرو رما تھا۔

جج نے بار بار اس کی تو تعریف کی تھی۔ سارا مقدمہ اسی کے بیانات پر مبنی تھا۔

دیبی دین نے پوچھا: ''فیصلہ چھپا ہے؟''

جالپا نے اخبار پڑھتے ہوئے کہا: ''ہاں تو۔''

''کس کی سزا ہوئی؟''

''کوئی نہیں چھوٹا۔ ایک کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ پانچ کو دس دس سال کی اور آٹھ کو پانچ پانچ سال کی۔ پھانسی اسی ونیش کو ہو گی۔''

یہ کہہ کر اس نے اخبار پھینک دیا اور ایک لمبی سانس لے کر بولی: ''ان بیچاروں کے بال بچوں کا نہ جانے کیا حال ہو گا؟''

دینی دین نے سرگرمی سے کہا: ''تم نے کس دن مجھے یہ سب کچھ بتایا تھا، اسی دن سے میں ان سبھوں کا پتا لگا رہا ہوں، اوروں کا تو ابھی تک بیاہ ہی نہیں ہوا ہے، صرف ونیش کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ بڑھیا ماں ہے اور بیوی ہے۔ یہاں کسی سکول میں ماسٹر تھا۔''

جالپا نے پوچھا: ''اس کے گھر کا کچھ پتا لگا سکتے ہو؟''

دینی نے کہا: ''ہاں کیا مشکل ہے۔''

جالپا: ''تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ ابھی تو وقت ہے، چلو دیکھ کر آئیں۔''

دینی: ''پہلے میں دیکھ تو آؤں۔ اس طرح اٹھ کر میرے ساتھ کہاں کہاں دوڑتی پھرو گی؟''

جالپا نے مجبورانہ انداز سے سر جھکا لیا اور کچھ نہ بولی۔

دینی دین چلا گیا۔ جالپا پھر اخبار دیکھنے لگی، مگر اس کا دھیان ونیش کی طرف لگا ہوا تھا۔ غریب پھانسی پا جائے گا۔ جس وقت اس نے پھانسی کا حکم سنا ہو گا، اس کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ اس کی بوڑھی ماں اور بیوی یہ خبر سن کر چھاتی پیٹنے لگی ہوں گی۔ بیچارہ سکول ماسٹر ہی تو تھا۔ مشکل سے روٹیاں چلتی ہوں گی۔ اس کی مصیبتوں کے تخیل سے اسے رما کے ساتھ ایسی نفرت پیدا ہوئی کہ ضبط نہ کر سکی۔ دل میں ابال سا اٹھ رہا تھا کہ رما اس وقت آ جائے تو اس کی ملامت کرے کہ وہ بھی یاد کرے۔ تم انسان نہیں ہو۔ تم انسان کی صورت میں خونخوار درندے ہو۔ تم اتنے خبیث النفس ہو کہ آج کمینہ سے کمینہ آدمی بھی تمہارے اوپر تھوک رہا ہے۔ تمہیں کسی نے پہلے

ہی کیوں نہ قتل کر دیا۔ ان لوگوں کی جان تو جاتی ہی، مگر تمہارے منہ میں کالک تو نہ لگتی۔

شام ہو گئی لیکن دیبی دین نہ آیا۔ رفتہ رفتہ آٹھ بج گئے۔ دفعتاً ایک موٹر دروازہ پر آ کر رکی۔

رما نے اتر کر جگو سے پوچھا: ''کیوں دادی سب خیر و عافیت تو ہے؟ دادا؟''

جگو نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر کر بولی: ''کہیں گئے ہوں گے۔ میں نہیں جانتی۔''

رما نے سونے کی چار چوڑیاں جیب سے نکال کر جگو کے پیروں پر رکھ دیں اور بولا: ''یہ تمہارے لیے لایا ہوں دادا پہنو۔ ڈھیلی تو نہیں ہیں۔''

جگو نے چوڑیاں اٹھا کر زمین پر پٹک دیں اور آنکھیں نکال کر بولی: ''بھگوان کی دیا سے بہت چوڑیاں پہن چکی ہوں اور اب بھی سیر دو سیر سونا پڑا ہو گا، لیکن جو کھایا اپنی محنت کی کمائی سے۔ کسی کا گلا نہیں دبایا۔ پاپ کی گٹھڑی سر پر نہیں لادی۔ اس کوکھ میں آگ لگے، جس نے تم جیسے کپوت کو جنم دیا۔ یہ پاپ کی کمائی لے کر تم بہو کو دینے آئے ہو۔ سمجھتے ہو گے تمہارے روپوں کی تھیلی دیکھ کر وہ لٹو ہو جائے گی۔ اتنے دنوں اس کے ساتھ رہ کر بھی تمہاری لوبھی آنکھ اسے نہ پہچان سکی۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو انہی پیروں جہاں سے آئے ہو، وہیں لوٹ جاؤ۔ اس کے سامنے جا کر کیوں اپنا پانی اترواؤ گے؟ تم آج پولیس کے ہاتھوں زخمی ہو کر آئے ہوتے تو بہو تمہاری پوجا کرتی۔ تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیتی۔ وہ ان عورتوں میں ہے، جو چاہے مصیبتیں سہیں، لیکن کسی کی برائی نہیں دیکھ سکتیں۔ اگر تم میرے

لڑکے ہوتے تو تمہیں زہر دے دیتی۔ کیوں کھڑے مجھے جلا رہے ہو، چلے کیوں نہیں جاتے۔ میں نے تم سے کچھ لے تو نہیں لیا ہے۔''

رما سر جھکائے خاموش سنتا رہا۔تب دل گرفتہ ہو کر بولا: ''دادی میں نے برائی کی ہے اور اس کے لیے مرتے دم تک شرمندہ رہوں گا،لیکن تم مجھے جتنا کمینہ سمجھ رہی ہو، اتنا کمینہ نہیں ہوں۔ اگر تمہیں معلوم ہوتا کہ پولیس نے میرے ساتھ کیسی کیسی زیادتیاں کیں،تو تم مجھ سے اتنی زیادہ ناراض نہ ہوتیں۔''

جالپا کے کانوں میں ان کی آوازوں کی بھنک پڑی۔اس نے زینے سے جھانک کر دیکھا۔ رما تا تھ کھڑا ہے۔سر پر بناری ریشمی صافہ تھا، ریشم کا بڑھیا کوٹ اور آنکھوں پر سنہری عینک۔ اس ایک ہی مہینہ میں اس کا جسم چوگنا ہو گیا تھا۔ رنگت بھی نکھر آئی تھی۔ایسی رونق اس کے چہرے پر کبھی نظر نہ آئی تھی۔رما کے آخر الفاظ اس کے کانوں میں پڑ گئے۔باز کی طرح ٹوٹ کر دھم دھم کرتی نیچے آئی اور بولی:

''اگر سختیوں سے اتنا دب سکتے ہو تو تم بے غیرت ہو۔تمہیں اپنے آپ کو مرد کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔کیا سختیاں کی تھیں ذرا سنوں۔لوگوں نے ہنستے ہنستے سر کٹائے ہیں۔اپنے بیٹوں کو مرتے دیکھا ہے۔کولہو میں پیلے جانا منظور کیا ہے،مگر حق سے جو بھر بھی منحرف نہیں ہوئے۔تم کیوں دھمکی میں آ گئے۔کیوں نہیں سینہ کھول کر کھڑے ہو گئے کہ اسے گولی کا نشانہ بنا لو،مگر میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ کیوں نہیں سر جھکا دیا۔ روح اس لیے جسم کے اندر رکھی گئی ہے کہ جسم اس کی حفاظت کرے، اس لیے نہیں کہ اس کو تباہ کر دے۔آخر اس کا کیا انعام ملا۔ذرا

معلوم تو ہو۔''

رمانے دبی ہوئی آواز سے کہا: ''ابھی تو وعدے ہی وعدے ہیں۔''

جالپا نے ناگن کی طرح پھنکار کر کہا: ''یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ ایشور سے یہی دعا کر رہی تھی لیکن تم جیسے موم کے پتلوں کو پولیس کبھی ناراض نہیں کرے گی۔ جاؤ شوق سے زندگی کے مزے لوٹو۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا اور آج پھر کہتی ہوں کہ میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں نے سمجھ لیا کہ تم مر گئے، تم بھی سمجھ لو کہ میں مر گئی۔ بس جاؤ۔ میں عورت ہوں اگر کوئی سختیاں کرا کر مجھ سے ایسی شرمناک حرکت کرانے کی کوشش کرے تو چاہے اسے نہ مار سکوں، مگر اپنی گردن پر چھری چلا لوں گی۔ کیا تم میں عورتوں کے برابر بھی ہمت نہیں ہے؟''

رمانے عاجزی سے گڑگڑا کر کہا: ''تم میرا کوئی عذر نہ سنو گی؟''

جالپا نے کہا: ''نہیں!''

''تو میں منہ میں کالکھ لگا کر کہیں، نکل جاؤں؟''

''تمہاری خوشی۔''

رما ایک لمحہ تک سر جھکائے کھڑا رہا۔ تب آہستہ آہستہ برآمدے کے نیچے جا کر جگو سے بولا: ''دادا آئیں تو کہہ دینا مجھ سے ذرا دیر کے لیے مل لیں۔ جہاں کہیں آجاؤں گا۔''

جگو نے پگھل کر کہا: ''کل یہیں چلے آنا۔''

رمانے موٹر پر بیٹھتے ہوئے کہا: ''یہاں اب نہ آؤں گا دادی۔''

موٹر چلی گئی تو جالپا نے حاسدانہ انداز سے کہا: ''موٹر دکھانے کو آئے تھے جیسے

خرید ہی تو لائے ہیں۔''

جگو نے سرزنش کی: ''تمہیں اتنا بے لگام نہ ہونا چاہیے تھا۔ بہو دل پر چوٹ لگتی ہے تو آدمی کو کچھ نہیں سوجھتا۔''

جالپا نے بیدردی سے کہا: ''ایسے حیادار نہیں ہیں دادی! اسی عیش کے لیے تو ایمان بیچا ہے۔ پوچھا نہیں دادا سے مل کر کیا کرو گے۔ وہ ہوتے تو ایسی پھٹکار سناتے کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔''

جگو ماتا سے بھرے ہوئے لہجہ میں بولی: ''تمہاری جگہ میں ہوتی تو میرے منہ سے ایسی باتیں نہ نکلتیں۔ تمہارا کلیجہ بڑا سخت ہے۔ دوسرا مرد ہوتا تو کیا اس طرح چپ چاپ سنتا۔ میں تھر تھر کانپ رہی تھی کہ کہیں تمہارے اوپر ہاتھ نہ چلا دیں، مگر ہیں بڑے غمخوار۔''

جالپا نے اسی بے رحمی سے کہا: ''اسے غمخوار نہیں کہتے دادی۔ یہ بے حیائی ہے۔''

دیبی دین نے آ کر کہا: ''یہاں بھیا آئے تھے؟ مجھے موٹر پر راستہ میں دکھائی دیئے تھے۔''

جگو نے کہا: ''ہاں آئے تھے۔ کہہ گئے ہیں، دادا مجھ سے مل لیں۔''

دیبی دین نے بے دلی سے کہا: ''ہاں مل لوں گا۔ کچھ اور بات چیت ہوئی؟''

جگو پچھتاتی ہوئی بولی: ''بات چیت کیا ہوئی۔ پہلے میں نے پوجا کی۔ میں چپ ہوئی تو بہو نے اچھی طرح مالا پھول چڑھایا۔''

جالپا نے بے باکی سے کہا: ''آدمی جیسا کرے گا، ویسا بھرے گا۔''

جگو: ''اپنا ہی سمجھ کر آئے تھے۔''

جالپا: ''کوئی بلانے تو گیا نہ تھا۔''

یہ کہہ کر اس نے دیبی دین سے پوچھا کہ: ''ونیش کا پتا لگا دادا؟''

دیبی دین نے کہا: ''ہاں پوچھ آیا، ہوڑے میں گھر ہے۔ پتا ٹھکانہ سب معلوم ہے۔''

جالپا: ''تو اسی وقت چلو گے یا کل کسی وقت؟''

دیبی: ''تمہاری جیسی خوشی۔ جی چاہے ابھی چلو۔ میں تیار ہوں۔''

جالپا: ''تھک گئے ہو گے؟''

دیبی: ''ایسے کاموں میں تھکن نہیں ہوتی۔''

آٹھ بج گئے تھے۔ سڑک پر موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ سڑک کی دونوں پٹریوں پر ہزاروں عورت مرد بنے ٹھنے ہنستے بولتے جاتے تھے۔ جالپا نے سوچا، دنیا کیسی اپنے راگ رنگ میں مست ہے۔ جسے اس کے لیے مرنا ہو مرے۔ وہ اپنی عادت نہ چھوڑے گی۔ ہر ایک اپنا چھوٹا سا مٹی کا گھروندا بنائے بیٹھا ہے۔ ملک تباہ ہو جائے اسے غم نہیں۔ اس کا گھروندا بچا رہے۔ جالپا کا بھولا بھالا دل اس وقت بازار کو بند دیکھ کر خوش ہوتا۔ لوگ غم سے سر جھکائے یا غصہ سے تیوریاں بدلے نظر آتے۔ وہ نہ جانتی تھی کہ خلقت کے اس سمندر میں ایسی چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے گرنے سے ایک ہلکورا بھی نہیں اٹھتا۔ آواز تک نہیں آتی۔

رما موٹر پر بیٹھ کر چلا تو اسے کچھ سوجھتا نہ تھا۔ جانے ہوئے راستے اس کے لیے انجان ہو گئے تھے۔ اسے جالپا پر غصہ نہ آتا تھا۔ ذرا بھی نہیں۔ جگو پر بھی اسے غصہ نہ آتا تھا۔ غصہ آتا تھا اپنی کمزوری پر اور اپنی بے شرمی اور بے عزتی پر۔ پولیس والوں کے زیر اثر اس کے ضمیر پر پردہ پڑ گیا تھا۔ وہ کتنی بڑی بے انصافی کرنے جا رہا تھا۔ افسروں نے بڑی بڑی امیدیں بندھا کر اسے بہلا رکھا۔ اس کے بعد اسے جالپا سے ملنے کا موقع ہی نہ ملا۔ پولیس کا رنگ اس پر جمتا گیا۔ آج وہ ایک جڑاؤ ہار جیب میں رکھے جالپا کو اپنی کامیابی کی خوشخبری دینے گیا تھا۔ جانتا تھا کہ جالپا پہلے کچھ ناک بھوؤں سکوڑے گی، مگر یہ بھی جانتا تھا کہ یہ ہار دیکھ کر وہ ضرور خوش ہو جائے گی۔ کل ہی صوبہ متحدہ کے ہوم سیکرٹری کے نام پولیس کمشنر کا سفارشی خط اسے مل جائے گا۔ دو چار دن اور لطف صحت اٹھانے کے بعد وہ گھر کی راہ لے گا۔ دیبی دین اور جگو کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جانا چاہتا تھا۔ ان کا احسان وہ کیونکر بھول سکتا تھا۔ یہی منصوبہ دل میں باندھ کر وہ جالپا کے پاس گیا تھا۔ جیسے کوئی بے چاری پھول اور شیرینی لے کر دیوتا کی پوجا کرنے جائے، لیکن دیوتا نے اس کے تھال کو ٹھکرا دیا، اس کے پھولوں کو پیروں سے کچل ڈالا۔

اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملا۔ آج پولیس کے محفوظ دائرۂ اثر سے باہر نکل کر آزادی کی فضا میں اس کا ضمیر بیدار ہو گیا تھا۔ اب اپنی خباثت اسے اصلی روپ میں نظر آئی۔ اس کے دل میں ایک ہیجان پیدا ہوا کہ اسی وقت جج کے پاس جائے اور سارا واقعہ کہہ سنائے۔ کیا جج فیصلہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ ابھی تو سب ہی ملزم حوالات میں ہیں۔ پولیس والوں کے دانت پیسنے کا اسے مطلق خوف نہ تھا۔ جالپا

کی وہ غصے میں بھری ہوئی صورت اس کی آنکھوں میں بھر گئی۔ اف کتنے طیش میں تھی۔ اگر وہ جانتا کہ جالپا اتنی برہم ہو جائے گی تو چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جاتی، اپنا بیان ضرور بدل دیتا۔ اگر کہیں جج نے سماعت نہ کی اور ملزموں کو بری نہ کیا تو جالپا اس کا منہ نہ دیکھے گی۔ پھر وہ زندہ ہی کیوں رہے۔ کس کے لیے۔

اس نے موٹر روکی اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہاں آ گیا۔ یکا یک چوکیدار نظر آ گیا۔ رما نے اس سے جج کے بنگلے کا پتا پوچھا۔ چوکیدار ہنس کر بولا: ''حضور تو بہت دور نکل آئے۔ یہاں سے تو چھ سات میل سے کم نہ ہو گا۔ وہ ادھر چورنگی کی طرف رہتے ہیں۔''

رما چورنگی کی طرف چلا۔ نو بج گئے تھے۔ معلوم نہیں جج سے ملاقات بھی ہو گی یا نہیں۔ کچھ بھی ہو آج ان سے بغیر اپنی سرگزشت کہے وہ نہیں لوٹے گا۔ اگر انہوں نے کچھ سماعت کی تو اچھا ہی ہے۔ نہیں تو وہ کل ہائی کورٹ کے ججوں سے کہے گا۔ کوئی تو سنے گا۔ وہ سارا واقعہ اخباروں میں چھپوا دے گا۔ تب تو سب کی آنکھیں کھلیں گی۔

موٹر تیس میل کی رفتار سے جا رہی تھی۔ دس ہی منٹ میں چورنگی آ پہنچی۔ یہاں ابھی تک وہی چہل پہل تھی، مگر اس زناٹے سے موٹر لیے جاتا تھا۔ یکا یک ایک پولیس مین نے لال بتی دکھائی۔ رما نے موٹر روک لی اور سر باہر نکال کر دیکھا تو وہی داروغہ جی۔

داروغہ نے پوچھا: ''کیا ابھی تک بنگلے پر نہیں گئے؟ کہیے بیگم صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے تو سمجھا تھا، وہ بھی آپ کے ساتھ ہوں گی۔ خوش تو خوب

ہوئی ہوں گی؟''

رمانے بات بنا کر کہا: ''جی ہاں بہت خوش ہوئیں۔''

''میں نے تو کہا ہی تھا۔ عورتوں کی ناراضگی کی یہی دوا ہے۔ آپ کانپے جاتے تھے۔''

''میری حماقت تھی۔''

''چلیے، انسپکٹر صاحب بھی آتے ہوں گے۔ اب آپ مسز رمانا تھ کو بنگلے پر ہی کیوں نہیں بلا لیتے؟''

رمانے کہا: ''ابھی تو مجھے ایک ضرورت سے دوسری طرف جانا ہے۔ آپ موٹر لے جائیں۔ میں پاؤں پاؤں چلا آؤں گا۔''

داروغہ نے موٹر کے اندر بیٹھ کر کہا: ''نہیں صاحب مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ جہاں چاہیں چلیے، میں ذرا بھی مخل نہ ہوں گا۔''

رمانے کچھ ترش ہو کر کہا: ''میں سمجھ رہا ہوں لیکن میں ابھی بنگلے پر نہیں جا رہا ہوں۔''

داروغہ نے مسکرا کر کہا: ''میں سمجھ رہا ہوں لیکن میں ذرا بھی مخل نہ ہوں گا۔''

رمانے جھانک کر کہا: ''آپ جو کچھ سمجھ رہے ہیں، وہ بالکل غلط ہے۔ میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں۔''

داروغہ نے کچھ نادم ہو کر کہا: ''اچھا صاحب خطا ہوئی معاف کیجیے، لیکن ابھی آپ اپنے آپ کو خطرے سے باہر نہ سمجھیں۔ آپ کو کسی ایسی جگہ نہ جانے دوں گا، جہاں مجھے پورا اطمینان نہ ہو گا۔ میں آپ ہی کے فائدے کے خیال سے یہ

عرض کر رہا ہوں۔"

رما نے ہونٹ چبا کر کہا: "بہتر ہو آپ میرے فائدے کا اتنا خیال نہ کریں۔ آپ لوگوں نے مجھے ملیا میٹ کر دیا اور اب بھی گلا نہیں چھوڑتے۔ مجھے اب اپنے حال پر مرنے دیجیے۔ میں اس غلامی سے تنگ آ گیا ہوں۔"

یہ کہتا ہوا وہ موٹر سے اتر پڑا۔ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ داروغہ نے کئی بار پکارا، لیکن اسے نے پیچھے پھر کر دیکھا تک نہیں۔ کچھ دور جا کر وہ ایک موڑ پر گھوم گیا۔ اسی سڑک پر جج کا بنگلہ تھا۔ سڑک پر کوئی آدمی نہ تھا۔ رما کبھی اس بازو پر، کبھی اس بازو پر جا جا کر بنگلوں کے سائن بورڈ پڑھتا چلا جاتا تھا۔ یکا یک جج کا نام دیکھ کر وہ رک گیا۔ اندر جانے کی ہمت نہ پڑی۔ خیال آیا جج نے پوچھا تم نے جھوٹی گواہی کیوں دی؟ تو کیا جواب دوں گا۔ یہ کہنا کہ پولیس نے مجھ سے زبردستی گواہی دلوائی، ترغیبیں دیں اور تشدد کیا شرمناک معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ پوچھے کہ تم نے محض دو تین سال کی سزا سے بچنے کے لیے اتنے بے گناہوں کا خون سر پر لے لیا تو اس کا میرے پاس کیا جواب ہے۔ خواہ مخواہ ذلیل ہونا پڑے گا۔ بے وقوف بنایا جاؤں گا۔ وہ انہی پاؤں پر لوٹ پڑا۔ اس ذلت کا مقابلہ کرنے کی کی اس میں ہمت نہ تھی۔

(45)

رما آدھی رات گئے سویا تو نو بجے دن تک نیند نہ کھلی۔ وہ خواب دیکھ رہا تھا۔

ونیش کو پھانسی ہو رہی ہے۔ اسی وقت داروغہ نے آ کر کہا: ''آج آپ خوب سوئے بابو صاحب! کل کب سوئے؟''

رما نے لیٹے لیٹے ہی اسے جواب دیا: ''ذرا دیر بعد لوٹ آیا۔ اس مقدمہ کی اپیل تو ہائی کورٹ میں ہوگی؟''

داروغہ: ''اپیل کیا ہوگی، ضابطہ کی پابندی ہوگی۔ آپ نے مقدمہ کو اتنا مضبوط کر دیا ہے کہ اب وہ کسی کے ہلائے ہل نہیں سکتا۔''

دفعتاً ڈپٹی اور انسپکٹر پولیس دونوں آ پہنچے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا: ''ابھی تو آپ سویا ہوا ہے۔ کمشنر صاحب آپ سے بہت خوش ہے۔ یہ دیکھیے انہوں نے آپ کو یہ سفارشی چٹھی دی ہے۔ بس یہی سمجھ لیجیے کہ آپ کی تقدیر کھل گئی۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک لفافہ رما کی طرف بڑھایا۔ رما نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ یکا یک اسے پھاڑ کر پرزہ پرزہ کر ڈالا۔ تینوں آدمی حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگے۔

داروغہ نے تیز ہو کر کہا: ''یہ آپ نے کیا حماقت کی؟''

انسپکٹر: ''حلف سے کہتا ہوں کمشنر صاحب کو معلوم ہوگا تو بہت ناراض ہوں گے۔''

ڈپٹی: ''اس کا مطلب ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر آپ اتنے ناراض کیوں ہیں؟''

رما: ''اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اس خط کی ضرورت نہیں اور نہ میں نوکری چاہتا ہوں۔ میں آج یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

ڈپٹی: ’’جب تک ہائی کورٹ کا فیصلہ نہ ہو جائے، آپ کہیں نہیں جا سکتے۔‘‘

رما: ’’کیوں؟‘‘

ڈپٹی: ’’کمشنر صاحب کا یہ حکم ہے۔‘‘

رما: ’’میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔‘‘

انسپکٹر: ’’بابو صاحب! آپ ناحق بنا بنایا کھیل بگاڑ رہے ہیں۔ جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ دس پانچ دن میں ہائی کورٹ سے فیصلہ کی تصدیق ہو جائے گی۔ آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ جو صلہ مل رہا ہے، اسے شکریہ کے ساتھ قبول کیجیے اور آرام سے زندگی کے دن بسر کیجیے۔ خدا نے چاہا تو ایک دن آپ بھی اونچے منصب پر ہوں گے۔ یہ واضح رہے کہ افسروں کی ذرا سی نگاہ بدل جائے تو آپ کا کہیں پتا نہیں لگے۔ حلف سے کہتا ہوں پولیس کے ایک ذرا سے اشارے پر دس سال کی سزا ہو جائے گی۔ آپ ہیں کس زعم میں۔ ہم آپ کے ساتھ دغا نہیں کرنا چاہتے۔ ہاں اگر ہمیں بھی پولیس کی چالیں چلنی پڑیں گی، جیل کو آسان نہ سمجھیے گا۔ خدا دوزخ میں لے جائے، جیل کی سزا نہ دے۔ حلف سے کہتا ہوں کہ جیل دوزخ سے بھی بدتر ہے۔‘‘

داروغہ: ’’یہ بیچارے اپنی بیوی سے مجبور ہیں۔ وہ شاید ان کی جان کی گاہک ہو رہی ہے۔‘‘

انسپکٹر: ’’کیا ہوا، کل تو آپ وہ ہار لے گئے تھے۔ پھر بھی ان کا منہ سیدھا نہ ہوا؟‘‘

رما نے کوٹ کی جیب سے ہار نکال کر میز پر رکھ دیا اور بولے: ’’وہ ہار رکھا

ہے۔''

ڈپٹی: ''کوئی مغرور عورت ہے۔''

انسپکٹر: ''کچھ ان کی بھی مزاج پرسی کرنی پڑے گی۔''

داروغہ: ''یہ تو بابو صاحب کے سلیقے اور برتاؤ پر منحصر ہے۔''

ڈپٹی: ''اس کھٹک سے بھی مچلکہ لینا چاہیے۔''

رماناتھ کے سامنے ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ ممکن تھا وہ اپنے کو فرض پر قربان کر دیتا۔ دو چار سال کی سزا کے لیے بھی تیار ہو جاتا۔ شاید اس نے ان سختیوں کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر لیا تھا، لیکن اپنے ساتھ جالپا کو بھی مصیبت میں ڈالنے کا ارادہ کسی طرح نہ کر سکتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ پولیس کے پنجے میں کچھ اس طرح پھنس گیا ہے کہ اس کے بے داغ بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ وہ پولیس سے ہرگز پیش نہیں پا سکتا۔ اس خیال نے اس کی تیزی اور تندی غائب کر دی۔ بیکسانہ انداز سے بولا:

''آخر آپ لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

انسپکٹر نے داروغہ کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری، گویا کہہ رہے ہوں آ گیا پنجے میں اور بولے:

''بس ہم اتنا ہی چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے مہمان بنے رہیں اور مقدمہ ہائی کورٹ سے طے ہو جانے کے بعد خوش خوش رخصت ہو جائیں، کیونکہ اس کے بعد ہم آپ کی حفاظت کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ ابھی جو خط آپ نے پھاڑ کر پھینک دیا ہے، اس کی نقل دوبارہ مل سکتی ہے۔ اگر آپ دور اندیش ہیں تو اس سے

اپنی زندگی کی اصلاح میں کام لیں گے۔ نہیں تو ادھر ادھر کے دھکے کھائیں گے اور آپ کے اوپر گناہ بے لذت کی مثل صادق آئے گی۔ اس کے سوا ہم آپ سے کچھ نہیں کہتے۔''

تینوں افسر رخصت ہو گئے اور رما ایک سگار جلا کر ان معاملات پر غور کرنے لگا۔

(46)

ایک مہینہ اور نکل گیا۔ ہائی کورٹ میں مقدمہ کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے۔ رما پر پھر پولیس کا رعب غالب آ گیا ہے اور وہ پھر سابق دستور افسروں کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ شراب پینے لگا ہے اور اس کی مزید دلچسپی کے لیے پولیس نے زہرہ نام کی ایک نازنین کو بھی مقرر کر دیا ہے۔ خوش گلو ہے اور مزاج شناس ہے۔ اس نے اپنی ہمدردانہ باتوں سے رمانا تھ کو گرویدہ کر لیا ہے۔ اس کی سادگی اور خلوص نے زہرہ کو بھی اس سے مانوس کر دیا ہے۔ اب تک اسے جن لوگوں سے سابقہ پڑا تھا، وہ سبھی اسے ایک آلۂ تفریح سمجھتے تھے۔ رما وہ پہلا آدمی تھا، جو اس کوچہ سے ناواقف ہونے کے باعث اسے اپنا شریکِ غم بنانا چاہتا تھا۔

ایک دن اس نے دوران گفتگو زہرہ سے کہا: ''تم مجھ پر اتنی مہربان ہو کہ میں ڈرتا ہوں کہ تمہاری محبت میں گرفتار نہ ہو جاؤں، مگر تم سے وفا کی امید ہو سکتی

ہے؟''

زہرہ نے دل میں خوش ہو کر اپنی مخمور آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''ہم وفا کیا جانیں۔ ہمارا تو پیشہ ہی حسن فروشی ہے۔''

رما: ''کیا اس میں کوئی شک بھی ہے؟''

زہرہ: ''مطلق نہیں۔ آپ لوگ ہمارے پاس محبت سے لبریز دل لے کر آتے ہیں، مگر ہم اتنے بے وفا ہیں کہ اس کی ذرا بھی قدر نہیں کرتے۔ ہے یہی بات نہ؟''

رما: ''بے شک!''

زہرہ: ''معاف کیجیے گا۔ آپ مردوں کی طرف داری کر رہے ہیں۔ حق یہ ہے کہ آپ لوگ ہمارے پاس محض تفریح کے لیے آتے ہیں۔ محض غم غلط کرنے کے لیے۔ محض نفسانی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے۔ جہاں آپ کو وفا کی تلاش ہی نہیں، وہاں وفا ہے کیونکر! لیکن اتنا ہی جانتی ہوں کہ ہم میں جتنی بے چاریاں مردوں کا جبر اور بے وفائی سے مایوس ہو کر خون جگر پیتی ہیں۔ ان کا پتا اگر دنیا کو چلے تو آنکھیں کھل جائیں۔ یہ ہماری حماقت ہے کہ تماش بینوں سے وفا کی امید رکھتی ہیں، مگر پیاسا آدمی اندھے کنویں کی طرف دوڑے تو میرے خیال میں اس کا کوئی قصور نہیں۔''

آج جب زہرہ یہاں سے چلی تو اس نے داروغہ صاحب کو یوں رپورٹ کی: ''آج تو حضرت خوب مزے میں آئے۔ خدا نے چاہا تو چار دن کے بعد بیوی کا نام بھی نہ لیں گے۔''

داروغہ نے خوش ہو کر کہا: ''یہ تو میں نے پہلے ہی سمجھ رکھا تھا۔ لطف تو جب ہے کہ اس کی بیوی مایوس ہو کر چلی جائے۔ ایسے گاؤدیوں کو سبز باغ دکھانا تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

زہرہ کی آمد و رفت بڑھنے لگی۔ آخر کار رما خود اپنے ہی جال میں پھنس گیا۔ اس نے زہرہ سے الفت کا سوانگ بھر کر افسروں کی نگاہوں میں اپنا وقار جمانا چاہا، لیکن زہرہ اب اسے وفا اور محبت کی دیوی سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ جالپا کی سی حسین نہ تھی، اظہار محبت میں اس سے کہیں زیادہ ہوشیار، ناز و ادا میں اس سے کہیں زیادہ پختہ کار اور سحر آفرینی میں کہیں زیادہ مشاق تھی۔ سر دلوح رما کے دل میں نئے نئے منصوبے پیدا ہونے لگے۔

ایک دن اس نے زہرہ سے کہا: ''زہرہ جدائی کی گھڑی آ رہی ہے۔ دو چار دن میں یہاں سے جاؤں گا۔ پھر تو تمہیں میری یاد بھی نہ آئے گی۔''

زہرہ نے محبت آمیز لہجہ میں کہا: ''اب تمہیں نہ جانے دوں گی۔ یہیں کوئی اچھی سی نوکری کر لینا۔ پھر ہم دونوں آرام سے رہیں گے۔''

رما مخمور ہو کر بولا: ''یہ دل سے کہتی ہو زہرہ؟ دیکھو تمہیں میرے سر کی قسم! دغا مت دینا۔''

زہرہ: ''اگر یہ خوف ہے تو نکاح پڑھا لو۔ نکاح کے نام سے نفرت ہو تو شادی کر لو۔ اب اس کے سوا اپنی محبت کا کیا ثبوت دوں؟''

خلوص میں ڈوبے ہوئے ان الفاظ نے رما کو متوالا کر دیا۔ اس نے سوچا، یہ نازنین جس پر بڑے بڑے رئیس فدا ہیں، میرے لیے اتنی بڑی قربانی کرنے کو

تیار ہے۔اس کی خوش نصیبی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔جس کان میں دوسروں کو بالوں کے ذرے ملتے ہیں، اس میں اسے سونے کے ڈلے مل گئے۔کیا یہ حسن تقدیر نہیں ہے۔رما کے دل میں کئی روز کشمکش ہوتی رہی۔جالپا کے ساتھ آنے والی زندگی کا خیال کر کے وہ مایوس ہو جاتا تھا۔وہ زندگی کتنی خشک اور صبر آزما ہوگی۔جالپا قدم قدم پر فرض اور حق کا جھنڈا لے کر کھڑی ہو جائے گی اور اسے زاہدوں کی سی زندگی بسر کرنی پڑے گی۔فقیرانہ زندگی میں رما کے لیے کوئی کشش نہ تھی۔

عام آدمیوں کی طرح وہ بھی عیش وآرام چاہتا تھا۔زندگی کے مزوں سے اس کی طبیعت سیر نہ ہوئی تھی۔تپسوانی جالپا کی طرف سے ہٹ کر اس کا عیش پرور دل زہرہ کی طرف دوڑا۔اسے نازفروشوں کی مثالیں یاد آنے لگیں، جن کی عصمت کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔اس کے ساتھ ہی رنگین مزاج اور وفا شعار بیویوں کی مثالیں بھی آ پہنچیں۔اس نے دل میں فیصلہ کیا یہ سب ڈھکوسلا ہے۔انسان کی طبیعتیں جدا جدا ہیں۔پردہ کے باہر آ جانے سے کوئی گنہگار نہیں ہو جاتا اور نہ پردے کے اندر بیٹھ کر کوئی عصمت مآب ہو جاتا ہے۔یہ سب زندگی کے اتفاقات ہیں۔

زہرہ روز آتی اور بندھن میں ایک گانٹھ دے کر چلی جاتی۔ان حالات میں کئی مستقل مزاج نوجوانوں کے بھی آسن ڈول جاتے۔رما تو عیش کا بندہ تھا۔اب تک وہ محض اس لیے بے راہ نہ ہوا تھا کہ جوں ہی اس نے پر نکالے، صیاد نے اسے پنجرے میں قید کر لیا۔کچھ دن پنجرے سے باہر آ جانے پر بھی اسے پرواز کی ہمت نہ ہوئی۔اب اس کے سامنے ایک نیا اور وسیع منظر تھا۔وہ چھوٹا سا کھیوں والا پنجرہ

نہیں، بلکہ پھولوں سے لہراتا ہوا باغ، جہاں کی قید میں بھی آزادی کا مزا تھا۔

(47)

رما جوں جوں زہرہ کے دامِ الفت میں پھنستا جاتا تھا، پولیس کے افسر اس کی طرف سے بے فکر ہوتے جاتے تھے۔ اس کے اوپر جو قید لگائی گئی تھی، وہ رفتہ رفتہ ترک ہوتی جاتی تھی۔ ایک دن رما ڈپٹی صاحب کے ساتھ سیر کرنے لگا تو موٹر دیبی دین کی دکان کے سامنے سے گزری۔ رما نے اپنا سر اندر کھینچ لیا کہ کسی کی اس پر نظر نہ پڑ جائے۔

وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ جالپا ہے یا چلی گئی، لیکن دیبی دین کی دکان پر نہ جا سکا۔ دل میں اب بھی وہ یہی سمجھتا تھا کہ میں نے جو راستہ پکڑا ہے، وہ بہت مخدوش ہے، لیکن یہ جان کر بھی وہ اسے چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ دیبی دین کو دیکھ کر اس کا سر آپ ہی آپ شرم سے جھک جاتا۔ وہ کسی دلیل سے اپنے اطوار کی حمایت نہ کر سکتا تھا۔ اس کی خیریت اسی میں تھی کہ وہ لوگوں سے اب ملنا جلنا چھوڑ دے۔ شہر میں تین آدمیوں کے سوا چوتھے آدمی سے اس کی ملاقات یا راہ و رسم نہ تھی، جس کی حرف گیری کی اسے پروا ہوتی۔

موٹر ادھر ادھر گھومتی ہوئی ہاوڑا کے پل کی طرف جا رہی تھی کہ یکایک رما نے ایک عورت کو سر پر گنگا جل کا کلسا رکھے گھاٹوں کے اوپر چڑھتے دیکھا کہ اس کے کپڑے بہت میلے ہو رہے تھے اور اتنی لاغر تھی کہ کلسے کے بوجھ سے اس کی کمر

دوہری ہو رہی تھی۔ اس کی چال کچھ کچھ جالپا سے ملتی ہوئی معلوم ہوئی۔ رما نے سوچا جالپا یہاں کیا کرنے آئے گی۔ کوئی دوسری عورت ہو گی۔ اس کی صورت دیکھ کر مزید اطمینان کرنا چاہتا تھا۔

مگر ایک ہی لمحے میں کار اور آگے بڑھ گئی اور رما کو اس کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ یہ جالپا ہی تھی۔

اس نے کھڑکی کی بغل میں سر جھکا دیا۔ بیشک جالپا تھی، مگر کتنی لاغر اندام، گویا کوئی بے کس ضعیفہ ہو۔ چہرے پر نہ رونق تھی، نہ وہ سادگی اور نہ وہ غرور۔ رما بے درد نہ تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

جالپا اس حالت میں اور اس کے جیتے جی! غالباً دیبی دین نے اسے گھر سے نکال دیا ہے اور وہ مزدوری کر کے زندگی بسر کر رہی ہے، مگر نہیں۔ دیبی دین اتنا بے مروت نہیں ہے۔ جالپا نے خود اس کے سایۂ حمایت میں رہنا منظور نہ کیا ہو گا۔ عالی ظرف تو ہے ہی، مگر کیسے معلوم ہو کیا بات ہے۔

موٹر دور نکل آئی تھی۔

رما کی ساری شوقین مزاجی، ساری شوریدہ سری غائب ہو گئی۔ اس میلے کپڑے والی ستم رسیدہ جالپا کی صورت آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔ کس سے پوچھے۔ کہاں جائے۔ جالپا کا نام بھی زبان پر آ جائے تو سب کے سب بدگمان ہو جائیں اور اسے قید تنہائی میں ڈال دیں۔ ہائے جالپا کے چہرے پر کتنی حسرت تھی۔ آنکھوں میں کتنی بے کسی۔

کچھ دیر بعد زہرہ آئی، مسکراتی اور لچکتی۔ رما اس سے کچھ بھی مخاطب نہ ہوا۔

زہرہ نے پوچھا:

"آج کسی کی یاد آ رہی ہے کیا؟"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی گول مکھن سی نرم بانہیں اس کی گردن میں ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچا۔

رما نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی۔ اس طرح اس کے سینہ پر اپنا سر رکھ دیا، گویا اب یہی سہارا ہے۔

زہرہ نے دردمندانہ لہجہ میں پوچھا: "سچ بتاؤ آج اتنے اداس کیوں ہو۔ کیا مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو؟"

رما نے رقت آمیز انداز سے کہا: "نہیں زہرہ تم نے مجھ بدنصیب پر جتنا رحم کیا ہے، اس کے لیے میں ہمیشہ تمہارا احسان مند رہوں گا۔ تم نے مجھے اس وقت سنبھالا، جب میری زندگی کی ٹوٹی ہوئی کشتی غوطے کھا رہی تھی۔ وہ دن میری زندگی کے سب سے مبارک دن ہیں اور میں اپنے سینے میں انہیں ہمیشہ محفوظ رکھوں گا، مگر بدنصیبوں کی دنیا میں آسائش کہاں۔ میں نے آج جالپا کو جس صورت میں دیکھا ہے، وہ میرے دل کو بھالوں کی طرح چھید رہا ہے۔ آج وہ پھٹے اور میلے کپڑے پہنے سر پر پانی کا کلسا لیے چلی جا رہی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میرے جگر کے ٹکڑے ہو گئے۔ مجھے اپنی زندگی میں کبھی صدمہ نہ ہوا تھا۔ کچھ نہیں کہہ سکتا، اس پر کیا گزر رہی ہے۔"

زہرہ نے پوچھا: "وہ تو اس مالدار کھٹک کے گھر پر تھیں؟"

رما: "ہاں تھی تو، مگر نہیں کہہ سکتا کیوں وہاں سے چلی گئی۔ میرے ساتھ ڈپٹی

صاحب تھے، ان کے سامنے میں اس لیے کچھ پوچھ نہ سکا۔ میں جانتا ہوں وہ مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیتی اور شاید مجھے حقیر سمجھتی ،مگر کم سے کم مجھے اتنا معلوم تو ہو جاتا کہ وہ اس وقت کس حالت میں ہے۔ زہرہ !تم اپنے دل میں چاہے جو سمجھ رہی ہو،لیکن میں اس خیال میں مست ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے اور محبت کرنے والے سے ہم کم سے کم ہمدردی کی امید رکھتے ہیں۔ یہاں ایک بھی ایسا آدمی نہیں، جس سے میں اپنے دل کا درد کہہ سکوں۔ تم بھی مجھے گمراہ کرنے کے لیے بھیجی گئی تھیں ،مگر تمہیں مجھ پر رحم آ گیا۔ شاید تم نے ایک گرے ہوئے آدمی کو ٹھوکر مارنا مناسب نہ سمجھا۔ اگر خدانخواستہ آج ہم میں اور تم میں کسی وجہ سے بدمزگی ہو جائے تو کیا کل تم مجھے مصیبت میں دیکھ کر ذرا بھی ہمدردی نہ کرو گی ۔کیا مجھے بھوکوں مرتے دیکھ کر میرے ساتھ اس سے بہتر سلوک نہ کرو گی ، جو آدمی کتوں کے ساتھ کرتا ہے؟ کیا اس وقت تم میرے ساتھ ذرا بھی ہمدردی نہ کرو گی؟ زہرہ تم اگر چاہو تو جالپا کا پورا پتا لگا سکتی ہو۔ وہ کہاں ہے، کیا کرتی ہے؟ میری طرف سے اس کے دل میں کیا خیال ہے۔ گھر کیوں نہیں جاتی ؟ یہاں کب تک رہنا چاہتی ہے؟

اگر تم جالپا کو گھر جانے پر راضی کر سکو تو میں عمر بھر تمہاری غلامی کروں گا۔ اس خستہ حالی میں میں اسے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے ایسے صدمہ ہو رہا ہے کہ شاید میں آج رات کو یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مجھ پر کیا گزرے گی اس کا مطلق مجھے غم نہیں ہے۔ میں دلیر نہیں ہوں۔ خطرہ کے سامنے ہمیشہ میرا حوصلہ پست ہو جاتا ہے،لیکن میری بے غیرتی بھی یہ چوٹ نہیں سہہ سکتی۔''

زہرہ طوائف تھی، بھلے برے سبھی قسم کے آدمیوں سے اسے سابقہ پڑ چکا تھا۔

آدمیوں کا مزاج پہچانتی تھی۔ اس پردیسی نوجوان میں اسے وہ چیز ملی، جس کا دوسروں میں کہیں پتا نہ تھا۔ اسکی زندگی میں زہرہ کو یہ پہلا آدمی ملا تھا، جس نے اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ ایسے وفادار اور محبت کے پتلے کو وہ مایوس نہ کرسکتی تھی۔ رما کی باتیں سن کر اسے ذرا بھی حسد نہ ہوا، بلکہ اس کے دل میں ایک خودغرضانہ امانت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس موقع پر رما کو خوش کر کے ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنا سکتی تھی۔ جالپا سے اسے کوئی خوف نہ تھا۔ جالپا کتنی ہی حسین کیوں نہ ہو۔ زہرہ اپنی عشوہ طرازی، اپنی دل لبھانے والی اداؤں سے اس کا رنگ پھیکا کرسکتی تھی۔ اس نے بارہا گلزار کھترانیوں کو رلا کر چھوڑ دیا تھا۔ پھر جالپا کس شمار میں تھی۔

زہرہ نے اس کی دلجوئی کر کے کہا: ''تو اس کے لیے تم اتنے رنجیدہ کیوں ہو؟ زہرہ تمہارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ میں کل ہی جالپا کو تلاش کروں گی۔ وہ یہاں رہنا چاہیں گی تو ان کے آرام کا سامان مہیا کروں گی۔ جانا چاہیں گی، تو ریل پر بٹھا دوں گی۔''

رما نے بڑی عاجزی سے کہا: ''ایک بار میں اس سے مل لیتا تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا۔''

زہرہ نے فکرمند ہو کر کہا: ''یہ تو مشکل ہے۔ تمہیں یہاں سے کون جانے دے گا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ میں جالپا کو پارک میں کھڑی کر آؤں۔ تم ڈپٹی صاحب کے ساتھ وہاں جاؤ اور کسی بہانہ سے اس سے مل لو۔''

رما کچھ کہنا چاہتا تھا کہ داروغہ جی نے پکارا: ''مجھے بھی خلوت میں آنے کی اجازت ہے؟''

دونوں سنبھل کر بیٹھے اور دروازہ کھول دیا۔ داروغہ جی مسکراتے ہوئے آئے اور زہرہ کی بغل میں بیٹھ کر بولے: ''یہاں آج سناٹا کیسا؟ کیا آج خزانہ خالی ہے؟ زہرہ آج اپنے دست حنائی سے ایک جام بھر دو۔ رما بھائی جان ناراض نہ ہونا۔''

رما نے ترش ہو کر کہا: ''اس وقت رہنے دیجیے داروغہ جی۔ آپ تو پیئے ہوئے نظر آتے ہیں۔''

داروغہ نے زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ''بس ایک جام زہرہ اور پھر ایک رات اور آج میری مہمانی قبول کرو۔''

رما نے گرم ہو کر کہا: ''آپ اس وقت یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا۔''

دونوں آدمیوں میں بحث ہونے لگی۔ داروغہ کا اصرار تھا کہ زہرہ اس کے ساتھ جائے۔ رما کہتا ہے، اس وقت وہ ہرگز نہیں جا سکتی۔ اگر وہ گئی تو میں اس کا اور آپ کا خون پی جاؤں گا۔ آخر داروغہ صاحب نے زہرہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ رما اب ضبط نہ کر سکا۔ اس نے داروغہ کو دھکا دے کر باہر نکال دیا اور دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ داروغہ مضبوط آدمی تھا لیکن اس وقت نشہ نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ باہر برآمدے میں کھڑے ہو کر گالیاں بکنے اور دروازہ پر ٹھوکریں مارنے لگا۔

رما نے زہرہ سے کہا: ''کہو تو جا کر بچہ کو برآمدے کے نیچے دھکیل دوں؟''

زہرہ: ''بکنے دو۔ آپ ہی چلا جائے گا۔ شاید چلا گیا۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ سور کو نکال باہر کیا۔ مجھے لے جا کر دق کرتا۔''

زہرہ: ''اور جو وہ کل سے مجھے نہ آنے دے؟''

رما: ''اگر اس نے ذرا بھی شرارت کی تو گولی مار دوں گا۔ وہ دیکھو طاق پر پستول رکھا ہوا ہے۔ تم اب میری ہو زہرہ! میں نے اپنا سب کچھ تمہارے اوپر نثار کردیا۔ کسی دوسرے آدمی کو ہمارے بیچ میں آنے کا حق نہیں ہے۔ جب تک میں نہ مر جاؤں۔''

(48)

رما سارا دن بیتاب رہا۔ کبھی مایوسی کی اندھیری گھاٹیاں سامنے آ جاتیں۔ کبھی امید کی لہراتی ہوئی ہریالی۔ زہرہ، جالپا کی تلاش میں گئی بھی ہوگی۔ یہاں سے تو بڑے لمبے چوڑے وعدے کر کے گئی تھی مگر اسے کیا غرض ہے۔ آ کر کہہ دے گی، ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ کہیں جا کر ڈپٹی صاحب سے سارا راز فاش کر دے تو بیچاری جالپا پر بیٹھے بٹھائے آفت آ جائے، مگر زہرہ اتنی سفلہ مزاج نہیں ہے۔ اگر زہرہ جیسی عورت اتنی بے وفا ہو سکتی ہے تو یہ دنیا رہنے کے قابل نہیں۔ رما کو وہ دن یاد آئے جب اس کے دفتر سے آتے ہی جالپا اس کی جیب ٹٹولتی تھی اور روپے نکال لیتی تھی۔ وہی جالپا آج اتنی پاک نفس ہوگئی۔ تب وہ پیار کرنے کی چیز تھی۔ اب وہ پرستش کی چیز ہے۔

رما کو اپنی اس غلطی پر افسوس ہو رہا تھا، جو اس نے جالپا کی بات نہ مان کر کی تھی۔ اگر اس نے اس کی مرضی کے مطابق جج کے اس اجلاس میں اپنا بیان بدل دیا

ہوتا، دھمکیوں میں نہ آتا تو اس کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ جالپا کے ساتھ وہ ساری مصیبتیں جھیل جاتا۔ اس محبت اور عقیدت کا خول پہن کر وہ مخالفوں کا کامیابی سے مقابلہ کرتا۔ اگر اسے پھانسی بھی ہو جاتی تو وہ ہنستے کھیلتے اس پر چڑھ جاتا۔

مگر پہلے اس سے چاہے جو غلطی ہوئی ہو، اس وقت تو وہ غلطی سے نہیں، جالپا کی خاطر سے یہ تکلیف جھیل رہا تھا۔ آخر پولیس والوں کے دل میں اپنا اعتبار پیدا کرنے کے لیے وہ اور کیا کرتا۔ یہ شیطان جالپا کو ستاتے۔ اس کو رسوا کرتے۔ اس پر جھوٹے مقدمے چلاتے۔ وہ حالت تو اور بھی ناقابل برداشت ہوتی۔ وہ خود پست ہمت ہے اور ذلت برداشت، جالپا شاید جان ہی دے دیتی۔

اسے آج معلوم ہوا کہ وہ جالپا کو ترک نہیں کر سکتا اور زہرہ کو ترک کرنا بھی اس کے لیے محال معلوم ہوتا تھا۔ کیا وہ دونوں کو خوش رکھ سکتا ہے۔ کیا ان حالات میں جالپا اس کے ساتھ رہنا قبول کرے گی۔ ہرگز نہیں۔ وہ شاید کبھی اسے معاف نہ کرے گی۔ جالپا کو اگر یہ بھی معلوم ہو جائے کہ رما اس کی خاطر اذیتیں بھوگ رہا ہے تو بھی وہ اسے الزام سے سبکدوش نہ کرے گی۔

وہ دن بھر اسی ادھیڑبن میں پڑا رہا۔ نہانے اور کھانے کا وقت ٹل گیا۔ اسے کسی بات کی پروا نہ تھی۔ اخبار سے دل بہلانا چاہا۔ ناول لے کر بیٹھا، مگر کسی کام میں کل نہ لگا۔ آج داروغہ جی بھی نہیں آئے۔ یا تو رات کے واقعہ سے ناراض ہو گئے یا نادم۔ رما نے کسی سے اس کے متعلق پوچھا بھی نہیں۔

رات کے دس بج گئے، مگر زہرہ کا کہیں پتا نہ تھا۔ پھاٹک بند ہو گیا۔ رما کو اب اس کے آنے کی امید نہ رہی۔ پھر بھی دروازے کی طرف اس کے کان لگے ہوئے

تھے۔ کیا جالپا اسے ملی ہی نہیں۔ اس نے ارادہ کیا کہ اگر کل زہرہ نہ آئی تو کسی کو اس کے گھر بھیجے گا۔

علی الصبح وہ داروغہ کے پاس جا کر بولا: ''پرسوں رات تو آپ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھے۔''

داروغہ نے حسد کو چھپاتے ہوئے کہا: ''میں محض آپ کو چھیڑ رہا تھا۔''

رما: ''زہرہ رات کو آئی ہی نہیں۔ ذرا کسی کو بھیج کر پتا تو لگوایئے، ماجرا کیا ہے؟''

داروغہ نے بے اعتنائی سے کہا: ''اسے غرض ہوگی خود آئے گی۔ کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

رما نے پھر اصرار نہ کیا۔ سمجھ گیا یہ حضرت اس سے جلے ہوئے ہیں۔ اب اور کس سے پوچھے۔

کئی دن تک زہرہ سے اس کی ملاقات نہ ہوئی۔ اب اس کے آنے کی کوئی امید نہ تھی۔ رما نے سوچا زہرہ بے وفا نکلی یا ممکن ہے پولیس والوں نے اسے آنے کی ممانعت کر دی ہو۔ کم سے کم مجھے ایک خط تو لکھ سکتی تھی، مگر اس کا ضمیر کہتا تھا کہ زہرہ بے وفائی نہیں کر سکتی۔

آٹھواں دن تھا۔ آج ایک بہت اچھا فلم ہونے والا تھا۔ داروغہ نے رما سے کہا تو وہ چلنے کو تیار ہو گیا۔ کپڑے پہن رہا تھا کہ زہرہ آ پہنچی۔ رما نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ پھر آئینہ میں اپنے بال سنوارنے لگا، مگر اسے دیکھ کر تعجب ہوا کہ زہرہ محض ایک سفید ساڑھی پہنے ہوئے ہے۔ ایک بھی زیور اس کے جسم پر نہ تھا۔ ہونٹ

سوکھے ہوئے تھے اور چہرے پر معشوقانہ شوخی کی جگہ متانت جھلک رہی تھی۔

وہ ایک منٹ تک کھڑی رہی۔تب رما کے پاس جا کر بولی: ''کیا مجھ سے ناراض ہو گئے حضور؟ اس لیے کہ میں اتنے دنوں آئی کیوں نہیں؟''

رما نے روکھے پن سے جواب دیا: ''اگر تم اب بھی نہ آتیں تو میرا کیا اختیار تھا؟''

زہرہ نے مسکرا کر کہا: ''یہ اچھی دل لگی ہے۔آپ ہی نے تو ایک کام سونپا اور جب وہ کام کر کے لوٹی تو آپ بگڑ بیٹھے۔وہ کام تم نے آسان سمجھا تھا کہ چٹکیوں میں پورا ہو جاتا۔تم نے مجھے اس عورت کے پاس بھیجا تھا جو اوپر سے موم اور اندر سے پتھر۔جو اتنی نازک ہو کر بھی اتنی مضبوط ہے۔''

رما نے بے توجہی سے پوچھا: ''ہے کہاں، کیا کرتی ہے؟''

زہرہ: ''اسی ونیش کے گھر ہے جسے پھانسی کی سزا ہو گئی ہے۔اس کے دو بچے ہیں۔بیوی ہے اور ماں ہے۔دن بھر انہی بچوں کو لیے رہتی ہے۔بڑھیا کے لیے ندی سے پانی لاتی ہے۔گھر کا سارا کام کاج کرتی ہے اور جب فرصت پاتی ہے تو ان کے لیے چندہ مانگنے نکل جاتی ہے۔وہ خاندان بڑی تکلیف میں تھا۔کوئی مددگار نہ تھا۔دوست سبھی منہ پھیر بیٹھے تھے۔کئی فاقے تک ہو چکے تھے۔جالپا نے جا کر انہیں جلا لیا۔''

رما کی ساری بے دلی کافور ہو گئی۔جوتے پہننا بھول گیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔تم کھڑی کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔شروع سے کہو۔ایک بات بھی مت چھوڑنا۔تم پہلے اس کے پاس کیسے پہنچیں.....؟ کیسے پتا چلا؟''

زہرہ: ''کچھ نہیں، پہلے اس دینی دین کے گھر کا پتا دیا۔ بس وہاں جا پہنچی۔''

رما: ''تم نے اسے جا کر پکارا۔ تمہیں دیکھ کر کچھ جھجکتی تو ضرور ہو گی؟''

زہرہ مسکرا کر بولی: ''میں اس شکل میں نہ تھی۔ دینی دین کے گھر سے نکل کر میں اپنے گھر گئی اور برہم سماج عورت کا سوانگ بھرا۔ نہ جانے مجھ میں ایسی کون سی بات ہے، جس سے دوسرے فوراً بھانپ جاتے ہیں کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں اور براہموں لیڈیوں کو دیکھتی ہوں۔ کوئی ان کی طرف آنکھیں نہیں اٹھاتا۔ میرا لباس وہی ہے۔ میں بھڑکیلے کپڑے اور زیور بالکل نہیں پہنتی۔ پھر بھی سب لوگ میری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں۔ میری اصلیت نہیں چھپتی۔ مجھے یہی خوف تھا کہ کہیں جالپا بھانپ نہ جائے۔ نیا سوانگ بھر کر میں وہاں پہنچی تو وہ کیا کوئی بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ میں نے ونیش کے گھر جا کر اس کی ماں سے بات چیت شروع کی۔ اپنا گھر منگیر بتلایا۔ بچوں کے لیے مٹھائی لیتی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ جو پارٹ میں کھیلنے گئی تھی، وہ میں نے کامیابی کے ساتھ کھیلا۔

دونوں عورتیں رونے لگیں۔ اسی اثنا میں جالپا بھی گنگا جل لیے آ پہنچی۔ میں نے ونیش کی ماں سے بنگلہ میں پوچھا: ''یہ کون ہے؟''

اس نے کہا یہ بھی تمہاری ہی طرح ہم لوگوں کے غم میں شریک ہونے کے لیے آ گئی ہے۔ یہاں اس کا شوہر کسی دفتر میں نوکر ہے۔ روز سویرے آ جاتی ہے اور بچوں کو گھمانے لے جاتی ہے۔ میرے لیے روز ندی سے گنگا جل لاتی ہے۔ ہمارے کوئی آگے پیچھے نہ تھا۔ بچے دانے دانے کو ترستے تھے۔ جب سے یہ آ گئی ہے، ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ ہم نے نہ جانے کون سی تپسیا کی تھی جس کا یہ

بر دان ہمیں ملا ہے۔ اس گھر کے سامنے ہی ایک چھوٹا سا باغ ہے۔ محلے بھر کے بچے وہیں کھیلا کرتے ہیں۔

شام ہوگئی تھی جالپا دیوی نے دونوں بچوں کو ساتھ لیا اور پارک کی طرف چلیں۔ میں جو مٹھائی لے گئی تھی، اس میں سے بڑھیا نے ایک ایک مٹھائی دونوں بچوں کو دی۔ دونوں خوش ہو کر ناچنے لگے۔ بچوں کی اس خوشی پر مجھے رونا آ گیا۔ جب پارک میں دونوں بچے کھیلنے لگے تو جالپا سے میری باتیں ہونے لگیں۔''

رما نے کرسی اور قریب کھینچ لی اور آگے کو جھک گیا۔ بولا: ''کس طرح بات چیت شروع کی؟''

زہرہ: ''کہہ رہی ہوں میں نے پوچھا جالپا دیوی گھر کی دونوں عورتوں سے تمہاری تعریف سن کر میں تمہارے اوپر عاشق ہوگئی ہوں۔''

رما: ''بالکل یہی الفاظ تھے؟''

زہرہ: ''بالکل یہی۔''

''میری طرف تعجب سے دیکھ کر بولیں: ''بنگالن نہیں معلوم ہوتیں۔ اتنی صاف ہندی کوئی بنگالن نہیں بولتی۔''

میں نے کہا: ''میں منگیر کی رہنے والی ہوں اور یہاں مسلمان عورتوں سے میری بہت آمد و رفت ہے۔ آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کہاں رہتی ہیں؟ کبھی کبھی دو گھڑی کے لیے چلی آؤں گی۔ تمہاری محبت میں شاید میں بھی آدمی بن جاؤں۔

جالپا نے شرما کر کہا: ''تم تو مجھے بنانے لگیں۔ بھن کہاں تم کالج کے پڑھنے

والی، کہاں میں جاہل گنوار عورت۔ تم سے مل کر میں البتہ آدمی بن جاؤں گی۔ جب جی چاہے، یہیں چلی آنا، یہیں میرا گھر سمجھو۔"

میں نے کہا: "تمہارے شوہر بہت شریف معلوم ہوتے ہیں کہ تمہیں آزادی دے رکھی ہے۔ کس دفتر میں ہیں؟"

جالپا نے اپنے ناخنوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "پولیس میں امیدوار ہیں۔"

میں نے تعجب سے پوچھا: "پولیس میں رہتے ہوئے بھی انہوں نے تمہیں یہاں آنے کی آزادی دے دی؟"

جالپا اس سوال کے لیے تیار نہ تھی۔ کچھ چونک کر بولی: "وہ مجھ سے کچھ نہیں کہتے۔ میں نے ان سے یہاں آنے کا کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔ وہ گھر بہت کم آتے ہیں۔ وہیں پولیس والوں کے ساتھ رہتے ہیں۔"

میں نے پوچھا: "تم اپنے شوہر کے ذریعے سے میری ملاقات اس مخبر سے کرا سکتی ہو جس نے ان بے گناہوں کے خلاف شہادت دی؟"

رمانا تھ کی آنکھیں فرط اشتیاق سے پھیل گئیں اور چھاتی دھک دھک کرنے لگی۔ زہرہ نے پھر اپنا قصہ کہنا شروع کیا۔

یہ سن کر جالپا دیوی نے مجھے تیز نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا: "اس سے مل کر کیا کرو گی؟"

میں نے کہا: "میں اس بھلے آدمی سے صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم نے اتنے بے گناہوں کو پھنسا کر کیا پایا۔ صرف یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ کیا جواب دیتا

ہے۔''

جالپا کا چہرہ یکایک سرخ ہو گیا۔ بولیں: ''وہ کہہ سکتا ہے میرا فائدہ اسی میں تھا۔ ساری دنیا اپنے فائدے کے لیے مرتی ہے۔ میں نے بھی اپنا فائدہ اس میں سوچا۔ جب پولیس کے صدہا آدمیوں سے یہ سوال کوئی نہیں کرتا تو اسی غریب سے یہ سوال کیوں کیا جائے؟''

میں نے پوچھا: ''اچھا ذرا دیر کے لیے فرض کر لو، تمہارا شوہر ہی مخبر ہوتا تو تم کیا کرتیں؟''

جالپا نے میری طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر کہا: ''تم مجھ سے یہ سوال کیوں کرتی ہو؟ خود اپنے دل میں اس کا جواب کیوں نہیں ڈھونڈتیں؟''

میں نے کہا: ''میں تو ان سے کبھی نہ بولتی۔ نہ کبھی ان کی صورت دیکھتی۔''

جالپا نے دور نگے پن سے جواب دیا: ''شاید میں بھی ایسا ہی سمجھتی یا ممکن ہے نہ سمجھتی۔ کچھ کہہ نہیں سکتی۔ آخر پولیس والوں کے گھروں میں بھی تو عورتیں ہیں۔ وہ کیوں اپنے شوہروں سے کچھ نہیں کہتیں۔ جس طرح ان کے دل اپنے مردوں کے لیے ہو گئے ہیں، ممکن ہے میرا دل بھی ویسا ہی ہو جاتا۔''

اتنے میں اندھیرا ہو گیا۔ جالپا دیوی نے کہا: ''اب مجھے دیر ہو رہی ہے بہن! بچے ساتھ ہیں۔ ممکن ہو تو کل پھر ملیے گا۔ آپ کی باتیں نہایت دلچسپ ہوتی ہیں۔''

میں چلنے لگی تو انہوں نے چلتے چلتے مجھ سے کہا: ''ضرور آیئے گا۔ میں یہیں ملوں گی۔ آپ کا انتظار کرتی رہوں گی۔ ہاں میں نے آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں؟

''

میں نے اپنا نام بتلا دیا۔

رما نے کہا: ''یہ تم نے بڑا غضب کیا۔''

زہرہ بولی: ''نام بتلانے میں کیا ہرج تھا۔ پہلے تو وہ چونکیں، مگر شاید سمجھ گئیں۔ بنگالی مسلمان ہوگی۔ جب وہ چلنے لگیں۔ تو میں نے کہا: آپ سے باتیں کر کے ابھی سیری نہیں ہوئی۔ اگر کوئی ہرج نہ سمجھو۔ تو میں بھی تمہارے گھر تک چلوں۔ راستہ میں باتیں ہوں گی۔ جالپا راضی ہو گئیں۔ ہم دونوں چلے۔ اس ذرا سے کنگھرے میں نہ جانے وہ کیونکر رہتی ہیں۔ تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں ہے۔ کہیں مٹکے ہیں، کہیں کھاٹ، کہیں صندوق، نمی سے دیواریں تر ہو رہی تھیں اور تعفن کے مارے ناک پھٹ جاتی تھی۔ کھانا تیار ہو گیا تھا۔ ونیش کی بیوی برتن دھو رہی تھی۔ جالپا دیوی نے اسے اٹھا کر کہا۔ بچوں کو کھلا کر سلا دو۔ میں برتن دھوئے دیتی ہوں۔ ان کی اس بے نفسی کا میرے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ میں بھی وہیں بیٹھ گئی اور مانجھے ہوئے برتنوں کو دھونے لگی۔

جالپا نے میرے ہاتھوں سے برتن چھین لینا چاہے، لیکن جب میں اپنی جگہ سے نہ ہلی تو انہوں نے پانی کا مٹکا الگ ہٹا کر کہا: میں پانی نہ دوں گی۔ تم یہاں سے اٹھ جاؤ۔ مجھے بڑی شرم آتی ہے۔ تمہیں میری قسم ہٹ جاؤ۔ تم نے اپنی زندگی میں ایسا کام کاہے کو کیا ہوگا۔

میں نے کہا: تم نے بھی تو نہیں کیا ہوگا؟

جالپا نے کہا: میری اور بات ہے۔

میں نے پوچھا: کیوں، جو بات تمہارے لیے ہے وہی بات میرے لیے ہے۔کوئی مہری کیوں نہیں رکھ لیتی۔

جالپا نے کہا: مہریاں آٹھ آٹھ روپے مانگتی ہیں۔

میں بولی: میں آٹھ روپے مہینہ دے دیا کروں گی۔

جالپا نے ایسی نگاہوں سے میری طرف دیکھا، جس میں سچی محبت کے ساتھ سچی خوشی اور دعائے خیر بھری ہوئی تھی۔ کتنی پاکیزہ نگاہ ہے اس کی۔اس بے غرض خدمت کے سامنے مجھے اپنی زندگی کتنی حقیر، کتنی قابل نفرت معلوم ہو رہی تھی۔ان برتنوں کو دھونے میں مجھے جو لطف آیا، اسے بیان نہیں کر سکتی۔ برتن دھونے کے بعد جالپا دیوی بڑھیا کے پاؤں دبانے بیٹھ گئیں۔ میں کھڑی یہ پاک نظارہ دیکھ رہی تھی۔

نو بجے ہم دونوں وہاں سے چلے۔راستے میں جالپا نے کہا: زہرہ تم سمجھتی ہو گی میں ان لوگوں کی یہ خدمت کر رہی ہوں۔ یہ بات نہیں ہے۔ میں دراصل اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہی ہوں۔ مجھ سے زیادہ بدنصیب عورت دنیا میں نہ ہو گی۔

میں نے انجان بن کر کہا: اس کا مطلب میں نہیں سمجھی۔

جالپا نے پرحسرت لہجے میں کہا: کبھی موقع آئے گا تو بتا دوں گی۔

میں نے کہا: تم مجھے چکر میں ڈالے دیتی ہو بہن۔ جب تک اس کا مطلب نہ سمجھا دو گی، میں تمہارا گلا نہ چھوڑوں گی۔

جالپا نے لمبی سانس کھینچ کر کہا: زہرہ! کسی بات کو خود چھپائے رہنا اس سے

زیادہ آسان ہے کہ دوسروں پر وہ بوجھ رکھوں۔

کچھ دور تک ہم دونوں خاموش چلتے رہے۔ یکا یک جالپا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: زہرہ اگر اس وقت تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں کون ہوں تو شاید تم نفرت سے منہ پھیر لوگی اور میرے سائے سے دور بھاگوگی۔

ان الفاظ میں خدا جانے کیا جادو تھا کہ میرے سارے روئیں کھڑے ہو گئے۔ یہ ایک رنج اور شرم سے بھرے ہوئے دل کی نورانی صدا تھی، جس نے میرے سیاہ کارناموں کو واضح کر دیا۔ میرے جی میں ایسا آیا کہ اپنا سارا سوانگ کھول دوں۔ میں نے بڑے بڑے گرگ باراں دیدہ اور چھپے ہوئے شہدوں اور پولیس افسروں کو چیرٹ غٹو بنایا ہے، مگر جالپا دیوی کے سامنے میرے منہ سے آواز تک نہ نکلتی تھی۔ معلوم نہیں کس طرح میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ بولی:

یہ تمہارا خیال غلط ہے دیوی جی۔ شاید تب میں تمہارے پیروں پر گر پڑوں گی۔ اپنی یا اپنوں کی برائیوں پر شرمندہ ہونا پاک نفسوں ہی کا کام ہے۔

جالپا نے کہا: تو کلیجہ مضبوط کر کے سن لو، میں اس مخبر کی بدنصیب بیوی ہوں۔ جس نے ان بے گناہوں پر یہ آفت ڈھائی ہے۔ ہم لوگ الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ ایک ایسا واقعہ ہوا کہ انہیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔

رمانے کہا: ''اس کا تو قصہ ہے کبھی تم سے بتاؤں گا۔''

زہرہ بولی: یہ سب مجھے دوسرے دن معلوم ہو گیا۔ اب میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ جالپا نے اپنی کوئی بات شاید ہی مجھ سے چھپائی ہو۔ کہنے لگی:

زہرہ میں بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ ایک طرف تو ایک آدمی کی جان اور

کئی خاندانوں کی تباہی ہے۔ دوسری طرف اپنی ذلت اور رسوائی ہے۔ میں چاہوں تو آج ان سبھوں کی جان بچا سکتی ہوں۔ میں عدالت کو ایسا ثبوت دے سکتی ہوں کہ مخبر کی شہادت کی کوئی وقعت ہی نہ رہ جائے گی۔ بس اسی دبدھے میں پڑی اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں۔ نہ تو یہی ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کو مرنے دوں اور نہ یہی ہو سکتا ہے کہ رما کو آگ میں جھونک دوں۔ میں خود مر جاؤں گی، پر انہیں ایذا نہیں پہنچا سکتی۔ ابھی دیکھ رہی ہوں ہائی کورٹ سے کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ نہیں کہہ سکتی، اس وقت میں کیا کر بیٹھوں۔ شاید اسی دن زہر کھا کر سو رہوں۔

دیبی دین کا گھر آ گیا۔ ہم دونوں رخصت ہوئے۔ جالپا نے مجھ سے بہت اصرار کیا کہ کل کسی وقت پھر آنا۔ انہیں صرف شام کو باتیں کرنے کی فرصت ملتی ہے۔ وہ اتنے روپے جمع کر دینا چاہتی ہیں کہ کم سے کم ونیش کے گھر والوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ ایک ہزار سے زیادہ جمع کر چکی ہیں۔ میں نے بھی پچیس روپے ان کی نذر کیے۔ میں نے دو ایک بار کنایتاً کہا کہ آپ اس زحمت میں نہ پڑیں، لیکن جب جب میں نے اس کا اشارہ کیا، انہوں نے ایسا منہ بنایا گویا اب وہ یہ بات سننا بھی نہیں چاہتیں۔''

ذرا دم لے کر زہرہ نے پھر کہا: ''میں نے ایک بات سوچی ہے۔ کہو تو بتاؤں؟''

رما نے اس طرح سے کہا: ''گویا اس کا دھیان کہیں اور ہے۔ کیا بات ہے؟''

زہرہ: ''انسپکٹر صاحب سے کہہ دوں۔ وہ جالپا کو الہ آباد پہنچا دیں۔ بس عورتیں سٹیشن تک انہی باتوں میں لگالے جائیں۔ جوں ہی گاڑی چلے، انہیں اس میں

بٹھادیں۔اس کے سوا اور کوئی تدبیر مجھے نظر نہیں آتی۔''

رمانے زہرہ کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر کہا: ''کیا یہ مناسب ہوگا؟''

زہرہ شرمندہ ہو کر بولی: ''اور کیا کیا جائے؟''

رمانے چٹ پٹ جوتے پہن لیے اور زہرہ سے پوچھا: ''اس وقت وہ دیبی دین کے ہی گھر پر ہوں گی؟''

زہرہ نے اس کا راستہ روک کر کہا: ''تو کیا اسی وقت جاؤ گے؟''

رما: ''ہاں زہرہ! اسی وقت جاؤں گا۔بس ان سے دو باتیں کر کے وہیں جاؤں گا......... جہاں مجھے اب سے بہت پہلے جانا چاہیے تھا۔''

زہرہ: ''مگر کچھ سوچ تو لو۔نتیجہ کیا ہوگا؟''

رما: ''خوب سوچ چکا۔زیادہ سے زیادہ دروغ بیانی کے جرم میں تین چار سال قید۔بس اب رخصت! بھول مت جانا زہرہ! شاید پھر کبھی ملاقات ہو۔''

رما برآمدے سے اتر کر صحن میں آیا اور ایک لمحہ میں پھاٹک کے باہر تھا۔زہرہ بے حس و حرکت کھڑی اسے حسرت بھری آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔رما پر اس کا دل کبھی اتنا فریفتہ نہ ہوا تھا جیسے کوئی ناگن اپنے محبوب کو میدان کارزار کی طرف جاتے دیکھ کر غرور سے پھولی نہ سماتی ہو۔

چوکیدار نے لپک کر داروغہ سے یہ خبر کہی۔بیچارے کھانا کھا کر لیٹے ہی تھے۔گھبرا کر نکلے اور رما کے پیچھے دوڑے۔بابو صاحب ذرا سنیے تو۔ایک منٹ رک جائیے۔اس سے کیا فائدہ۔کچھ معلوم تو ہو آپ کہاں جا رہے ہیں۔آخر بے چارے ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔رمانے لوٹ کر انہیں اٹھایا اور پوچھا: ''کہیں چوٹ تو

نہیں آئی؟''

داروغہ: ''نہیں ذرا ٹھوکر کھا گیا تھا۔ آخر آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں۔ سوچیے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟''

رما نے داروغہ کو چکمہ دیتے ہوئے کہا: ''جالپا کو شاید مخالفوں نے پٹی پڑھائی ہے کہ تو ہائی کورٹ میں ایک درخواست دے دے۔ ذرا اسے جا کر سمجھاؤں گا۔''

داروغہ نے پوچھا: ''یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''زہرہ کہیں سے سن آئی ہے۔''

''تمہاری بیوی ہو کر تمہارے ساتھ اتنا دغا۔ ایسی عورت کا سر کاٹ لینا چاہیے۔''

''اسی لیے تو جا رہا ہوں یا تو اسی وقت اسے سٹیشن پر بھیج کر آؤں گا یا اس سے بری طرح پیش آؤں گا کہ وہ بھی یاد کرے گی۔''

''میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

''جی نہیں، بالکل معاملہ بگڑ جائے گا۔''

داروغہ لاجواب ہو گیا۔ ایک منٹ تک کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ پھر لوٹ پڑا۔ ادھر رما نے ایک تانگہ لیا اور دینی دین کے گھر جا پہنچا۔

تھوڑی دیر قبل جالپا ونیش کے گھر سے پہنچی تھی کہ اتنے میں رما نے نیچے سے آواز دی۔ دینی دین نے کہا: ''بھیا ہیں شاید؟''

جالپا: ''کہہ دو یہاں کیا کرنے آئے ہیں، وہیں جائیں۔''

دینی: ''نہیں نہیں، ذرا پوچھ تو لوں کیا کہتے ہیں۔ اتنی رات گئے انہیں چھٹی

کیسے ملی؟''

جالپا: ''مجھے سمجھانے آئے ہوں گے اور کیا لیکن منہ دھو رکھیں۔''

دینی دین نے دروازہ کھول دیا۔ رما نے اندر آ کر کہا: ''دادا تم مجھے یہاں دیکھ کر اس وقت تعجب کر رہے ہو گے۔ ایک گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا ہوں۔ تم لوگوں سے اپنے بہت سے گناہوں کو معاف کرانا تھا۔ جالپا اوپر ہیں؟''

دینی دین: ''ہاں ہیں تو۔ ابھی آئی ہیں۔ بیٹھو، کچھ کھانے کو لاؤں؟''

رما: ''نہیں میں کھانا کھا چکا ہوں۔ بس جالپا سے دو دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

دینی: ''جب وہ تم سے ملیں بھی۔''

رما: ''کیا میری صورت سے اتنی نفرت ہے۔ ذرا پوچھ تو لو۔''

دینی: ''اس میں پوچھنا کیا ہے۔ دونوں بیٹھی تو ہیں۔ تمہارا گھر جیسے تب، ویسے اب ہے۔''

رما: ''نہیں دادا، ان سے پوچھ لو۔ میں یوں نہ جاؤں گا۔''

دینی دین نے اوپر جا کر کہا: ''تم سے کچھ کہنا چاہتے ہیں بہو۔''

جالپا نے منہ لٹکا کر کہا: ''تو کہتے کیوں نہیں۔ کیا میں نے ان کی زبان بند کر دی ہے؟''

جالپا نے یہ الفاظ اتنے زور سے کہے کہ نیچے رما نے بھی سن لیے۔ کتنے دل آزار الفاظ تھے۔

رما کا سارا شوق ملاقات غائب ہو گیا۔ نیچے ہی کھڑے کھڑے بولا: ''وہ اگر مجھ سے نہیں بولنا چاہتیں تو کوئی زبردستی نہیں ہے۔ میں اس وقت جج صاحب کے

پاس جا رہا ہوں۔ ان سے سارا قصہ کہوں گا۔ میری عقل پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ جالپا کی محبت اور تکلیفوں کے خوف نے میری عقل میں فتور ڈال دیا تھا۔ جیسے کوئی نحوست سر پر سوار تھی۔ تم لوگوں کی دعاؤں نے وہ نحوست دور کر دی۔ شاید دو چار سال کے لیے سرکار کی مہمانی قبول کرنی پڑے، جیتا رہا تو پھر ملاقات ہوگی۔ نہیں تو میری برائیوں کو معاف کرنا اور بھول جانا۔ تم بھی دادا اور اماں تم بھی، میرے قصوروں کو معاف کرنا۔ تم لوگوں نے میرے ساتھ جو احسانات کیے ہیں، اگر جیتا لوٹا تو شاید تم لوگوں کی کوئی خدمت کر سکوں۔ میری تو زندگی خراب ہوگئی۔ نہ دین کا ہوا نہ دنیا کا۔ جالپا دیوی سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں نے ہی ان کے زیور چرائے تھے۔ صراف کو دینے کے لیے روپوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے مجھ کو یہ فعل کرنا پڑا۔ بس یہی کہنے آیا تھا۔''

رما برآمدے کے نیچے اتر پڑا اور تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔ جالپا بھی نیچے اتری لیکن رما کا پتا نہ تھا۔ برآمدے کے نیچے اتر کر دیبی دین سے پوچھا: ''کدھر گئے ہیں دادا؟''

دیبی دین نے کہا: ''میں نے کچھ نہیں دیکھا ہے۔ بہو میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ اب نہ ملیں گے، دوڑ گئے ہیں۔''

جالپا کئی منٹ تک سڑک پر بے خودی کی سی حالت میں کھڑی رہی۔ انہیں کیسے روک لے۔ اس وقت وہ کتنے مایوس ہیں۔ وہ پچھتا رہی تھی کہ انہیں ذرا دیر کے لیے اوپر کیوں نہیں بلایا۔ آئندہ کا حال کون جانتا ہے۔ نہ جانے کب ملاقات ہو یا نہ ہو۔ شادی ہونے کے اس دو ڈھائی سال کے اندر کبھی اس کا دل محبت سے

اتنا بے تاب نہ ہوا تھا۔ نمود و آسائش کے جنون میں اس نے خانۂ محبت کی دیواروں کو ہی دیکھا تھا۔ وہ اسی میں خوش تھی۔ رفیق حیات بن کر اس نے خانۂ محبت کے اندر قدم رکھا تھا۔ کتنا دلفریب نظارہ تھا۔ کتنی دل آویز نکہت جہاں کی ہوا میں، روشنی میں اور فضا میں تقدس کی جھلک تھی۔ محبت اپنی معراج پر پہنچ کر پرستش بن جاتی ہے۔

اتنے میں زہرہ آ گئی۔ جالپا کو سڑک پر دیکھ کر بولی: ''یہاں کیسے کھڑی ہو جالپا؟ آج تو میں نہ آ سکی۔ چلو آج مجھے تم سے بہت کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

(49)

داروغہ کو بھلا کہاں چین۔ رما کے جانے کے بعد ایک گھنٹہ تک اس کا انتظار کرتے رہے۔ پھر گھوڑے پر سوار ہوئے اور دیبی دین کے گھر جا پہنچے۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ رما کو یہاں سے گئے آدھے گھنٹے سے اوپر ہو گیا۔ انہیں اعتبار نہ آیا۔ پہلے نیچے کی کوٹھری دیکھی۔ پھر اوپر چڑھ گئے۔ سمجھا رما وہاں چھپا بیٹھا ہو گا۔ وہاں تین عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ زہرہ کو شرارت سوجھی تو اس نے لمبا سا گھونگھٹ نکال لیا اور اپنے ہاتھ ساڑھی میں چھپا لیے۔ داروغہ کو شک ہوا۔ شاید رما بھیس بدلے ہوئے بیٹھا ہے۔ دیبی دین سے پوچھا: ''یہ تیسری عورت کون ہے؟''

دیبی دین نے کہا: ''میں نہیں جانتا۔ کبھی کبھی بہو سے ملنے آ جاتی ہیں۔''

داروغہ: ''مجھ سے اڑتے ہو بچہ۔ ساڑھی پہنا کر ملزم کو چھپانا چاہتے ہو۔ جالپا

دیوی سے کہہ دو نیچے چلی جائیں، اس گھونگھٹ والی عورت کو یہیں رہنے دو۔''

جالپا چلی گئی تو داروغہ نے زہرہ کے پاس جا کر کہا: ''کیوں حضرت مجھ سے یہ چالیں۔ وہاں سے کیا کہہ کر آئے تھے اور یہاں مزے میں ہی آ گئے۔ اب یہ بھیس اتاریئے اور میرے ساتھ چلیے دیر ہو رہی ہے۔''

یہ کہہ کر انہوں نے زہرہ کا گھونگھٹ اٹھا دیا۔ زہرہ نے قہقہہ مارا۔ داروغہ جی گویا پھسل کر حیرت کے گڑھے میں گر پڑے: ''ارے زہرہ تم یہاں کہاں؟''

زہرہ نے کہا: ''اپنی ڈیوٹی بجا رہی ہوں۔''

''اور رمانا تھ کہاں گئے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہو گا؟''

''وہ تو میرے یہاں آنے سے پہلے ہی چلے گئے تھے۔''

''اچھا ذرا میرے ساتھ آؤ۔ اس کا پتا لگانا ہے۔''

''کیا ابھی تک بنگلے پر نہیں پہنچے؟''

''وہ، نہ جانے کہاں گئے۔''

زہرہ داروغہ جی کے ساتھ چلی تو انہوں نے راستے میں پوچھا: ''جالپا کب تک یہاں سے جائے گی؟''

زہرہ: ''میں نے خوب پٹی پڑھائی ہے۔ اب اس کی یہاں سے جانے کی ضرورت نہیں۔ رمانا تھ نے بری طرح ڈانٹا ہے۔''

''تمہیں یقین ہے، اب یہ کوئی شرارت نہ کرے گی؟''

''ہاں میرا تو یہی خیال ہے۔''

''تو پھر یہ حضرت کہاں چلے گئے؟''

”کہہ نہیں سکتی، پیئے ہوئے تھے۔“

”تو کہیں گرا پڑا ہوگا۔اس نے بہت دق کیا ہے۔میں ذرا ڈپٹی صاحب کے پاس جاتا ہوں۔آؤ تمہیں تمہارے گھر تک پہنچادوں۔“

”بڑی عنایت ہوگی۔“

ذرا دیر میں زہرہ کا مکان آ گیا۔وہ اتر کر زینے کی طرف چلی،مگر اتنی دیر میں داروغہ جی بھی مزے میں آ گئے۔بولے:”اب تو جانے کو جی نہیں چاہتا۔زہرہ چلو کچھ گپ شپ ہو۔میں بھی آتا ہوں۔“

زہرہ نے زینے کے اوپر قدم رکھا اور کہا:”جا کر پہلے ڈپٹی صاحب کو اطلاع دیجیے۔یہ گپ شپ کا موقع نہیں ہے۔“

داروغہ نے موٹر سے اتر کر کہا:”نہیں اب نہ جاؤں گا۔زہرہ! صبح دیکھی جائے گی۔“

زہرہ نے اوپر چڑھ کر دروازہ بند کرلیا اور اوپر جا کر کھڑکی سے سر نکال کر بولی:

”آداب عرض۔“

(50)

داروغہ جی مجبور ہوکر گھر جا کر لیٹ رہے۔نیند کھلی تو آٹھ بج رہے تھے۔اٹھ کر بیٹھے ہی تھے کہ ٹیلی فون پر پکار ہوئی۔ڈپٹی صاحب پوچھ رہے تھے”رمانا تھ رات کو بنگلے پر تھا یا نہیں؟“

داروغہ کے ہوش اڑ گئے۔ بولے ''نہیں۔ مجھ سے بہانہ کر کے اپنی بیوی کے پاس چلا گیا تھا۔''

ڈپٹی صاحب نے غصے سے کہا: ''تم نے اسے کیوں جانے دیا۔ تم سے اس کا جواب طلب ہوگا۔ اس نے جج سے سب حال کہہ دیا۔ مقدمہ کی جانچ پھر سے ہو گی۔ آپ سے بڑا بھاری بلنڈر ہوا ہے۔ سارا محنت پانی میں گر گیا۔''

''تو کیا وہ رات کو جج صاحب کے پاس چلا گیا؟''

ڈپٹی: ''ہاں وہیں گیا تھا۔ جج صاحب پھر سے مقدمہ کی پیشی کرے گا۔ یہ سب آپ کا بنگلنگ ہے۔ زہرہ نے بھی دغا دیا۔ اب رمانا تھ کا سب سامان کمشنر صاحب کے پاس بھیج دو۔ وہ کسی دوسری جگہ ٹھہرایا جائے گا۔''

داروغہ جی اس وقت رمانا تھ کا سب سامان لے کر پولیس کمشنر کے بنگلے کی طرف چلے۔ رما پر ایسا غصہ آ رہا تھا کہ پائیں تو کچا نگل جائیں۔ کم بخت کی کتنی خوشامدیں، کتنی ناز برداری کی، مگر دغا دے ہی گیا۔ اس میں زہرہ کی بھی سازش ہے۔ آج ہی بیگم صاحب کی بھی خبر لیتا ہوں اور دیبی دین سے بھی سمجھوں گا۔

ایک ہفتہ بھر پولیس کے حکام میں ہلچل رہی۔ اس کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ رات کی رات اور دن کے دن اسی فکر میں چکر کھاتے رہے۔ مقدمہ سے کہیں زیادہ اپنی فکر تھی۔ سب سے زیادہ تشویش داروغہ صاحب کو تھی، انہیں اپنے بچنے کی امید نظر نہیں آتی۔ ڈپٹی اور انسپکٹر نے ساری بلا اس کے سر ڈال دی تھی اور خود بالکل الگ ہو گئے تھے۔

سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی۔ اس مقدمہ کی دوبارہ پیشی ہو گی۔ انگریزی

انصاف کی تاریخ میں یہ عدیم المثال واقعہ تھا۔ وکیلوں میں اس پر قانونی مباحثے ہوتے۔ جج صاحب کو اس کا مجاز ہے بھی یا نہیں، لیکن جج اپنے ارادے پر مستقل تھا۔ پولیس والوں نے بڑے بڑے زور لگائے۔ پولیس کمشنر نے یہاں تک کہا کہ اس سے سارا محکمہ بدنام ہو جائے گا، لیکن جج نے کسی کی نہ سنی۔ جھوٹی شہادتوں پر پندرہ آدمیوں کی زندگی برباد کرنے کی ذمہ داری لیتے ہوئے اسے روحانی تکلیف ہوتی تھی۔ اس نے ہائی کورٹ اور گورنمنٹ دونوں ہی کو اس کی اطلاع دے دی تھی۔

ادھر پولیس والے رما کی تلاش میں رات دن سرگرداں رہتے تھے، لیکن رما نہ جانے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔ پر قیاس آرائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر نے جالپا سے ملاقات کی اور اس کا بیان شائع کرا دیا۔ دوسرے اخبار نے زہرہ کا بیان چھاپ دیا۔ ان دونوں بیانات نے پولیس کے اخبار ادھیڑ دیئے۔ زہرہ نے صاف کہہ دیا کہ مجھے صرف اس لیے پچاس روپے روز دیئے جاتے تھے کہ رمانا تھ کو بہلاتی رہوں اور اسے کچھ سوچنے یا کرنے کا موقع نہ ملے۔ پولیس والوں نے یہ بیان پڑھا تو دانت پیس لیے۔

آخر دو مہینے کے بعد فیصلہ ہوا۔ اس مقدمہ کی سماعت کے لیے ایک سویلین تعینات کیا گیا۔ پھر پیشیاں ہونے لگیں۔ پولیس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ ملزموں میں کوئی مخبر بن جائے، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ داروغہ چاہتے تو نئی شہادتیں بنا سکتے تھے، لیکن افسروں کی خودغرضی سے وہ اتنے کبیدہ خاطر ہوئے کہ دور سے تماشہ دیکھنے کے سوا اور کچھ نہ کیا۔ جب ساری نیک نامی افسروں کو ملتی ہے اور سار

ی بدنامی ماتحتوں کو، تو کوئی شہادتیں کیوں بنائے۔ آخر پولیس کو مجبور ہو کر مقدمہ اٹھا لینا پڑا۔ طویلے کی بلا بندر کے سر گئی۔ داروغہ تنزل ہو گئے اور نائب داروغہ کا نزائی میں تبادلہ کر دیا گیا۔

جس دن ملزموں کو بری کیا گیا، آدھا شہر ان کا خیر مقدم کرنے کو جمع تھا۔ پولیس نے انہیں دس بجے رات کو چھوڑا، لیکن خلقت جمع ہو گئی۔ لوگ جالپا کو بھی کھینچ لے گئے۔ اس پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی اور اس کی تعریف کے نعروں سے آسمان گونج رہا تھا۔

مگر رماناتھ کی مصیبتوں کا ابھی خاتمہ نہ ہوا تھا۔ اس پر دروغ بیانی کا مقدمہ چلانے کا فیصلہ ہو گیا۔

(51)

اسی بنگلے میں ٹھیک دس بجے مقدمہ پیش ہوا۔ ساون کی جھڑی لگی تھی۔ کلکتہ دلدل ہو رہا تھا، لیکن تماشائیوں کا ہجوم میدان میں کھڑا تھا۔ عورتوں میں دنیش کی بیوی اور ماں بھی آئی تھیں۔ پیشی سے دس منٹ پہلے جالپا اور زہرہ بھی بند گاڑیوں میں آ پہنچیں۔

پولیس کی شہادتیں شروع ہوئیں۔ پر ان میں قابل ذکر کوئی بات نہ تھی۔ محض ضابطہ کی پابندی تھی۔ اس کے بعد رماناتھ کا بیان ہوا، پر اس میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے پورے ایک سال کی سرگشت کہہ سنائی۔ وکیل کے

پوچھنے پر اس نے کہا۔

''جالپا کی بے نفسی، حق پسندی اور استقلال نے میری آنکھیں کھولیں اور اس سے بھی زیادہ زہرہ کی دلجوئی اور خلوص نے۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس طرف سے روشنی ملی، جدھر اوروں کو تاریکی ہی ملتی ہے۔''

اس کے بعد صفائی کی طرف سے دیبی و جالپا اور زہرہ کے بیان ہوئے۔ زہرہ کا بیان بہت ہی پر اثر تھا۔ اس نے کہا: ''میں نے دیکھا کہ جس آدمی کو نشانہ ستم بنانے کی خدمت مجھے سونپی گئی ہے، وہ خود درد سے تڑپ رہا ہے۔ اسے مرہم کی ضرورت ہے، زخموں کی نہیں۔ جالپا دیوی سے اسے جتنی عقیدت تھی، اسے دیکھ کر مجھے اپنی خود غرضی اور بے غیرتی پر شرم آئی۔ میری زندگی کتنی حقیر، کتنی گری ہوئی اور کتنی شرمناک ہے۔ یہ مجھ پر اس وقت کھلا جب میں جالپا سے ملی۔ اس کی بے غرض خدمت، اس کے مردانہ عزم اور اس کی پاک غریب دوستی نے میری زندگی کی رفتار پلٹ دی۔ میں نے فیصلہ کیا اس آغوش میں، میں بھی پناہ لوں گی۔''

مگر اس سے بھی معرکے کا بیان جالپا کا تھا۔ وہ بیان سن کر حاضرین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس کے آخری الفاظ یہ تھے: ''میرے شوہر بے گناہ ہیں۔ ایشور کی نگاہ میں ہی نہیں، قانون کی نگاہ میں بھی۔ ان کی تقدیر میں میری نمائش پسندی کا تاوان دیکھنا لکھا تھا، وہ انہوں نے دیا۔ اصلہ خطاوار میں ہوں، جس کے باعث انہیں یہ عذاب جھیلنے پڑے۔ میں مانتی ہوں کہ میں نے انہیں بیان بدلنے کے لیے مجبور کیا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہ سچ مچ ڈاکوؤں میں شریک ہوئے اور ان کی شہادت

واقعات پر مبنی تھی، میں انہیں تبدیلی بیان کے لیے ہر گز آمادہ نہ کرتی۔ جن تاریخوں میں میرے شوہر کا ڈاکوؤں میں شریک ہونا بتلایا جاتا ہے، ان تاریخوں میں وہ الہ آباد میں تھے۔ عدالت چاہے تو وہاں کے میونسپل بورڈ کے دفتر سے اس کی تصدیق کرسکتی ہے۔"

عدالت سے سرکاری وکیل سے پوچھا: "کیا الہ آباد سے اس معاملہ کوئی رپورٹ مانگی گئی تھی؟"

سرکاری وکیل نے کہا: "جی ہاں! مگر ہمیں معلوم ہوا کہ ملزم ڈاکوؤں میں شریک نہ تھا۔ اب صرف یہ امر رہ جاتا ہے کہ وہ مخبر کیوں بنا؟"

سرکاری وکیل نے کہا: "خودغرضی کے سوا اور کیا سبب ہوسکتا ہے؟"

صفائی کے وکیل نے جواب دیا: "میرا دعویٰ ہے کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے اور جب اسے معلوم ہوگیا کہ اسے پولیس سے خائف ہونے کا کوئی سبب نہیں ہے تو اسے دھمکیوں سے مجبور کیا گیا۔"

اس کے بعد سرکاری وکیل نے بحث شروع کی: "جناب والا! آج آپ کے ہاں ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا ہے جیسا خوش قسمتی سے بہت کم ہوا کرتا ہے۔ آپ کو جنگ پور کی ڈکیتی کا حال معلوم ہے۔ جنگ پور کے قرب و جوار میں متواتر کئی ڈاکے پڑے اور پولیس کے عملے مہینوں اپنی جان ہتھیلی پر لیے ڈکیتوں کی تلاش میں سرگرم رہے اور آخر ان کی کوشش بارآور ہوئی اور ڈاکوؤں کا سراغ ملا۔ یہ لوگ گھر کے اندر بیٹھے ہوئے پاک گئے۔ پولیس نے یکبارگی سب کو گرفتار کرلیا، لیکن آپ جانتے ہیں ایسے معاملوں میں پولیس کے لیے عدالتی ثبوت پہنچانا کتنا مشکل ہے۔

عوام جان کے خوف سے، شہادت دینے کا موقع آیا تو صاف نکل گئے۔ پولیس اسی الجھن میں پڑی ہوئی تھی کہ ایک نوجوان آتا ہے اور ڈاکوؤں کا سرغنہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ ان وارداتوں کا اتنا مضبوط اور مفصل ذکر کرتا ہے کہ پولیس کو اس پر یقین آ جاتا ہے۔ وہ اس موقع پر اس آدمی کو پاکر غیبی امداد سمجھتی ہے۔ یہ آدمی الہ آباد سے کسی معاملہ میں ماخوذ ہو کر بھاگ آیا تھا اور یہاں بھی کون مرتا تھا۔ اس میں اور کوئی صفت ہو یا نہ ہو، موقع شناسی کی صفت ضرور ہے۔ اس کے برعکس فائدے بیشمار تھے۔ پولیس اس کی خوب آؤ بھگت کرتی ہے اور اسے اپنا مخبر بنا لیتی ہے۔ بہت ممکن تھا کہ ان وارداتوں کی کوئی شہادت نہ پاکر پولیس ڈکیتی کے ملزموں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتی، لیکن یہ غیبی امداد پاکر اس نے مقدمہ چلانے کا ارادہ کیا۔

لیکن ایسا ہوتا ہے کہ اس اثنا میں اسے تقدیر سازی کے دوسرے مواقع ہاتھ آ گئے۔ ممکن ہے مغویانہ جماعتوں سے اسے ترغیبیں ملتی رہی ہوں اور ترغیبوں نے اسے مطلب براری کا نیا راستہ دکھایا ہو۔ یہاں دولت کے ساتھ نیک نامی بھی تھی۔ واہ واہ بھی تھی اور قوم پروری کی شہرت تھی۔ یہ شخص اپنی غرض کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد اولیٰ ہے۔ ہم خوش ہیں کہ بالآخر اس کی حق پسندی اس پر غالب آئی۔ چاہے اس کے اسباب کچھ بھی ہوں۔

بے گناہوں کو سزا دلوانا پولیس کے لیے اتنا ہی قابل اعتراض ہے جتنا گناہ گار کو چھوڑ دینا۔ وہ اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے ہی ایسے مقدمہ نہیں چلاتی۔ اس جوان کی ابلہ فریبیوں سے پولیس کو جو بدنامی ہوگی اور سرکار کے جو روپے خرچ

ہوئے، اس کی اسے معقول سزا ملنی چاہیے۔ ایسے دروغ بانوں کو آزاد رہ کر سوسائٹی کے ٹھگنے کا موقع دینا صریح بے انصافی ہوگی۔ اس کے لیے سب سے موزوں مقام وہ ہے، جہاں اسے کچھ دن تہذیب نفس کا موقع ملے۔ شاید اس خلوت میں اس کا ضمیر بیدار ہو۔ آپ کو محض یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے پولیس کو دغا دیا یا نہیں۔ اس تنقیح کے صحیح تسلیم کرنے میں اب کوئی شک کی گنجائش نہیں۔ اگر پولیس نے اسے دھمکیاں دی تھیں، تو وہ پہلے ہی عدالت میں اپنا بیان واپس لے سکتا تھا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ دھمکیوں کا الزام بالکل غلط ہے۔ اس نے جو کچھ دیا اپنی رضا و رغبت سے کیا۔ ایسے آدمی کو اگر سزا نہ دی گئی تو اس کی شعبدہ بازیوں کا سلسلہ قائم رہے گا۔''

اس کے بعد صفائی کے وکیل نے جواب دیا: ''یہ مقدمہ انگریزی تاریخ ہی نہیں شاید دنیا کی تاریخ انصاف میں اپنی نوعیت کا بے مثال مقدمہ ہے۔ رمانا تھ ایک معمولی طبقہ کا آدمی ہے۔ اس نے تعلیم بھی معمولی درجہ کی پائی ہے۔ وہ اونچے خیالات کا آدمی نہیں ہے۔ الہ آباد کی میونسپلٹی میں وہ کئی سال ملازم رہ چکا ہے۔ وہاں اس کا کام چونگی کے روپے وصول کرنا تھا۔ عام دستور کے مطابق وہ تاجروں سے رشوت بھی لیتا ہے اور اپنی آمدنی کی پروا نہ کر کے اناپ شناپ خرچ کرتا ہے۔ آخر ایک دن میزان میں غلطی ہو جانے کے باعث اسے شک ہو جاتا ہے کہ کچھ سرکاری رقم اس کے تصرف میں آ گئی ہے۔ وہ اتنا بدحواس ہو جاتا ہے کہ کسی سے اس کا ذکر نہیں کرتا اور گھر سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ وہاں دفتر میں اس پر شبہ ہوتا ہے کہ اور اس کے کاغذات کی جانچ ہوتی ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کوئی

بے جا تصرف نہیں کیا،صرف میزان کی غلطی تھی۔''

اس کے بعد اس نے رما کے پولیس کے پنجے میں پھنسنے،فرضی مخبر بننے اور شہادت دینے کا ذکر کر کے سلسلۂ بحث جاری کیا:

''اب رما ناتھ کی زندگی میں ایک نیا تغیر، جو کہ ایک شوقین مزاج اور ملازمت کے دلدادہ نوجوان کو فرض اور حق کے راستے پر لگا دیتا ہے،اس کی زوجہ جالپا اس کی تلاش میں الہ آباد سے یہاں آتی ہے اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ رما ایک مقدمہ میں پولیس کا مخبر بن گیا ہے تو وہ اس سے خفیہ طور پر ملنے آتی ہے۔رما پولیس کا مہمان ہے۔اپنے بنگلے میں آرام سے پڑا ہوا ہے۔پھاٹک پر سنتری پہرہ دے رہا ہے۔جالپا کو شوہر سے ملنے سے ناکامی ہوتی ہے۔تب وہ ایک خط لکھ کر اس کے سامنے پھینک دیتی ہے اور دیبی دین کے ساتھ چلی جاتی ہے۔رما یہ خط پڑھتا ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ جاتا ہے۔وہ چھپ کر جالپا کے پاس آتا ہے۔جالپا اس سے ساری داستان کہہ سناتی ہے اور اسے اپنا بیان بدل لینے پر مجبور کرتی ہے۔حکام کو یہ معلوم ہو گیا کہ رما پر غبن کا کوئی الزام نہیں ہے۔تو وہ جالپا کو گرفتار کرنے کی دھمکی دے کر اسے اپنے ارادے سے باز رکھتے ہیں۔رما ناتھ کی ہمت پست ہو جاتی ہے۔وہ جانتا ہے کہ پولیس کے اختیارات وسیع ہیں۔مجبور ہو کر وہ جج کے اجلاس میں اپنے پہلے بیان کی تائید کرتا ہے۔آخر ملزموں کو سزا ہو جاتی ہے۔رما ناتھ کی اور خاطر داریاں ہونے لگتی ہیں۔''

اس کے بعد جو واقعات ہوئے،ان کا مختصر ذکر کرنے کے بعد وکیل صفائی نے فرمایا:

"میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے جھوٹی شہادت نہیں دی، لیکن ان حالات اور ترغیبوں پر نگاہ ڈالیے تو اس جرم کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ اس جھوٹی شہادت کا اگر نتیجہ یہ ہوتا کہ کسی بے قصور کو سزا مل جاتی تو دوسری بات تھی۔ یہاں تو پندرہ نوجوانوں کی قیمتی جان بچ گئی۔ ملزم نے خود اپنی جھوٹی شہادت کا اقبال کیا ہے کہ اس کی دلیرانہ حق پسندی کا یہی انعام اسے ملنا چاہیے۔ جالپا دیوی کی اصول پروری کیا اسی برتاؤ کی مستحق ہے۔ جالپا ہی اس ڈرامے کی ملکہ ہے۔ اس کی حق پسندی، اس کی فرض پروری، اس کی عصمت اور وفا اس کی بے نفسی غرض کن کن اوصاف کی تعریف کی جائے۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس کی حمایت سے اس کا دنیاوی مستقبل کتنا روشن ہو جائے گا۔ ایک حسینہ کے دل کی آرزوئیں ہو سکتی ہیں۔ جالپا کا دل ان سے خالی نہیں ہو سکتا، لیکن وہ حمایت حق کے جوش میں ان ساری تمناؤں کو خیر باد کہتی ہے۔ ایک معمولی عورت میں، جس نے اونچے درجے کی تعلیم نہیں پائی۔ کیا اتنا ایثار اور اتنی روشن طبعی کسی غیبی امداد کا ثبوت نہیں ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں ایسے مقدمات روز نہیں پیش ہوتے۔ شاید آپ لوگوں کو اپنی زندگی میں پھر ایسے مقدمے کی سماعت کا موقع نہ ملے۔ یہاں آپ ایک مقدمہ کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہوئے ہیں، مگر اس اجلاس کے باہر ایک بہت بڑی عدالت ہے۔ جہاں آپ کے فیصلے کی جانچ ہوگی۔ آپ کا وہی فیصلہ واجب سمجھا جائے گا، جسے یہ باہر کی عدالت بھی واجب تسلیم کرے۔ وہ عدالت کی موشگافیوں میں نہیں پڑتی، جن میں پڑ کر ہم اکثر گمراہ ہو جایا کرتے ہیں۔ اکثر پانی کا دودھ اور دودھ کا پانی کر بیٹھتے ہیں۔ اگر آپ جھوٹ سے تائب ہو کر حق کی پیروی کرنے کے لیے کسی کو مجرم ٹھہراتے ہیں تو

آپ دنیا کے سامنے عدل کا کوئی اونچا معیار نہیں رکھتے۔''

سرکاری وکیل نے اس دلیل کا جواب دیتے ہوئے کہا:

''فرض اور ایثار اپنی اپنی جگہ پر بہت ہی قابل قدر ہیں، لیکن جس آدمی نے عمداً جھوٹی شہادت دی، اس نے قانون کی نگاہ میں اور اخلاق کی نگاہ میں جرم کیا ہے اور سزا کا مستوجب ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نے الہ آباد میں بے جا صرف نہیں کیا۔ اسے صرف وہم تھا لیکن ایسی حالت میں ایک سچے دوست کا یہ فرض تھا کہ وہ گرفتار ہو جانے پر اپنی صفائی پیش کرتا، نہ یہ کہ اپنی کمینی اغراض کے لیے جھوٹ کا جال پھیلاتا۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا یہ فعل ناواجب ہے تو آپ اسے سزا ضرور دیں۔''

فریقین کے وکیلوں کی بحث ختم ہو جانے کے بعد جج نے سینئرز سے مشورہ کیا اور یہ تجویز سنائی:

''مقدمہ صرف یہ ہے کہ ایک نوجوان نے اپنے کو الزام سے بری کرنے کے لیے پولیس کی پناہ لی اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ جس بنا پر وہ پولیس کی حمایت کرتا ہے، اس کی کوئی ہستی نہیں، تو وہ اپنا بیان واپس لے سکتا ہے۔ رماناتھ اگر حق پرور ہوتا تو ہو پولیس کی حمایت میں جاتا ہی کیوں، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ پولیس نے ایسی جھوٹی شہادت دینے کی ترغیب دی۔ میں یہ نہیں مان سکتا کہ شہادت کی تحریک رماناتھ کی جانب سے ہوئی۔ اسے ترغیب دی گئی اور سزا کے خوف سے اس نے اسے منظور کر لیا۔ اسے اس بات کا یقین بھی دلایا گیا ہو گا کہ جن لوگوں کے خلاف شہادت دینے کے لیے اسے آمادہ کیا جا رہا ہے، وہ فی الواقع خطاوار

تھے، کیونکہ رماناتھ میں اگر سزا کا خوف ہے تو احساس حق بھی ہے۔ وہ ایسے پیشہ ور گواہوں میں سے نہیں ہیں، جو اپنے مفاد کے لیے جھوٹی شہادتیں دیا کرتے ہیں۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو رما اپنی بیوی کے اصرار پر اپنا بیان تبدیل کرنے پر بھی کبھی راضی نہ ہوتا۔ اس لیے میں اسے بری کرتا ہوں۔"

(52)

چیت کی سہانی فرحت بخش شام۔ گنگا کا کنارہ ٹیسوؤں سے لہلہاتا ہوا ڈھاک کا میدان۔ ایک برگد کا چھتنار درخت۔ اس کے نیچے بندھی ہوئی گائے بھینس۔ کدو اور لوکی کی بیلوں سے لہراتی ہوئی جھونپڑیاں۔ نہ کہیں گرد و غبار نہ شور و غل۔ آرام و سکون کے لیے اس سے بہتر کوئی اور جگہ ہو سکتی ہے؟ نیچے سنہری گنگا سرخ، سیاہ اور نیلے رنگوں سے چمکتی ہوئی میٹھے سروں میں گاتی کہیں لپکتی، کہیں جھجکتی، کہیں شوخ اور کہیں متین اس طرح بہتی ہوئی چلی جاتی ہے گویا بےفکریوں کا خوشنما بچپن ہنستا کھیلتا چلا جاتا ہو۔

دیبی دین اور رماناتھ نے یہیں سکونت اختیار کی۔

تین سال گزر گئے ہیں۔ اسی اثنا میں دیبی دین نے زمین خریدی۔ باغ لگایا، کھیتی جمائی۔ مویشی جمع کیے اور مسلسل جدوجہد میں آرام و سکون کا لطف اٹھا رہا ہے۔ اس کے چہرے پر اب وہ زردی اور جھریاں نہیں ہیں، بلکہ ایک نئی رونق نظر آ رہی ہے۔

شام ہوگئی۔ مویشی چراگاہ سے لوٹے۔ جگو نے انہیں کھونٹے سے باندھا اور تھوڑا تھوڑا بھوسہ لاکر ان کے سامنے ڈال دیا۔ دینی دین اور گوپی بھی بیل گاڑی پر پولے لادے ہوئے آپہنچے۔ رماناتھ نے برگد کے نیچے زمین صاف کر رکھی ہے، وہیں پولے اتار لیے گئے۔ یہی اس چھوٹی سی بستی کا کھلیان ہے۔ دیاناتھ نوکری سے برخاست ہو گئے ہیں اور اب دینی دین کے اسسٹنٹ ہیں۔ ان کو اخباروں سے اب بھی وہی عشق ہے۔ روز کئی اخبار آتے ہیں اور شام کو فرصت پانے کے بعد منشی جی اخباروں کو پڑھ کر سناتے اور سمجھاتے ہیں۔ آس پاس کے گاؤں کے دس پانچ آدمی روز جمع ہو جاتے ہیں۔ روز ایک چھوٹی موٹی سبھا ہوتی ہے۔ رما کو تو اس زندگی سے اتنی دل بستگی ہوگئی ہے کہ اب اسے شاید تھانیداری ہی نہیں، چونگی کی انسپکٹری بھی مل جائے تو وہ ملازمت کا نام نہ لے۔ روز صبح اٹھ کر گنگا اشنان کرتا ہے اور دن نکلتے نکلتے اپنے شفاخانہ میں آ بیٹھتا ہے۔ اس نے طب کی دو چار کتابیں پڑھ لی ہیں اور چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج کر لیتا ہے۔ دس پانچ مریض روز آتے ہیں اور اس کی شہرت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں سے فرصت پا کر اپنے باغ میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کچھ ساگ بھاجی لگی ہوئی ہے۔ کچھ پھل پھولوں کے درخت ہیں۔ ابھی تو باغ سے محض ترکاری ملتی ہے لیکن امید ہے کہ تین چار سالوں میں پھلوں کی کافی مقدار پیدا ہونے لگے گی۔

دینی دین نے بیلوں کو گاڑی سے کھول کر کھونٹے سے باندھ دیا اور دیاناتھ سے بولا:

''ابھی بھیا نہیں آئے؟''

دیا ناتھ نے جواب دیا: ''ابھی نہیں۔ مجھے تو اب بہو کے اچھے ہونے کی امید نہیں ہے۔ زمانے کا پھیر ہے کتنے آرام سے رہتی تھیں اور آج یہ حال ہے کہ وکیل صاحب نے اچھی جائیداد چھوڑی تھی مگر بھائی بھتیجوں نے سب ہڑپ کر لی۔''

دینو: ''بھیا کہتے تھے عدالت میں مقدمہ کرتی تو سب مل جاتا، مگر کہتی ہے میں عدالت میں جھوٹ نہ بولوں گی۔''

یکایک جاگیشری ایک بچے کو گود میں لیے جھونپڑے سے نکلی اور بچے کو دیا ناتھ کی گود میں دیتی ہوئی بولی: ''مہتو ذرا چل کر رتن کو دیکھو۔ جانے کیسی ہوئی جاتی ہے۔ زہرہ اور بہو دونوں رو رہی ہیں۔''

دینو دین نے منشی جی سے کہا: ''چلو لالہ دیکھیں۔''

جاگیشری بولی: ''یہ جا کر کیا کریں گے۔ بیمار کو دیکھ کر تو آپ ہی ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔''

دینو دین نے رتن کی کوٹھڑی میں جا کر دیکھا۔ رتن بانس کی ایک کھاٹ پر پڑی تھی۔ جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ وہ سورج مکھی کا سا کھلا ہوا چہرہ مرجھا کر زرد ہو گیا تھا۔ وہ دل نواز مستی اور مسرت میں ڈوبا ہوا نغمہ فضا میں غائب ہو گیا تھا۔ صرف اس کی یاد باقی تھی۔ زہرہ اس کے اوپر جھکی ہوئی اسے دردناک اور مجبور نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ آج سال بھر سے اس نے رتن کی تیمارداری میں اپنے تئیں قربان کر دیا تھا۔ رتن نے اس کے ساتھ جو محبت آمیز برتاؤ کیا، اس بے اعتباری اور حقارت کے ماحول میں جس خلوص اور دلیری کے ساتھ بہناپا جوڑا تھا، اس کا احسان وہ اور

کس طرح مانتی۔ جو ہمدردی اسے جالپا سے بھی نہ ملی، وہ رتن نے عطا کی۔ اس دوستی میں اس کے دل محروم نے شوہر کا سکھ پایا اور اولاد کا بھی۔

دیبی دین نے رتن کے چہرے کی طرف فکرمند نگاہوں سے دیکھا اور پوچھا:

''کتنی دیر سے نہیں بولیں؟''

جالپا نے آنکھیں پونچھ کر کہا: ''ابھی ابھی تو بول رہی تھیں۔ یکا یک آنکھیں اوپر چڑھ گئیں اور بے ہوش ہو گئیں۔''

زہرہ نے پوچھا: ''کیا بابو جی ابھی وید کو لے کر نہیں لوٹے؟''

دیبی دین نے آہستہ سے کہا: ''ان کی دوا اب وید کے پاس نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے تھوڑی سی راکھ لی۔ رتن کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ منہ ہی میں بدبدایا اور چٹکی راکھ اس کے ماتھے پر لگا دی۔ تب پکارا ''رتن بیٹی آنکھیں کھولو۔''

رتن نے آنکھیں کھول دیں اور دھر ادھر وحشت آمیز انداز سے دیکھ کر بولی:

''میرا موٹر آیا تھا نا؟ کہاں گیا وہ آدمی؟ اس سے کہہ دو تھوڑی دیر بعد لائے۔ زہرہ! آج میں تمہیں اپنے باغیچہ کی سیر کراؤں گی۔ ہم دونوں جھولے پر بیٹھیں گے۔''

زہرہ پھر رونے لگی۔ جالپا بھی سیلاب اشک کو نہ روک سکی۔ رتن ایک لمحہ تک چھت کی طرف تاکتی رہی اور پھر یکا یک اس کا حافظہ بیدار ہو گیا۔ شرمندہ ہو کر ایک غم ناک تبسم کے ساتھ بولی:

''میں ایک خواب دیکھ رہی تھی۔''

سرخ آسمان پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا تھا۔ اسی وقت موت نے رتن کی زندگی پر

پردہ ڈال دیا۔

رما ناتھ وید جی کو لے کر پہر رات کو لوٹے تو یہاں موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رتن کی موت کا غم وہ غم نہ تھا، جس میں انسان ہائے ہائے کرتا ہے۔ بلکہ وہ غم جس میں آہیں خاموش ہو جاتی ہیں، جس میں آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں اور جو روح پر ہیبت کی طرح مسلط ہو جاتا ہے۔

رتن کے بعد زہرہ اکیلی رہ گئی۔ دونوں ساتھ ساتھ سوتی تھیں۔ ساتھ بیٹھتی تھیں۔ ساتھ کام کرتی تھیں۔ اب زہرہ کا جی کسی کام میں نہ لگتا۔ کبھی دریا کے کنارے جا کر رتن کو یاد کرتی اور روتی۔ کبھی اس کے آم کے پودے کے پاس جا کر گھنٹوں کھڑی رہتی، جسے ان دونوں نے لگایا تھا۔ گویا سہاگ لٹ گیا۔ جالپا کو بچے کی پرورش و پرداخت اور گھر کے کام کاج سے اتنی فرصت نہ ملتی کہ اس کے ساتھ بہت دیر تک بیٹھتی اور یہ بھی ایک طرح سے اچھا تھا، کیونکہ جب دونوں ساتھ ہوتیں تو رتن کا ذکر آ جاتا اور دونوں رونے لگتیں۔

بھادوں کا مہینہ تھا۔ عناصر کا معرکۂ کارزار گرم تھا۔ بحری فوجیں ہوائی جہازوں پر چڑھ کر آبی تیروں کی بارش کر رہی تھیں۔ زمین اس پردوش سے عاجز آ کر گوشۂ عافیت تلاش کرتی پھرتی تھی۔ گنگا گاؤں اور قصبوں کو نگل رہی تھی۔ گاؤں کے گاؤں بہتے چلے جاتے تھے۔ زہرہ ندی کے کنارے بیٹھی سیلاب کی خانہ براندازیوں کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ وہ لاغر اندام گنگا اتنی جسیم اور مہیب ہو سکتی تھی، اس کا وہ قیاس بھی نہ کر سکتی تھی۔ اسی گنگا میں وہ ایک ہلکی سی ڈونگی میں بیٹھ کر جل بہار کیا کرتی تھی۔ آج اس میں پہاڑ کا بھی پتا نہ لگے گا۔ لہریں جنون کے عالم میں

گزرتیں۔منہ سے پھیں نکالتی، بلیوں اچھل رہی تھیں کبھی لپک کرآگے آجاتیں، پھر پیچھے لوٹ پڑتیں اور چکر کھاکے آگے دوڑتیں۔کہیں جھونپڑا ڈگمگاتا تیزی سے بہا جارہا تھا۔گویا کوئی شرابی دوڑا جاتا ہو۔کہیں کوئی درخت ڈال پتوں سمیت ڈوبتا اتراتا کسی دور حجر کے کوہ قامت جاندار کی طرح تیرتا چلا جاتا تھا۔گائے، بھینسیں، کھاٹ کھٹولے، طلسمی تصویروں کی طرح آناً فاناً آنکھوں کے سامنے سے نکل جاتے تھے اور ایک بار غائب ہوکر ایک فرلانگ کے بعد پھر نکل پڑتے تھے۔

دفعتاً ایک کشتی نظر آئی۔اس پر کئی مرد عورت بیٹھے ہوئے تھے۔بیٹھے کیا چمٹے ہوئے تھے۔کشتی زیروزبر ہورہی تھی۔بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ اب الٹی اب الٹی، مگر واہ ری ہمت مردانہ سب کے سب اب بھی گنگا ماتا کی جے کے نعرے لگاتے جاتے تھے۔عورتیں اب بھی گنگا کے گیت گارہی تھیں۔مرگ وحیات کی کشمکش کا کتنا ہیبت ناک نظارہ تھا۔دونوں طرف کے آدمی سینوں پر ہاتھ رکھے شدت سکون کی حالت میں کھڑے تھے۔جب کشتی کروٹ لیتی تو لوگوں کے دل اچھل اچھل کر لبوں تک آجاتے۔رسیاں پھینکنے کی کوشش کی جارہی تھی مگر وہ ساحل سے تھوڑی دور ہی گر پڑتی تھیں۔یکا یک ایک بار کشتی الٹ گئی۔وہ سب ہستیاں بحرفنا میں غرق ہوگئیں۔یک لمحے تک مرد وعورت ڈوبتے نظر آئے۔پھر نظروں سے اوجھل ہوگئے۔صرف ایک سفید سی چیز ساحل کی طرف چلی آرہی تھی۔ایک ہی ریلے میں وہ ساحل سے کوئی تیس گز قریب آگئی۔اب معلوم ہوا کوئی عورت ہے۔ زہرہ، جالپا اور رمانا تھ تینوں ہی آپہنچے تھے۔عورت کی گود میں ایک بچہ بھی نظر آرہا تھا۔دونوں چشم زدن میں کہاں سے کہاں جا پہنچیں گے۔انہیں کیسے گنگا سے نکال

لیا جائے۔ تینوں ہی بے تاب تھے۔ تینوں یکساں اضطراب سے اس عورت کی طرف دیکھتے تھے اور دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے تھے۔ عورتیں معذور تھیں۔ رمانا تھ تیرنا جانتا تھا، لیکن لہروں سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہیں لہروں کے زور میں پاؤں اکھڑ جائیں تو خلیج بنگال کے سوا اور کہیں ٹھکانہ نہ لگے۔

زہرہ نے بے صبر ہو کر کہا: ''ابھی دونوں زندہ ہیں۔''

جالپا: ''سچ؟''

اور وہ ایک بے ہوشی کے عالم میں پانی میں چل پڑی۔

رمانا تھ نے شرمندہ ہو کر کہا: ''تم کہاں جاتی ہو زہرہ۔ تیار۔ تو میں بھی تھا لیکن وہاں تک پہنچ بھی سکوں گا، اس میں شک ہے۔ دیکھتی نہیں ہو پانی میں کتنا توڑ ہے؟''

زہرہ گھٹنے تک پانی میں جا پہنچی تھی۔ بولی: ''نہیں تم نہ آنا۔ خدا کے لیے میں ابھی نکالے لاتی ہوں۔''

وہ کمر تک پانی میں پہنچ گئی۔ رمانا تھ گھبرا کر بولا: ''کیوں ناحق جان دیئے جاتی ہو زہرہ؟ خدا کے لیے لوٹ آؤ۔ ٹھہرو میں آتا ہوں۔''

زہرہ نے ہاتھوں سے منع کرتے ہوئے کہا: ''نہیں نہیں تمہیں میری قسم تم نہ آنا۔ میں ابھی لیے آتی ہوں۔ مجھے کچھ کچھ تیرنا آتا ہے۔''

جالپا نے کہا: ''لاش ہو گی اور کیا۔''

رما بولا: ''شاید ابھی جان ہو۔''

جالپا: ''اچھا زہرہ تیر بھی لیتی ہے۔ جبھی ہمت پڑی۔''

رما نے زہرہ کی طرف فکرمند نظروں سے دیکھ کر کہا: ''ہاں کچھ کچھ جانتی تو ہے، مگر لوٹ آئیں تو کہیں مجھے اپنی پست ہمتی پر شرم آرہی ہے۔''

جالپا نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا: ''اس میں شرم کی کون سی بات ہے۔ مردہ لاش کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالنا کون سی عقلمندی ہے۔''

رما نے اپنے نفس کو ملامت کرتے ہوئے کہا: ''یہاں سے کون جان سکتا ہے زندہ یا مردہ۔ واقعی بال بچوں والا نامرد ہو جاتا ہے۔ میں کاٹھ کے الو کی طرح کھڑا رہا اور زہرہ چلی گئی۔''

زہرہ ہاتھ پیر مارتی لاش کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اتنے میں ایک رو آئی اور لاش کو پھر ساحل سے کھینچ لے گئی۔ زہرہ خود اس کی زد میں آ گئی اور کئی ہاتھ بہاؤ کی طرف چلی گئی۔ وہ پھر سنبھلی اور ایک دوسرے ریلے نے پھر اسے دھکیل دیا۔ وہ کسی طرح نہ سنبھل سکی۔ اس نے چیخ ماری اور پانی میں سما گئی۔

رما بے تاب ہو کر پانی میں کود پڑا۔ اور زور زور سے پکارنے لگا۔ ''زہرہ، زہرہ میں آتا ہوں۔''

مگر زہرہ میں اب لہروں سے جنگ کرنے کی طاقت نہ تھی۔ وہ پھر باہر نکلی، مگر ایک فرلانگ پر وہ بہی جا رہی تھی۔ اس کے اعضا میں کوئی بھی حرکت نہ تھی۔

یکا یک ایک ایسا ریلا آیا کہ وہ بیچ دھار میں جا پہنچی۔ اب صرف اس کے سر کے بال نظر آ رہے تھے۔ وہ بھی صرف ایک لمحے تک۔ پھر وہ نشان بھی غائب ہو گیا۔ یہی اس کا آخری دیدار تھا۔

رما ایک سو گز تک ہاتھ پاؤں مارتا، لہروں کا سامنا کرتا ہوا گیا لیکن اتنی سی دور

میں اس کا دم پھول گیا۔ اب آگے کہاں جائے۔ زہرہ کا کہیں پتا نہ تھا۔ وہی آخری جھلک آنکھوں کے سامنے تھی۔

کنارے پر جالپا کھڑی ہائے ہائے کر رہی تھی۔ آخر وہ بھی پانی میں گھسی۔ رما اب آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک طاقت آگے کھینچتی تھی۔ دوسری پیچھے۔ آنے کی طاقت میں مایوسی تھی۔ قربانی تھی، وفا تھی، پیچھے کی طاقت میں فرض تھا۔ بندش تھی اور زندگی کی امیدیں تھیں۔ بندش نے روک لیا وہ لوٹ پڑا۔

کئی منٹ تک جالپا اور رما گھٹنوں تک پانی میں کھڑے اسی طرف تاکتے رہے۔ رما کی زبان تاسف نے بند کر رکھی تھی۔ جالپا کی غم نے۔

آ کر رما نے کہا: ''پانی سے نکل چلو۔ ٹھنڈ لگ جائے گی۔''

جالپا پانی سے باہر نکل کر کنارے پر کھڑی ہو گئی۔ پر منہ سے کچھ نہ بولی۔ موت کے اس طمانچے نے اس کے حواس کو مفلوج سا کر دیا تھا۔ زندگی کی حبابی کیفیت زندگی میں دوسری بار اس کی نظروں کے سامنے آئی۔ اس کی موت کا پہلے ہی سے اندیشہ تھا۔ معلوم تھا کہ وہ تھوڑے دنوں کی مہمان ہے، مگر زہرہ کی موت تو بجلی کی چوٹ تھی۔ ابھی آدھ گھنٹے پہلے تینوں آدمی روانی دریا کا تماشا دیکھنے خوش خوش چلے تھے۔ کون جانتا تھا کہ موت انھیں اپنی بے دردیوں کا تماشا دکھانے کے لیے کھینچے لیے جا رہی ہے۔ ان چار برسوں میں زہرہ نے اپنی خدمت، بے نفسی اور پر انکسار و اخلاق سے سبھی کو گرویدہ کر لیا تھا۔ اپنے ماضی کی یاد کو دل سے مٹانے کے لیے۔ اپنے پچھلے داغوں کو دھو ڈالنے کے لیے اس کے پاس اس کے سوا اور کیا ذریعہ تھا۔ اس کی ساری خواہشیں اور ساری مسرتیں اسی جوش خدمت کے لیے جذب ہو گئی

تھیں۔ کلکتہ میں وہ حظ نفس اور تفریح کی چیز تھی۔ یہی اس کے ساتھ گھر کے آدمی کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ منی، دیاناتھ اور جاگیشری کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا تھا کہ وہ دیبی دین کی بیوہ بہو ہے۔ زہرہ نے کلکتہ میں جالپا سے محض اس کے ساتھ رہنے کی التجا کی تھی، مگر اس کا دل آرزوؤں سے خالی نہ تھا۔ جالپا کے خلوص اور بہناپے نے اسے تہذیب نفس کی جانب مائل کر دیا تھا۔ رتن کی پاکیزہ اور بے غرض زندگی اسے روز بروز ایثار کی طرف لیے جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس میں غرض کا شائبہ بھی نہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد رما بھی پانی سے نکلا اور ماتم میں ڈوبا ہوا آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلا۔ اس کے بعد اکثر وہ اور جالپا ندی کے کنارے آ بیٹھتے اور جہاں زہرہ ڈوبی تھی وہاں گھنٹوں دیکھا کرتے۔ کئی دنوں تک انہیں امید ہو رہی تھی کہ شاید زہرہ کہیں بچ گئی ہو اور کسی طرف سے ہنستی ہوئی چلی آئے۔ رفتہ رفتہ امید کا جھلملاتا ہوا چراغ بھی یاس کی تاریکی میں فنا ہو گیا۔ ہاں ابھی تک زہرہ کی وہ پاکیزہ صورت ان کی آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی ہے۔ اس کے لگائے ہوئے پودے اس کی پالی ہوئی بلی۔ اس کے ہاتھوں سلے ہوئے کپڑے۔ یہ سب اس کی یادگاریں ہیں، جو خیال کو اس کے وجود کا یقین دلاتی رہتی ہیں۔

The End________________ختم شد